خالی دامن

خالی دامن.....محمد اعظم خاں

کرم دین کے بھائی ایک ایک کر کے اپنے اپنے بیوی بچوں کو لیے، پنچھیوں کی طرح ماں کا آشیانہ چھوڑ کر اڑ گئے تھے۔ خاوند کی موت کے بعد عظمت بی بی نے بچوں کو ممتا کی آغوش میں چھپا لیا تھا، وہ اپنے بچوں کو ہر طوفان سے بچانے کے لیے تند و تیز ہواؤں سے لڑتی رہی، انہیں اپنی ہمت کے مطابق اچھا کھلا پلا یا، تعلیم دلوائی اور پھر ان کی شادیاں کیں، لیکن ان سب نے اسے چھوڑ کر جانے میں ذرا سی بھی دیر نہیں کی تھی۔

وہ اذان کی آواز سن کر فجر کی نماز پڑھنے کے لیے اٹھی تھی، ابھی تک ہر طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا، اس کا جوان بیٹا، کرم دین، اپنے کمرے میں لیٹا گہری نیند کے مزے لے رہا تھا، عظمت بی بی نے باتھ روم کا بلب جلا رکھا تھا اور وضو کر رہی تھی، اچانک اندھیرا چھا گیا، اس نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی اور اندھیرے میں ہی اپنا وضو مکمل کیا، پھر اپنے دوپٹے کے پلو سے چہرہ اور بازو خشک کر کے دیوار کو پکڑ پکڑ کر پاؤں گھسیٹتی ہوئی کچن کی طرف بڑھنے لگی، تاکہ ماچس ڈھونڈ کر موم بتی جلا لے۔

باورچی خانے میں موجود ہر چیز کے بارے میں وہ اچھی طرح آگاہ تھی کہ کون سی چیز کہاں پڑی ہے، کیونکہ بوڑھی ہونے کے باوجود اپنے اور کرم دین کے لیے کھانا اسی کو تیار کرنا پڑتا تھا، یوں بھی بہوؤں کے ہوتے ہوئے بھی کھانے پکانے کا کام اسی کی ذمہ داری تھی، جب اس کے بیٹے، بہوئیں اور پوتے پوتیاں، اس کے ہاتھوں کے پکے ہوئے کھانوں کی تعریف کرتے ہوئے کہتے "اماں کے ہاتھوں میں جو ذائقہ ہے وہ کسی اور کے ہاتھوں میں نہیں" تو اسے دلی اطمینان ہوتا تھا۔ عظمت بی بی کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ سب کو اپنے ہاتھوں کا پکا ہوا کھانا کھلائے، اس لیے اس کا زیادہ تر وقت باورچی خانے میں ہی گزرتا تھا، پھر جب اسے کئی بیماریوں نے ایک ساتھ گھیر لیا تو نہ اس میں پکانے کی ہمت رہی اور نہ ہی کھانے والے رہے۔

اس نے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھا کر با آسانی ماچس تلاش کر لی تھی، پھر ایک تیلی نکال کر اسے جلانے لگی تاکہ موم بتی جلائی جا سکے، ماچس کی تیلی پہلی ہی کوشش سے جل گئی تھی مگر اسے کوئی بھی چیز دکھائی نہیں دی تھی، اس نے یہ سوچ کر وہ تیلی نیچے پھینک دی کہ شائد وہ جلی ہی نہیں تھی، اس نے دو تین بار یہی عمل دہرایا لیکن کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

وہ الجھ کر رہ گئی تھی، اسے ماچس کی تیلی جلتی ہوئی محسوس ہوتی تھی، مگر روشنی کیوں نہیں ہو رہی تھی، اس نے آخری کوشش کے طور پر ایک اور تیلی جلائی، اب اس نے تیلی پر لگے مصالحے کو آگ لگنے کی آواز اپنے کانوں سے سنی تھی مگر روشنی پھر بھی نہیں ہوئی تھی، اس بار اس نے تیلی پھینکنے کی بجائے، ہاتھ میں ہی پکڑے رکھی تھی، جب آگ کی تپش اس کی انگلیوں کو محسوس ہونے لگی تو اس نے جلدی سے تیلی نیچے پھینک دی۔

یہ جان کر وہ کانپ اٹھی تھی کہ اس کی آنکھوں کی بینائی اچانک ختم ہو گئی تھی، وہ سوچنے لگی کہ یقیناً بلب بھی اسی طرح روشن ہو گا اور ماچس کی تیلیاں بھی جلتی رہی ہوں گی، مگر اسی کی آنکھیں کچھ دیکھ نہیں پائیں۔ یہ خیال آتے ہی، وہ چیختے ہوئے کرم دین کو آوازیں دینے لگی، اس کی آواز میں اس قدر دکھ اور درد شامل تھا کہ جو بھی سنتا دوڑا چلا آتا، مگر ایک کرم دین تھا کہ آوازیں سن کر بھی سکون سے لیٹا ہوا تھا، کیونکہ اس طرح کی آوازیں ہر صبح اس کے کانوں میں پڑا کرتی تھیں، جب اس کی ماں اسے فجر کی نماز ادا کرنے کے لیے پکارتی تھی، اور اس کے نہ اٹھنے پر تھک ہار کر خود ہی خاموش ہو جاتی تھی۔

ماں کی آواز کرم دین کے کانوں میں پڑی تھی، لیکن اس نے سنی ان سنی کی اور روز کی طرح کروٹ بدل کر پھر سے آنکھیں بند کر لی تھیں، عظمت بی بی نے یہ سوچ کر کہ شائد اس کی آواز کرم دین کے کانوں میں نہیں پڑی تھی، اس لیے اس نے ایک دو بار نام لے کر کرم دین کو اونچی آواز میں پکارا، مگر جب اسے کوئی جواب نہ ملا تو اس نے مایوس ہو کر اپنی چارپائی تک جانے کا فیصلہ کر لیا اور دیوار کو ہاتھوں سے ٹٹولتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگی۔ کچن کی دیوار سے آگے نکلتے ہی کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس کے ساتھ ساتھ چل کر وہ اپنے کمرے میں پہنچ جاتی، اس نے اپنا دایاں بازو آگے کی طرف پھیلا دیا اور اسے دائیں بائیں لہراتی ہوئی قدم بڑھانے لگی، مگر اسے ایسا کرنے میں انتہائی دشواری محسوس ہو رہی تھی، اس لیے وہ پاؤں کے بھار زمین پر بیٹھ گئی، کچن سے کمرے تک چند گز کا فاصلہ ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا، وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے زمین کو ٹٹولتے ہوئے کبھی اپنا دایاں پاؤں آگے بڑھاتی کبھی بایاں۔

وہ چند قدم بھی آگے بڑھ نہ پائی تھی کہ اس کی ہمت جواب دے گئی، ان لمحوں میں اسے اپنی بے بسی پر رونا آ گیا، اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ

رہے تھے اور وہ زمین پر ڈھیر ہوئی بیٹھی تھی، کوئی بھی تو نہیں تھا جو اسے سہارا دے کر چارپائی تک لے جاتا، اس کے وہ بیٹے جنہیں اس کے بوڑھاپے کا سہارا بننا تھا، وہ اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے، اور جسے ابھی اس کے سہارے کی ضرورت تھی، اس لیے مجبوراً اس کے پاس تھا، وہ بھی بے خبر سو رہا تھا۔

عظمت بی بی مجبور ہو کر آخری کوشش کے طور پر، روتی ہوئی پھر سے کرم دین کو پکارنے لگی، کرم دین کی کوشش تھی کہ کسی طرح ماں آوازیں دینا بند کر دے اور اسے جانا نہ پڑے، لیکن وہ اسے مسلسل آوازیں دیے جا رہی تھی، اس لیے اسے مجبوراً چارپائی چھوڑنا پڑی، وہ آنکھیں ملتا ہوا کمرے سے باہر نکلا تو اپنی ماں کو فرش پر بیٹھے ہوئے پایا۔

''یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو.....؟'' ماں کو نیچے بیٹھے دیکھ کر کرم دین نے دریافت کیا۔

''مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا بچے.....'' عظمت بی بی نے بیٹے کی آواز سن کر روتے ہوئے کہا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا..... چکر آنے سے آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ گیا ہوگا..... اس لیے ایسا لگ رہا ہے'' کرم دین نے بات کی اور پھر اسے بازوؤں سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولا ''چلو تمہیں چارپائی پر بٹھا دوں''۔

کرم دین کے اٹھانے پر عظمت بی بی نے ہاتھوں سے ٹٹول کر اپنا دایاں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھ دیا اور گر جانے کے خوف سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

''لو اب یہاں سکون سے آنکھیں بند کر کے لیٹ جاؤ..... کچھ دیر بعد ہی ٹھیک ہو جاؤ گی'' کرم دین نے ماں کو چارپائی پر لٹاتے ہوئے کہا۔

''اچھا بچے، خدا تمہاری زبان مبارک کرے.....'' عظمت بی بی نے کمزور سی آواز میں بات کی اور کرم دین کے کہنے کے مطابق آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔

کرم دین ماں کو لٹا کر واپس اپنی چارپائی پر جا کر لیٹ گیا تھا، عظمت بی بی نے بیٹے کے کہنے پر آنکھیں بند کر لی تھیں، مگر وہ جان چکی تھی کہ اس کی آنکھوں کی بینائی ختم ہو چکی ہے، اسی لیے تو اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا، پھر بھی اس نے دل کی تسلی کے لیے آنکھیں بند کیے رکھیں، پھر تھوڑی ہی دیر بعد یہ جاننے کے لیے کہ اسے کچھ دکھائی دے رہا ہے یا نہیں، اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کرنے لگی، مگر اسے اندھیرے کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔

جب عظمت بی بی کو کچھ نظر نہ آیا تو وہ یہ سوچ کر آنسو بہانے لگی کہ اگر اس کی آنکھوں کی بینائی واقعی چلی گئی ہے تو پھر کرم دین کا کیا بنے گا، وہ کس طرح زندگی گزار پائے گا، اس کے لیے کھانا کون پکائے گا، اس کے کپڑے کیسے دھلیں گے، اسے اپنے وہ بیٹے یاد آنے لگے، جو جب سے اسے چھوڑ کر گئے تھے، کبھی بھولے سے بھی لوٹ کر نہیں آئے تھے، وہ ماں جس نے انہیں جنم دیا تھا اور انہیں پالنے کے لیے بہت سی مصیبتیں جھیلی تھیں، کم از کم کبھی ایک بار تو آ کر دیکھ لیتے کہ وہ کس حال میں ہے..... لیکن وہ لوٹ کر اس گندی بستی میں کیوں آتے، جہاں رہتے ہوئے ان کے بچوں کی صحبت پر برا اثر پڑ جاتا، مگر وہ یہ بھول گئے تھے کہ وہ اسی بستی کی گندی گلیوں میں رہتے ہوئے ہی پل بڑھ کر کسی قابل ہوئے تھے اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ انہیں جنم دینے والی ماں اب بھی وہیں رہ رہی تھی، جہاں انہیں عید تہوار پر بھی آنا گوارہ نہیں تھا، وہ سوچنے لگی کہ کیا اتنے سالوں میں کبھی ایک بار بھی انہیں ماں اور بھائی کی یاد نہیں آئی تھی، کیا کبھی ان کی بیویوں نے یہ نہیں سوچا کہ اگر وہ کسی کی ماں ہیں تو ان کا خاوند بھی تو کسی کا بیٹا ہے، کیا اس کی ماں اس کے لیے نہیں تڑپتی ہوگی..... خیالات کا سلسلہ ایسا چلا کہ وہ جیسے جیسے سوچتی جاتی تھی، آنسوؤں کے بہاؤ میں تیزی آتی جاتی تھی۔

دن چڑھ آیا تھا، عظمت بی بی کے آنسو مسلسل جاری تھے، کبھی کبھی وہ اپنے دوپٹے کے پلو سے آنسو صاف کر کے ادھر ادھر دیکھنے لگتی کہ شاید اس کی بینائی لوٹ آئی ہو، لیکن جب اسے کچھ دکھائی نہ دیتا تو وہ پھر سے رونے لگتی۔

کرم دین کچھ دنوں سے فارغ ہی پھر رہا تھا، اس نے کبھی کہیں ٹک کر کام نہیں کیا تھا، وہ بمشکل ہی کہیں سیٹ ہو پاتا تھا، کہیں سے مالکان نکال دیتے اور کہیں سے وہ خود چھوڑ آتا تھا۔ اس نے کہیں کام پر نہیں جانا تھا، اس لیے سکون سے اٹھا اور نہا دھو کر کپڑے تبدیل کر کے حسبِ عادت ناشتہ کرنے کے لیے ماں کے پاس پہنچ گیا۔

''لاؤ ماں جلدی سے ناشتہ دو.....'' کرم دین نے اپنی عادت کے مطابق کمرے میں آتے ہی بات کی۔

''میں صدقے جاؤں اپنے بچے کے..... بھوک لگی ہوگی.....'' عظمت بی بی نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا۔

''ابھی کوئی کسر ہے ماں؟اتنی دیر تو ہوگئی ہے۔''
''میں کتنی بدنصیب ہوں میرے بچے کو بھوک لگی ہے، اور میں اٹھ کر اسے کھانا بھی نہیں دے سکتی۔'' عظمت بی بی نے روتے ہوئے کہا۔
''کیا بات ہے ماں! روکیوں رہی ہو؟''
''مجھے کچھ نظر ہی نہیں آرہا۔''
''کمال ہے ماں! اس وقت سے ایسے ہی لیٹی ہوئی اٹھ کر آنکھوں پہ پانی کے چھینٹے مار لیتی تو کب کی ٹھیک ہو چکی ہوتی۔''
''اچھا بچے یہ بھی کر کے دیکھ لیتی ہوں۔ تم کسی برتن میں مجھے پانی لا دو۔''
ماں کی بات سن کر کرم دین کچن سے جگ میں پانی بھر لایا اور عظمت بی بی ہاتھوں میں پانی ڈال کر اپنی آنکھوں پر چھینٹے مارنے لگی، جب تک پانی ختم نہ ہوا، کرم دین، ماں کے ہاتھوں پہ پانی ڈالتا رہا اور وہ چھینٹے مارتی رہی، پانی ختم ہو گیا تو عظمت بی بی دوپٹے کے پلو سے اپنے ہاتھ اور منہ صاف کرنے کے بعد آنکھوں کو جھپکنے لگی۔
''اب نظر آرہا ہے؟'' کرم دین نے ماں کو آنکھیں جھپکاتے ہوئے دیکھ کر دریافت کیا۔
''کچھ بھی نظر نہیں آرہا..... بچے کچھ بھی نظر نہیں آرہا'' عظمت بی بی یہ کہتے ہوئے پھر سے رونے لگی۔
''روتی کیوں ہو؟''
''روؤں نہیں تو کیا کروں؟''
''بس تم سکون سے لیٹ جاؤ..... میں بازار سے کچھ کھانے کے لیے بھی لے آتا ہوں اور ڈاکٹر کو بتا کر تمہارے لیے دوائی بھی لے آتا ہوں''
''ڈاکٹر تو بہت پیسے لے گا بچے! تم ایسا کرنا، حکیم جی سے بات کر کے گلاب کا عرق لے آنا، زیادہ پیسے بھی نہیں لگیں گے اور اللہ نے چاہا تو آنکھیں بھی ٹھیک ہو جائیں گی''
''اچھا ماں جیسا تم کہتی ہو.....ویسا ہی کرتا ہوں''
''ایک منٹ ٹھہرو۔ تمہارے پاس پیسے بھی نہیں ہوں گے'' یہ کہتے ہوئے عظمت بی بی اپنے دوپٹے کے کونے سے بندھی ہوئی گانٹھ ٹٹول کر کھولنے لگی اور پھر بولی ''لو اس میں سے کچھ پیسے لے لو''
ماں کی بات سن کر کرم دین نے اس میں سے پچاس روپے لے کر جیب میں ڈال لیے اور باقی پیسوں کو اسی طرح گانٹھ باندھ کر ماں کے حوالے کرتا ہوا باہر چلا گیا۔
کچھ ہی دیر بعد کرم دین نان چنے اور ماں کی آنکھوں میں ڈالنے کے لیے عرق گلاب لے آیا، اس نے نان چنے والا شاپر کچن میں رکھا اور گلاب کے عرق والی بوتل لے کر کمرے میں آ گیا... ''لو ماں تمہارے لیے گلاب کا عرق لے آیا ہوں'' کمرے میں داخل ہوتے ہی کرم دین نے بات کی۔
''جیتے رہو میرے بچے۔''
''ماں! حکیم جی سے تمہارے لیے خاص عرق گلاب لایا ہوں۔ حکیم جی کہہ رہے تھے، دونوں آنکھوں میں دو تین دن تک، دن میں چار پانچ بار ڈالتے رہیں۔ آنکھیں موتیوں کی طرح صاف ہو جائیں گی۔''
''تمہیں بھوک لگی ہوگی..... پہلے ناشتہ کر لو، پھر آنکھوں میں گلاب کا عرق ڈال دینا''
''بھوک تو تمہیں بھی لگی ہوگی ماں''
''میری خیر ہے بچے! پہلے تم کھا لو، پھر میں بھی کھا لوں گی''
ماں کی بات سن کر کرم دین کچن میں چلا گیا، اس نے ایک نان اور کچھ چنے پلیٹ میں رکھ کر ماں کو لا دیے اور خود کچن میں ہی کھڑا کھانے لگا، ناشتے کے بعد کرم دین واپس کمرے میں آیا تو ابھی تک عظمت بی بی نے بمشکل ایک دو لقمے ہی کھائے تھے، اسے کھانے میں بہت دشواری پیش آ رہی تھی، اس وقت عظمت بی بی بے بسی کی جیتی جاگتی تصویر دکھائی دے رہی تھی، کرم دین کچھ دیر تک پاس کھڑا دیکھتا رہا، پھر اس کے پاس ہی چارپائی پر بیٹھ کر اپنے ہاتھوں سے لقمے توڑ توڑ کر اسے کھلانے لگا۔
ناشتے کے بعد کرم دین نے ڈراپر سے ماں کی دونوں آنکھوں میں عرق گلاب ڈال دیا اور پھر اسے لٹاتے ہوئے بولا ''لو ماں اب تم آرام سے

لیٹو.....میں کہیں کسی کام کے لیے پتہ کروں"

"ٹھیک ہے بچے.....تم بے فکر ہو کر جاؤ، ماں کی دعائیں تمہارے ساتھ ہیں....." عظمت بی بی نے آنکھیں بند کیے ہوئے بات کی۔

کرم دین کئی دنوں سے بے کار تھا، اس لیے چاہتا تھا کہ کسی سے کام کے لیے کہے، وہ زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا مگر اس کی خواہش تھی کہ اگر اسے کوئی جاب ملے تو ایسی کہ جہاں سے اسے اچھی خاصی تنخواہ کے ساتھ گاڑی بھی ملے، اور اگر وقتی طور پر وہ گاڑی نہ دے سکتے ہوں تو کم از کم نئی موٹر سائیکل تو ضرور دیں۔ کرم دین نے بہت سی جگہوں پر قسمت آزمائی تھی، مگر چھوٹی موٹی ملازمت کے سوا، اس کی مرضی کے مطابق کہیں کوئی ڈھنگ کی نوکری نہیں ملی تھی اور اب بھی اس کے استعمال میں وہی برسوں پرانی ٹوٹی پھوٹی زنگ آلود سائیکل تھی۔ کرم دین کا معمول تھا کہ جن دنوں وہ فارغ ہوتا، صبح ناشتہ کر کے گھر سے نکل جاتا اور پھر اپنی مرضی سے ہی رات کو کسی وقت لوٹ کر آتا۔

اس نے ملازمت کے لیے کئی جان پہچان والوں سے بات کی مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا، وہ اپنی عادت کے مطابق لیٹ ہی آتا مگر یہ سوچ کر کہ ماں کو اس کی ضرورت ہوگی، وہ جلد ہی گھر واپس آ گیا۔ کرم دین نے گھر کا دروازہ کھولا اور سائیکل ایک طرف کھڑی کر کے اپنی ماں کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا، وہ یہ دیکھ کر پریشان ہو گیا کہ کمرے میں اس کی ماں کی چارپائی کے اردگرد بہت سی محلے دار خواتین کھڑی تھیں۔

"کچھ تو خیال کیا کرو کرم دین، تمہاری ماں کو کچھ نظر نہیں آ رہا، تم اسے کسی ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی بجائے گھومتے پھر رہے ہو۔" کمرے کے قریب پہنچتے ہی کسی محلے دار خاتون کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

اس سے پہلے کہ کرم دین کوئی جواب دیتا، عظمت بی بی بول پڑی۔ "یہ بے چارہ تو مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جانے کے لیے کہہ رہا تھا، مگر میں نے ہی منع کر دیا تھا اور ڈاکٹر کے پاس جانے کے بجائے حکیم جی سے گلاب کا عرق لانے کو کہا تھا۔"

"مگر بہن یہ آنکھوں کا معاملہ ہے۔ خالی گلاب کے عرق پہ نہ رہو۔" عظمت بی بی کی بات سن کر وہاں کھڑی ایک عورت نے سمجھایا۔

"ہاں.....ہاں.....کیوں نہیں، ضرورت پڑی تو ڈاکٹر کے پاس بھی ضرور جائیں گے۔ بس ایک دو دن گلاب کا عرق ڈال کر دیکھ لیں۔ امید تو ہے کہ اسی سے آرام آ جائے گا۔ ورنہ کسی آنکھوں کے ہسپتال لے جاؤں گا" کرم دین نے وضاحت کی۔

"پہلے کی اور بات تھی کرم دین، اب اسے تمہاری ضرورت ہوتی ہے، اس لیے زیادہ دیر گھر سے باہر نہ رہا کرو۔ آج تو چاچی خیری کے ذریعے ہمیں خبر مل گئی اور ہم چلی آئیں، ورنہ یہ بے چاری یونہی اکیلی لیٹی روتی رہتی۔" ایک اور محلے دار خاتون نے سمجھایا۔

"ٹھیک ہے چاچی ایسا ہی ہوگا۔" کرم دین نے آہستہ سے بات کی۔

"اچھا بہن اب تم آرام کرو۔ ہم چلتی ہیں۔" ایک خاتون نے بات کی تو عظمت بی بی نے اپنا دایاں ہاتھ تھوڑا سا اٹھا کر شکریہ ادا کیا، پھر ایک ایک کر کے تمام خواتین وہاں سے چلی گئیں۔

"کچھ فرق پڑا ماں؟" کرم دین نے ماں کے پاس بیٹھتے ہوئے دریافت کیا۔

"تم میری چھوڑو، آہستہ آہستہ فرق پڑ ہی جائے گا۔ تم یہ بتاؤ کہیں کام کا کچھ بنا؟"

"نہیں ماں! ابھی تو کچھ نہیں بنا"

"نماز پڑھا کرو بچے، خدا کو یاد رکھو گے تو وہ بھی تمہیں یاد رکھے گا۔"

"پڑھوں گا ماں، بس ذرا سستی ہو جاتی ہے اور تو کوئی مسئلہ نہیں"

"یہ تو ہم لوگوں کے بہانے ہوتے ہیں بچے۔ کوئی تمہاری طرح سستی کا بہانہ بناتا ہے اور کوئی اپنی مصروفیت کا بہانہ بنا لیتا ہے"

"اچھا ماں! کل سے نماز پڑھنا شروع کر دوں گا۔"

"کل کبھی نہیں آیا کرتی بچے۔ جو کام آج سے شروع کیا جا سکتا ہو، اسے کل پہ کیوں چھوڑنا۔"

"ٹھیک ہے ماں! جیسا تم کہتی ہو، ویسا ہی ہوگا اور کچھ.....؟"

"ماں کا کیا ہے بچے۔ وہ تو خوش ہو ہی جائے گی، لیکن اصل خوشی اس میں ہے کہ ہم خدا اور اس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق زندگی بسر کریں تا کہ خدا اور اس کا پیارا نبی ہم سے راضی اور خوش ہو۔" عظمت بی بی بات کرتے کرتے رک گئی کیونکہ کوئی محلے دار خاتون اس کی خیریت جاننے کے لیے کمرے میں آ کھڑی ہوئی تھی۔

خاتون کے آتے ہی کرم دین نے موقعہ غنیمت جانا اور جلدی سے وہاں سے نکل کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ عظمت بی بی کی عادت تھی کہ

اسے جب بھی کبھی موقعہ ملتا، وہ کرم دین کو زمانے کے اونچ نیچ اور نماز ادا کرنے کے متعلق سمجھانے لگتی، جب تک عظمت بی بی، کرم دین کو سمجھاتی رہتی، وہ خاموشی سے سنتا رہتا، مگر اس نے کبھی کسی نصیحت پر عمل نہیں کیا تھا۔

☆☆☆☆☆

عظمت بی بی کا خیال تھا کہ آنکھوں میں عرقِ گلاب ڈالنے سے اس کی بینائی واپس آ جائے گی، لیکن جب حکیم جی کی ہدائیت کے مطابق دو دن تک آنکھوں میں گلاب کا عرق ڈالنے سے کچھ فرق نہ پڑا تو عظمت بی بی کی پریشانی بڑھنے لگی۔ کرم دین دوپہر کو ہی اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا تھا، کچھ دیر بعد ہی اس کی آنکھ لگ گئی تھی، جب اس کی آنکھ کھلی تو باہر اندھیرا پھیل چکا تھا، اندھیرا دیکھ کر وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ بیٹھا اور فوراً ہی چارپائی چھوڑتے ہوئے منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر جلدی سے اپنی ماں کے پاس آ گیا۔

''کیا بات ہے ماں!..... کچھ پریشان دکھائی دے رہی ہو؟'' ماں کو خاموش بیٹھے دیکھ کر کرم دین نے سوال کیا۔

''ہاں..... پریشانی کی بات تو ہے''

''کیا ہوا ماں؟''

''میرا خیال تھا کہ ایک دو دن آنکھوں میں گلاب کا عرق ڈالنے سے نظر آنے لگے گا مگر مجھے تو کچھ بھی فرق نہیں پڑا۔''

''میں نے کہا تو تھا۔ کسی ڈاکٹر کو دکھا لیتے ہیں لیکن تم نے ہی کہا تھا کہ حکیم سے گلاب کا عرق لا دو۔''

''بات تو تمہاری ٹھیک ہے میں یہ چاہتی تھی کہ ڈاکٹر کے پاس نہ ہی جانا پڑے اور حکیم سے گلاب کا عرق لے کر سستے میں ہی جان چھوٹ جائے۔''

''اب کیا پروگرام ہے؟''

''لگتا ہے کسی ڈاکٹر کے پاس جانا ہی پڑے گا۔''

''میں تو کہتا ہوں ادھر ادھر بھٹکنے کی بجائے بہتر ہے کہ کسی آنکھوں کے ہسپتال میں چلتے ہیں۔''

''محلے کی عورتیں بھی یہی کہہ رہی تھیں۔''

''تم ان کی بات چھوڑو، یہ بتاؤ تمہاری اپنی مرضی کیا ہے؟''

''میرے خیال میں بھی یہی صحیح رہے گا۔ ہم کسی سرکاری ہسپتال میں چلتے ہیں۔ وہاں آنکھوں کے ڈاکٹر کو دکھا دیں گے۔''

''ٹھیک ہے ماں! تم تیار رہنا۔ ہم کل صبح ہی کسی ہسپتال چلیں گے۔''

''اچھا بچے!'' عظمت بی بی نے بیٹے کی بات سن کر آہستہ سے کہا۔

پروگرام کے مطابق کرم دین صبح سویرے ہی عظمت بی بی کو لیے قریبی ہسپتال پہنچ گیا، وہ ڈاکٹروں کے آنے سے کافی دیر قبل ہی ہسپتال پہنچ گئے تھے، مگر بہت سے مریض ان سے بھی پہلے وہاں موجود تھے۔ کرم دین نے ادھر ادھر نظر دوڑائی اور ایک خالی بنچ دیکھ کر ماں کو اس پر بٹھا دیا، کچھ ہی دیر بعد ڈاکٹر صاحب کا معاون آ گیا، اس کے آتے ہی اپنی باری کے لیے ٹوکن لینے والوں کی قطار لگ گئی، کرم دین نے بھی ٹوکن لیا اور باری کے انتظار میں ماں کے پاس ہی دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد ڈاکٹر صاحب بھی اپنے کمرے میں آ کر بیٹھ گئے، ان کے آتے ہی اپنی باری کے حساب سے ایک ایک کر کے مریض ان کے پاس جانے لگے، جب عظمت بی بی کا نام پکارا گیا تو کرم دین اسے بازوؤں سے پکڑ کر ڈاکٹر کے کمرے میں لے گیا اور احتیاط سے ڈاکٹر کے پاس اسٹول پر بٹھا دیا۔

''ڈاکٹر صاحب مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا.....'' بیٹھتے ہی عظمت بی بی نے بات کی، مگر ڈاکٹر اس کی بات پر توجہ دیے بغیر ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹارچ کی روشنی عظمت بی بی کی آنکھوں میں ڈالتے ہوئے چیک کرنے لگا۔

''کب سے دکھائی نہیں دے رہا.....؟'' آنکھوں کا معائنہ کرتے ہوئے ڈاکٹر نے سوال کیا۔

''دو دن ہو گئے ہیں ڈاکٹر صاحب! میں صبح نماز کے لیے وضو کرنے اٹھی تھی کہ آنکھوں کے سامنے پہلے دھواں سا آیا پھر اندھیرا چھا گیا اور مجھے نظر آنا بند ہو گیا۔''

''اسی دن ہسپتال کیوں نہیں آئے۔؟''

''کوئی فکر کی بات ہے ڈاکٹر صاحب؟'' کرم دین نے ڈاکٹر کا سوال سن کر ڈرتے ڈرتے دریافت کیا۔
''ہاں..... تم لوگوں نے آنے میں بہت دیر کر دی۔ جس روز یہ مسئلہ ہوا تھا، اسی روز آ جاتے تو کچھ بچت ہو جاتی، مگر اب دونوں آنکھوں پر جو کالا موتیا اترا ہے وہ آپریشن سے بھی صحیح نہیں ہوگا۔''
''اس کا کوئی حل تو ہوگا ڈاکٹر صاحب؟'' ڈاکٹر کی بات سن کر عظمت بی بی میں تو ہمت نہیں رہی تھی کہ وہ کچھ کہہ پاتی مگر کرم دین نے بمشکل سوال کیا۔
''اب صبر کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔'' ڈاکٹر نے مایوس کن لہجے میں بات کی اور پھر کاغذ پر کچھ لکھ کر کرم دین کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا ''یہ کچھ ڈراپس ہیں، دونوں آنکھوں میں چار چار گھنٹے بعد ڈالتے رہیں۔''
کرم دین نے ڈاکٹر سے نسخہ لے کر جیب میں ڈال لیا اور بازو سے پکڑ کر ماں کو اٹھاتے ہوئے خاموشی سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا باہر کی طرف چل پڑا۔
جب گلاب کا عرق ڈالنے سے فرق نہیں پڑا تھا تو انہیں اس بات کی تسلی تھی کہ ہسپتال سے آنکھوں کے ڈاکٹر سے دوائی لیتے ہی آنکھیں پہلے کی طرح ٹھیک ہو جائیں گی، مگر وہاں سے سخت مایوسی ہوئی تھی، اس کے باوجود کرم دین نے ہمت نہ ہاری اور اسی وقت وہاں سے نکل کر دوسرے ہسپتال جا پہنچا، مگر وہاں سے بھی پہلے کی طرح مایوس کن جواب ملا، اس روز اس نے کئی ہسپتالوں کے چکر کاٹے مگر کہیں سے بھی روشنی کی کوئی کرن دکھائی نہ دی، آخر کار شام ڈھلے وہ تھک ہار کر گھر لوٹ آئے۔ ہسپتال جانے سے پہلے امید کی جو کرن دکھائی دے رہی تھی، وہ ختم ہو کر رہ گئی تھی، اسی لیے وہ گھر پہنچے تو سخت مایوس کن حالت میں تھے، عظمت بی بی اور کرم دین، دونوں ہی اس سوچ میں تھے کہ اب گھر کس طرح چل پائے گا۔
عظمت بی بی کی بینائی جانے سے گھر کا نظام بکھر کر رہ گیا تھا، دو چار روز تک کوئی نہ کوئی محلے دار خاتون اظہار ہمدردی کے طور پر گھر کا کوئی نہ کوئی کام کر جاتی اور سالن بھی پکا کر رکھ جاتی، لیکن ایسا کب تک چل سکتا تھا، کوئی ہمسایہ چند دن کے لیے تو تعاون کر سکتا ہے، مگر ہمیشہ کے لیے کسی کے لیے بھی ممکن نہیں۔
پہلے گھر کے چھوٹے موٹے کام نمٹانے اور پابندی سے ہر نماز وقت پر ادا کرنے سے عظمت بی بی کا وقت با آسانی کٹ جاتا تھا، اب اس طرح کی کوئی مصروفیت نہیں رہی تھی، کرم دین گھر میں موجود ہوتا تو وہ اس کی مدد سے وضو کر کے چارپائی پر ہی نماز ادا کر لیتی، ورنہ سارا سارا دن چارپائی پر لیٹے ہوئے گزرتا، فرصت کے لمحات میسر آنے لگے تو عظمت بی بی کو بیٹوں، بہوؤں اور پوتے پوتیوں کی یاد آنے لگی اور ان سے ملنے کے لیے دل تڑپنے لگا۔
''ایک بات کہوں کرم دین؟'' عظمت بی بی نے موقعہ پا کر ڈرتے ڈرتے بات کی۔
''کیوں نہیں ماں! جو کہنا ہے کہو۔'' کرم دین نے ماں کے پاس ہی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
''ڈرتی ہوں، کہیں تم خفا نہ ہو جاؤ''
''ایسا کیوں سوچتی ہو ماں! جو کہنا چاہتی ہو کہہ دو..... ڈر کس بات کا.....؟''
''دراصل..... میں..... میں چاہ رہی تھی..... کہ.....''
''رک کیوں گئی ہو..... کہو ناں جو کہنا ہے''
''تمہارے بھائیوں سے ملنے کو بہت دل چاہ رہا ہے۔'' عظمت بی بی نے رک رک کر اپنی بات مکمل کی۔
ماں کی بات سن کر کرم دین کو چپ سی لگ گئی تھی، عظمت بی بی کچھ دیر تک کرم دین کے جواب کا انتظار کرتی رہی، لیکن جب اسے کوئی جواب نہ ملا تو وہ پھر بول پڑی۔ ''کیا بات ہے تم کوئی جواب کیوں نہیں دے رہے؟''
ماں کا سوال سن کر کرم دین نے ایک لمبی سانس چھوڑی اور بولا ''اب میں کیا کہوں ماں تمہاری بات ٹال بھی نہیں سکتا لیکن سوچ لو کہیں ایسا نہ ہو وہ یہ سمجھیں کہ اس موقعہ پر انہیں اس لیے بلایا ہے، تاکہ کچھ مدد حاصل کی جا سکے۔''
''وہ ایسا سوچتے ہیں تو سوچتے رہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ایک ماں اپنے بچوں سے ملنا چاہتی ہے۔ اس کے سوا کچھ بھی نہیں''
''تم فکر نہ کرو میں انہیں کل ہی پیغام بھجوا دوں گا''

''اچھا بچے! خدا تمہیں خوش رکھے''، عظمت بی بی نے قریب بیٹھے بیٹے کے سر کو ٹٹول کر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

ماں کی بات ختم ہوتے ہی کرم دین اٹھ کھڑا ہوا، وہاں سے جانے سے پہلے اس نے کمرے کی لائٹ بند کر کے زیرو کا بلب جلا دیا اور پھر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ عظمت بی بی کروٹ لے کر لیٹ گئی تھی، کمرے میں مکمل خاموشی تھی، جس کی وجہ سے کمرے میں لگے وال کلاک کی ٹک ٹک بھی صاف سنائی دے رہی تھی، گھڑی کی ٹک ٹک سے عظمت بی بی وقت کا حساب لگانے لگی، کتنے ہی ماہ و سال گزر گئے تھے اس کے بچوں کو گھر سے گئے، کیا اس دوران کبھی ایک بار بھی انہیں جنم دینے والی ماں کی یاد نہیں آئی تھی، شائد اب وہ ان کے لیے ایک فالتو سی چیز تھی جس سے انہیں کوئی فائدہ حاصل ہونے والا نہیں تھا۔

عظمت بی بی کروٹیں بدلتی رہی اور اپنے بچوں کے متعلق سوچتی رہی، آخر کار وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ اگر آج تک انہوں نے ماں کے پاس آنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تو کہیں واقعی وہ یہ نہ سوچ بیٹھیں کہ ضرور ماں کو کوئی ضرورت آن پڑی ہے، جو انہیں بلایا ہے۔ ایک ماں دیر تک بستر پر لیٹی اپنے بچوں سے ملنے کے لیے تڑپتے ہوئے بار بار پہلو بدلتی رہی، اسے کسی پل بھی چین نہیں آ رہا تھا، بے سکونی بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی، جب اسے اپنا بستر کانٹوں کی طرح چبھنے لگا تو مجبوراً وہ اٹھ بیٹھی اور چارپائی کے پائے سے لٹکی ہوئی تسبیح لے کر سرہانے سے ٹیک لگا کر تسبیح کرنے لگی، یوں رات اسی کیفیت میں کبھی سوتے کبھی جاگتے کٹ گئی۔

کرم دین اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا تھا، وہ ماں کے کہنے پر بھائیوں کو بلانے کے لیے ہاں تو کر آیا تھا، مگر لیٹتے ہی اس کا ذہن اس معاملے میں الجھ کر رہ گیا تھا، وہ ہر پہلو پر غور کرتا رہا اور سوچتا رہا کہ اس موقعہ پر اگر اس کے بلانے پر اس کے بھائی وہاں آتے ہیں تو کیا وہ یہ نہیں سوچیں گے کہ انہیں جان بوجھ کر بلوایا گیا ہے تاکہ اس موقعہ پر بہانے سے وہ ان سے کچھ رقم حاصل کر سکیں، وہ دیر تک اس معاملے کو سلجھانے میں لگا رہا مگر پھر اس نے یہ سوچ کر اس معاملے پر مزید غور کرنا چھوڑ دیا کہ انہیں بلانے کی خواہش ماں کی ہے اور اگر ایک ماں اپنے بیٹوں سے ملنا چاہتی ہے تو اسے ضرور ملنا چاہیئے، اسے کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ خوامخواہ کے سوالات ذہن میں لائے۔

گو کہ بات بظاہر معمولی سی تھی مگر رات بھر ماں سو سکی، نہ بیٹا۔

''کیا بات ہے ماں! تمہاری آنکھیں کیوں سوجی ہوئی ہیں؟'' صبح کرم دین نے ماں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ نہیں بچے! بس رات کو آنکھ نہیں لگی۔ شائد اسی وجہ سے آنکھیں سوج گئی ہوں گی'' عظمت بی بی نے مختصر سا جواب دیا، لیکن اگر اس کی آنکھوں کی بینائی ختم نہ ہوئی ہوتی تو یہی سوال وہ اس سے بھی کرتی اور پوچھتی ''آنکھیں تو تمہاری بھی سوجی ہوئی ہیں کیا تم بھی رات بھر سو نہیں سکے؟''

ماں کی بات سن کر ابھی کرم دین کچھ بول نہیں پایا تھا کہ عظمت بی بی خود ہی بول پڑی۔ ''جانتے ہو میں رات بھر کیوں نہیں سو سکی؟''

''جانتا ہوں ماں بیٹوں نے جو ملنے آنا پھر تمہیں نیند کیسے آتی''

''کہتے تو تم ٹھیک ہو لیکن آج تک اگر بیٹے، ماں سے ملنے نہیں آ سکے تو ایک ماں نے بھی اپنے سینے پر پتھر رکھ کر ان سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نہ ملنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

لیکن کل تو تم انہیں بلانے کے لیے کہہ رہی تھی اور آج.....''

''کل کی بات اور تھی..... میں جزبات میں بہہ گئی تھی..... مگر..... اب تم میری ایک بات یاد رکھنا۔ میں مر بھی جاؤں تو تم انہیں میرے مرنے کی بھی اطلاع مت کرنا، کیونکہ جو زندگی میں ماں کے پاس کبھی دو گھڑیاں آ کر نہیں بیٹھے، وہ مری ہوئی ماں کا منہ دیکھ کر بھی کیا کریں گے۔''

''خدا تمہیں زندگی دے ماں۔ ایسا کیوں کہتی۔؟''

''جیسے جیسے جانے کا وقت قریب آتا جاتا ہے اس طرح کی باتیں خود بخود منہ سے نکلنے لگتی ہیں بچے''

''ویسے بھی ماں، تمہارے وہ بیٹے پیسے والے امیر لوگ ہیں پھر بھلا وہ غریبوں کی اس بستی میں کیا لینے آئیں گے''

''امیر وہ نہیں تم ہو تمہارے پاس ماں ہے جو اُن کے پاس نہیں اور جانتے ہو ماں، خدا کا دیا ہوا وہ عظیم تحفہ ہے جو دولت سے خریدا نہیں جا سکتا۔''

''پھر بھی ماں! پیسہ بھی بہت ضروری ہے اس کے بغیر دنیا کا کوئی کام بھی تو نہیں ہوتا۔ اب یہی دیکھو ناں۔ آج ہمارے پاس بھی دولت ہوتی تو تم یوں بے بسی کے عالم میں چارپائی پر نہ لیٹی ہوتی۔ تمہارا ابھی اچھے ڈاکٹروں سے علاج ہو رہا ہوتا۔''

''اوپر والے کا شکر ادا کرنا سیکھو بچے! اس نے جو نہیں دیا، اس کا شکوہ کرنے کی بجائے، اس کی ان نعمتوں کا شکر ادا کرو، جو اس نے ہمیں دے رکھی ہیں''

عظمت بی بی کے پاس کرم دین کی ہر بات کا جواب موجود تھا، مگر جو وہ کہنا چاہ رہی تھی، کرم دین ماننے کو تیار نہیں تھا، اور جو کرم دین کہہ رہا تھا، وہ عظمت بی بی سننے کو تیار نہیں تھی، اس لیے کرم دین نے خاموشی اختیار کر لی۔

وقت گزرنے لگا، عظمت بی بی ایسی چارپائی پر پڑی کہ بہت سی بیماریاں ایک ایک کر کے اس پر سوار ہوتی گئیں۔ کرم دین کام کاج کے سلسلے میں سارا سارا دن گھر سے باہر رہتا اور عظمت بی بی چارپائی پر پڑی رہتی، کبھی کسی روز کوئی بیماری زور کر جاتی تو وقتی طور پر ایک دو دن کسی ڈاکٹر یا حکیم سے دوا آ جاتی۔ کرم دین کو اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ اس کی ماں کو مکمل علاج کی ضرورت ہے، مگر اس کے لیے گھر چلانا مشکل ہو رہا تھا، علاج کے لیے رقم کہاں سے آتی، یوں بھی ایک آدھ بیماری ہوتی تو شائد اس کا علاج ہو بھی جاتا مگر عظمت بی بی کو ایک ساتھ کئی بیماریوں نے گھیر رکھا تھا، آخر کار ایک روز وہ ان بیماریوں سے لڑتے لڑتے تھک کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سو گئی۔

وہ اس قدر نیک اور ملنسار خاتون تھی کہ اس کی موت نے سبھی کو رلا دیا، یوں بھی بستی کے لوگ آپس میں اس قدر جڑے ہوئے تھے کہ جیسے ہی کسی کے دکھ درد کے متعلق سنتے، فوراً وہاں پہنچ جاتے، عظمت بی بی کی فوتگی کے بارے میں مسجد میں اعلان ہوا تو اسی وقت روتی پیٹتی محلے دار خواتین ان کے ہاں پہنچ گئیں۔

عظمت بی بی نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنا کفن تیار کر رکھا تھا، غسل کے بعد وہی کفن پہنا کر اسے چارپائی پر لٹا دیا گیا تھا، محلے کے چند لڑکوں نے مل کر قبر بھی کھود دی تھی، مسجد میں جنازے کا اعلان کر دیا گیا تھا، جنازہ اٹھایا جانے والا تھا جب تین گاڑیاں ان کے گھر کے سامنے آ کر رکیں، جن میں کرم دین کے تینوں بھائی اور ان کے بیوی بچے آئے تھے۔

کرم دین نے ماں کی خواہش اور حکم کے مطابق جان بوجھ کر بھائیوں کو اطلاع نہیں دی تھی، مگر کسی نہ کسی ذریعے سے انہیں اطلاع مل گئی تھی، صبح سے شام ہو گئی تھی، کرم دین کی آنکھ سے ایک بھی آنسو نہیں نکلا تھا، مگر جیسے ہی اس کی نظر بھائیوں پر پڑی، وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، ایک مدت بعد اس نے بھائیوں کو دیکھا تھا، اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ان سے لپٹ کر خوب روئے، مگر ایسا بھی نہ ہو سکا، کیونکہ وہ ماں کی موت کا سن کر شائد محض رسم دنیا نبھانے کے لیے چلے آئے تھے، ورنہ ان تینوں میں سے کسی ایک کی بھی آنکھ میں آنسو نہیں تھے، مگر ان تینوں کی بیویاں جب سے آئی تھیں، مسلسل روئے جا رہی تھیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو نہیں تھمے تھے، ہو سکتا ہے یہ دنیا کو دکھانے کے لیے تھا یا اس وقت انہیں کسی اپنے کی موت یاد آ گئی تھی یا پھر وہ پچھتاوے کے آنسو تھے، اسے جو بھی نام دیا جائے، مگر وہ رو رہی تھیں۔

چاروں بھائیوں نے مل کر ماں کے جنازے کو کندھوں پر اٹھا لیا اور کلمہء شہادت کا ورد کرتے ہوئے قبرستان کی طرف چل پڑے، جنازے کے بعد جب سبھی ایک ایک کر کے وہاں سے چل دیے، تو کرم دین کا خیال تھا کہ اب اس کے بھائی بھی چلے جائیں گے، مگر ان میں سے کوئی بھی وہاں سے نہ گیا، لیکن اگلے روز رسم قل کے بعد دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھے اور وہاں سے یوں چل دیے جیسے وہ جو ڈیوٹی پوری کرنے آئے تھے وہ پوری ہو گئی تھی، اب انہیں وہاں رہ کر کیا کرنا تھا۔

☆☆☆☆☆

ماں کے سوا کرم دین کے پاس کچھ بھی نہیں تھا، ماں کی موت نے اسے اور بھی تنہا کر دیا تھا، جب تک وہ زندہ تھی، اسے کھانا کھلانے کے لیے کرم دین کو گھر آنا ہی پڑتا تھا، جب تک کرم دین گھر نہ پہنچتا، وہ انتظار میں بیٹھی رہتی اور کئی بار ایسا بھی ہوتا کہ وہ انتظار کرتے کرتے کھانا کھائے بغیر ہی سو جاتی تھی۔ اب وہ دنیا میں نہیں رہی تھی، اس لیے کرم دین کے وقت پر گھر پہنچنے والی ذمہ داری ختم ہو گئی تھی، یوں بھی ماں کے مرنے کے بعد کئی روز تک گھر میں بیٹھے رہنے کے بعد جب وہ واپس اپنے کام پر گیا تو اس کی جگہ کسی دوسرے شخص کو ملازم رکھ لیا گیا تھا، اب اس نے معمول بنا لیا تھا کہ دن بھر روزگار کی تلاش میں گزار دیتا اور پھر رات گئے تک کہیں نہ کہیں دوستوں کے پاس بیٹھا رہتا۔

وقت بے وقت گھر آنے کی وجہ سے کچھ ہی دنوں میں ہر جگہ ہر چیز پر مٹی کی تہیں چڑھ گئی تھیں، جب سے عظمت بی بی کی بینائی ختم ہوئی تھی، گھر کی صفائی کا کام صحیح طرح سے نہیں ہو پاتا تھا، پھر بھی عظمت بی بی کسی نہ کسی محلے دار خاتون سے کہہ کر کچھ دن کے وقفے سے گھر کی صفائی کروا لیا کرتی تھی، اب وہ سلسلہ بھی نہیں رہا تھا، عظمت بی بی کے فوت ہو جانے اور گھر میں کوئی دوسری خاتون نہ ہونے کی وجہ سے محلے کی خواتین نے بھی آنا چھوڑ دیا تھا۔

مسلسل بے کار رہنے کی وجہ سے وقت گزارنا مشکل ہوتا جا رہا تھا، محلے والوں میں سے کسی کو بھی اس بات کی قطعی پرواہ نہیں تھی کہ ماں کے مرنے کے بعد کرم دین کے گھر میں روٹی بھی پکتی ہے یا پھر وہ بھوکا ہی سو جاتا ہے، چاچی خیری وہ واحد محلے دار خاتون تھی، جو تھوڑے تھوڑے دن کے وقفے سے کسی نہ کسی بہانے کچھ دیر کے لیے ضرور چکر لگا جاتی تھی، ایک روز وہ آئی تو کرم دین کو پریشان دیکھ کر اسے محلے کی مسجد کے امام، میاں جی کے پاس جانے کا مشورہ دیا تاکہ وہ اس کے لیے کوئی تعویز دھاگہ کر دیں۔

چاچی خیری کے منہ سے میاں جی کے پاس جانے کا سن کر کرم دین کو اپنے بچپن کا وہ واقعہ یاد آ گیا جب اس نے انجانے میں میاں جی کی شان میں گستاخی کی تھی اور اس کی ماں نے ایسا زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارا تھا، جس کی گونج اب تک اس کے کانوں میں باقی تھی، پھر ماں نے اسے پیار سے اپنے سینے سے چمٹاتے ہوئے کہا تھا ''وہ آل رسول ﷺ ہیں، ان کی عزت و احترام کرنا ہم پر لازم ہے، وہ اس بستی کے لیے بہت بڑی نعمت ہیں، ان کی وجہ سے یہاں بہت برکتیں ہیں، بچے! آئندہ کبھی بھی ان کے لیے اپنی زبان سے کوئی غلط لفظ نہ نکالنا.....'' اسے یاد تھا کہ اس روز اسے چپ کراتے ہوئے ماں خود بھی رو پڑی تھی۔

سال میں دو عیدوں کے علاوہ کرم دین نے کبھی مسجد کا رخ نہیں کیا تھا، اس لیے اسے میاں جی کے پاس جاتے ہوئے شرم محسوس ہو رہی تھی، مگر چاچی خیری اس کے ایسی پیچھے پڑی کہ اسے میاں جی کے پاس جانا ہی پڑا، اس نے ہمت کر کے میاں جی کے پاس جانے کا پروگرام بنایا تھا اور انتہائی سوچ بچار کے بعد ان سے ملنے کا وہ وقت منتخب کیا تھا، جب ان کے پاس کوئی کم کم ہی آتا تھا۔

یوں تو گاہے بگاہے کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی موقعہ پر کرم دین کی ملاقات میاں جی سے ہو جایا کرتی تھی، مگر میاں جی کے حجرے میں اس نے پہلی بار قدم رکھا تھا، وہ اس بات سے خائف تھا کہ میاں جی یقیناً طرح طرح کے سوالات کریں گے، اس لیے وہ ہر طرح کے سوالات کے لیے تیار ہو کر حجرے میں داخل ہوا تھا، کرم دین کی سوچ کے مطابق میاں جی حجرے میں اکیلے ہی تھے، اس نے انہیں سلام کیا تو وہ سلام کا جواب دینے کے بعد اپنے مخصوص انداز میں انتہائی شفقت سے بولے۔ ''آؤ بیٹھو کرم دین۔''

حجرے میں داخل ہوتے ہی بیٹھنے کا اشارہ پا کر، کرم دین خاموشی سے ان کے سامنے بیٹھ گیا، میاں جی سفید کاغذ پر کچھ لکھ رہے تھے، وہ خاموشی سے بیٹھا انہیں لکھتے ہوئے بغور دیکھنے لگا، اس نے میاں جی کی تحریر پڑھنے کی بہت کوشش کی مگر وہ اس قدر عجیب سی لکیریں کھینچ رہے تھے کہ اس کے پلے ایک لفظ بھی نہیں پڑ رہا تھا۔

''کیسے آنا ہوا کرم دین.....؟'' میاں جی نے کاغذ قلم ایک طرف رکھا اور کرم دین کی طرف دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔

''میاں جی! ماں زندہ تھی تو جیسے تیسے گھر کا نظام چل رہا تھا، مگر جب سے وہ فوت ہوئی ہے، گھر گھر ہی نہیں لگتا.....''

''زندگی اور موت تو اوپر والے کے ہاتھ میں ہے تمہاری ماں کی جتنی زندگی تھی وہ گزار گئی لیکن یہ تو تم بھی جانتے ہو، کسی کے جانے سے دنیا کا نظام رُک نہیں جاتا تمہیں بھی اپنا گھر کسی نہ کسی طرح چلانا ہوگا۔''

''اسی لیے تو آپ کے پاس آیا ہوں آپ ہمارے بڑے ہیں مجھے مشورہ دیں کہ میں کیا کروں۔''

کرم دین کی بات سن کر میاں جی کچھ سوچنے لگے اور پھر بولے ''تم شادی کر لو۔''

''شادی؟'' میاں جی کا مشورہ سن کر کرم دین نے حیران ہو کر دریافت کیا۔

''اس میں اس قدر حیران ہونے والی کون سی بات ہے؟''

''میاں جی کہیں آپ مزاق تو نہیں کر رہے؟ میرے گھر میں دو وقت کا کھانا مشکل سے پکتا ہے اور آپ شادی کا مشورہ دے رہے ہیں۔''

''میں نے تو کوئی مزاق نہیں کیا کرم دین! ہاں اگر تم اسے مزاق سمجھ رہے ہو تو یہ اور بات ہے۔''

''مگر میاں جی! میں تو اس لیے حاضر ہوا تھا کہ آپ مجھے کوئی تعویز لکھ دیں گے تاکہ میرے حالات بھی کچھ بہتر ہو جائیں۔''

''تعویز تو میں لکھ دیتا ہوں کرم دین! مگر نماز پڑھا کرو پھر دیکھنا اپنے آپ ہی تمہارے سارے کام ہوتے چلے جائیں گے اور نماز پڑھنے سے تمہیں اس قدر سکون ملے گا کہ سب دکھ بھول جاؤ گے۔'' میاں جی نے کرم دین کو سمجھایا۔

''ٹھیک ہے میاں جی۔'' کرم دین نے میاں جی کی بات سن کر نظریں جھکا کر کہا۔

میاں جی نے کاغذ قلم اٹھایا اور دو تعویز لکھ کر کرم دین کے حوالے کرتے ہوئے بولے ''اس تعویز کو پلاسٹک کور چڑھا کر گھر میں لٹکا دو اور یہ تعویز چمڑے میں سلوا کر اپنے گلے میں ڈال لو۔ اللہ بہتر کرے گا۔''

کرم دین نے تعویز لے کر احتیاط سے جیب میں ڈال لیے اور اٹھتے ہوئے میاں جی سے ہاتھ ملایا، پھر جیب سے پانچ روپے نکال کر میاں جی کے پاس پڑی ہوئی صندوقچی میں ڈال کر وہاں سے نکل آیا۔

اس نے راستے میں ہی ایک تعویز چمڑے میں سلوا کر گلے میں ڈال لیا تھا اور دوسرے پر پلاسٹک کور چڑھا کر گھر پہنچتے ہی ایک کیل پر ٹانگ دیا۔ وہ بہت خوش تھا اور یہ سوچ کر اسے دلی اطمینان ہو رہا تھا کہ میاں جی کے تعویز ضرور کام کر دکھائیں گے۔ میاں جی کے حجرے سے نکلتے ہوئے اس نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ اب وہ باقاعدگی سے نماز ادا کیا کرے گا، مگر گھر پہنچنے تک اس کے ارادے اس کے ذہن سے نکل چکے تھے، بس یاد تھا تو اتنا کہ ایک تعویز اس کے گلے میں ہے اور دوسرا کیل سے لٹکا ہوا ہے، اب اسے فکر کی کوئی ضرورت نہیں۔

دن گزرنے لگے مگر میاں جی کے تعویزوں نے کرم دین کی سوچ کے مطابق کوئی کام نہ کر دکھایا۔ کرم دین کی بے کاری اور بے سکونی پہلے کی طرح اپنی جگہ موجود تھی، اس میں ذرہ بھر بھی کمی نہیں آئی تھی، اس کے باوجود وہ اس انتظار میں تھا کہ شائد کسی روز قسمت اس پر مہربان ہو جائے، مگر جب ایسا کچھ نہ ہوا اور انتظار مایوسی میں بدلنے لگا تو کرم دین نے ایک بار پھر میاں جی کے پاس جانے کا پروگرام بنا لیا۔

وہ میاں جی کے ہاں پہنچا تو کچھ خواتین ان کے پاس موجود تھیں، وہ ایک طرف کونے میں لگ کر خاموشی سے بیٹھ گیا اور ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگا، جب سبھی خواتین وہاں سے رخصت ہو گئیں تو کرم دین اپنی جگہ سے اٹھ کر میاں جی کے سامنے جا بیٹھا۔

''کیا بات ہے کرم دین! بہت پریشان دکھائی دے رہے ہو؟''

''پریشانی تو ہے میاں جی! آپ سے تعویز لے کر گیا تھا مگر حالات جوں کے توں ہیں۔''

''میں نے کہا تو تھا شادی کر لو۔'' میاں جی نے انتہائی سنجیدہ لہجے میں بات کی۔

بات کرتے ہوئے میاں جی کے چہرے پر کہیں ہلکی سی بھی مسکراہٹ دکھائی دے جاتی تو وہ یہی سمجھتا کہ وہ مزاق کر رہے ہیں لیکن ان کے چہرے سے سنجیدگی ٹپک رہی تھی۔

''پہلے کچھ حالات تو بہتر ہو جائیں میاں جی پھر شادی بھی کر لوں گا'' کرم دین نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔

''تم شادی کرو۔ حالات بھی ٹھیک ہو جائیں گے''

میاں جی کی بات سن کر کرم دین خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا اور خدا حافظ کہتا ہوا وہاں سے نکل گیا۔

وہ عجیب کشمکش میں مبتلا تھا، ایک طرف پیٹ بھرنے کے لیے روٹی نہیں تھی، دوسری طرف میاں جی بضد تھے کہ شادی کر لو۔ مسجد سے گھر تک کا فاصلہ اسی معاملے کے متعلق سوچتے ہوئے ہی طے ہو گیا تھا۔ گھر پہنچ کر بھی اسے یہی سوچ گھیرے رہی، آخر کار انتہائی سوچ بچار کے بعد کرم دین نے فیصلہ کر لیا کہ میاں جی کے کہنے پر یہ کڑوا گھونٹ بھر کر بھی دیکھ لینا چاہیے۔

شادی کے لیے سب سے پہلے کسی مناسب لڑکی کی تلاش کا مرحلہ تھا، بھائی اور بھابھیاں پہلے ہی ساتھ چھوڑ گئے تھے، گھر میں کوئی دوسرا بڑا بھی نہیں تھا جو اس معاملے میں کہیں بات چلاتا، اس لیے دوستوں اور ملنے ملانے والوں سے مشورے کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ اس معاملے میں رشتے کروانے والی کسی خاتون کی خدمات حاصل کی جائیں۔

جیسے ہی شادی کے لیے بات چیت شروع ہوئی، کرم دین کو فکر لگ گئی، گو کہ شادی کی تقریب انتہائی سادگی سے ہونا تھی، پھر بھی شادی کے انتظامات کے لیے کچھ نہ کچھ رقم تو پاس ہونی چاہیے تھی، اسے جہاں جیسی ملازمت ملی اس نے کر لی، تاکہ گھر میں بے کار بیٹھے رہنے سے بہتر ہے کہ کچھ نہ کچھ آمدن گھر آئے۔

☆☆☆☆☆

ایک عرصے سے گھر کی صفائی نہ ہونے کی وجہ سے گھر کی بہت بری حالت ہو گئی تھی، رات کا وقت تھا اور اگلے روز چھٹی بھی تھی، کرم دین کو مکمل یقین تھا کہ اب وہاں کسی دوست یا ملنے ملانے والے کے آنے کا بھی کوئی چانس نہیں، اس نے دروازے کی کنڈی لگا دی اور جھاڑو لے کر گھر کی صفائی کرنے لگا، صفائی کے بعد اس نے ایک کپڑا لیا اور مختلف چیزوں پر پڑی ہوئی مٹی صاف کی، پھر اس نے ادھر ادھر بکھری ہوئی اشیاء اٹھا کر اپنی اپنی جگہ رکھ دیں، اس کام سے فارغ ہونے میں اسے کافی وقت لگ گیا تھا لیکن گھر صاف ستھرا دکھائی دینے لگا تھا، کم از کم اب گھر اس قابل ضرور ہو گیا تھا کہ اگر کوئی اچانک بھی وہاں آ جاتا تو اسے کسی شرمندگی کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔

رات کو دیر تک کام میں مصروف رہنے اور چھٹی کا دن ہونے کی وجہ سے وہ دیر تک سویا رہا، وہ ابھی اور بھی سونا چاہتا تھا، مگر دروازے پر ہونے

والی مسلسل دستک نے اسے اٹھنے پر مجبور کر دیا تھا، وہ آنکھیں ملتا ہوا دروازے پر پہنچا تھا، دروازہ کھولا تو وہاں رشتے کروانے والی مہرین باجی کھڑی تھی۔

''خیر تو ہے..... آج اتنی صبح صبح آئی ہو.....؟'' کرم دین نے مہرین باجی کو دروازے پر کھڑے دیکھ کر سوال کیا۔

''آج لڑکی والے تمہیں دیکھنے آرہے ہیں۔ میں نے سوچا آج چھٹی کا دن ہے، تم کہیں باہر نہ نکل جاؤ اس لیے تمہیں صبح صبح ہی بتانے چلی آئی۔'' مہرین باجی نے کرم دین کے پوچھنے پر اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔

''اگر ایسی بات تھی تو تم مجھے کل ہی بتا دیتی۔''

''دراصل رات کو ان کا فون کافی لیٹ آیا اس لیے تمہیں اب بتانے آئی ہوں..... وہ تین چار افراد ہوں گے..... اور میرا خیال ہے وہ بارہ ساڑھے بارہ بجے تک پہنچ جائیں گے..... تم کھانے وغیرہ کا بندوبست کر لینا۔''

''تم بے فکر رہو سب انتظام ہو جائے گا۔''

''ٹھیک ہے پھر میں چلتی ہوں، اب ان کے ساتھ ہی آؤں گی۔'' مہرین باجی نے وہیں دروازے پر کھڑے کھڑے بات کی اور وہاں سے روانہ ہو گئی۔

کرم دین کچھ دیر اور سونا چاہتا تھا، مگر مہمانوں کی آمد کا سن کر اس کی نیند اڑ گئی تھی، اس نے رات کو ہی صفائی کے بعد ادھر ادھر بکھری اور بے ترتیب پڑی ہوئی چیزوں کو اپنے اپنے ٹھکانے رکھ دیا تھا، لیکن گھر میں آنے والے مہمانوں کی وجہ سے اس نے ایک بار پھر گھر کی ہلکی پھلکی صفائی کر دی، پھر منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر دھوبی سے استری کروانے کے لیے شلوار قمیض لی اور باہر نکل گیا۔

مہرین باجی کے جاتے ہی کرم دین نے مہمانوں کے لیے انتظامات کی منصوبہ بندی شروع کر دی تھی، اس نے اپنے ذہن میں یہ بات طے کر لی تھی کہ مہمانوں کے لیے کھانے پینے کی تمام اشیاء بازار سے پکی پکائی ہی لائی جائیں، مگر مہمانوں کی دیکھ بھال کے لیے گھر میں کسی خاتون کا ہونا انتہائی ضروری تھا، اس کام کے لیے بھی کرم دین نے اپنے کسی دوست کی منت سماجت کر کے اس بات کے لیے راضی کر لیا تھا کہ وہ کچھ دیر کے لیے اپنی والدہ کے ساتھ اس کے گھر میں آجائے تاکہ مہمانوں کی اچھی طرح دیکھ بھال کی جا سکے اور اگر فوری طور پر بازار سے کچھ لانا پڑے تو اس کا دوست موجود ہو، وقت کم تھا اس لیے اس نے دھوبی کے پاس ہی کھڑے ہو کر اپنے کپڑے استری کروائے اور جلدی سے گھر لوٹ آیا۔

کچھ ہی دیر بعد وعدے کے مطابق کرم دین کا دوست اپنی والدہ کو لیے اس کے ہاں آ گیا، پھر تینوں نے باہمی مشورے سے مہمانوں کی خاطر تواضع کے لیے پروگرام طے کر لیا۔ مہمانوں کے آنے کا وقت ہو رہا تھا، اس لیے کرم دین نے اپنے دوست کو کچھ رقم دے کر بازار سے ضروری اشیاء لینے کے لیے بھیج دیا اور خود نہانے کے لیے باتھ روم میں گھس گیا۔

تمام انتظامات مکمل تھے، مہمانوں کی آمد کا انتظار تھا، تھوڑی ہی دیر بعد مہمان آ گئے، مہرین باجی سمیت پانچ مہمان آئے تھے، جن میں لڑکی کے والدین کے علاوہ لڑکی کا بڑا بھائی اور چھوٹی بہن شامل تھے۔ کرم دین نے مہمانوں کی آؤ بھگت اور خدمت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اس سے قبل جتنی بار بھی اسے دیکھنے کے لیے لوگ آئے تھے اس نے ان کی خدمت میں کوئی کمی نہیں رہنے دی تھی، ہر بار کرم دین کو اچھی خاصی رقم خرچ کرنا پڑی تھی لیکن اب تک کوئی بھی رشتہ دینے کے لیے تیار نہیں ہوا تھا، اس کا خیال تھا کہ وہ لوگ بھی نہ جانے پہلے آنے والے لوگوں کی طرح کیسے کیسے سوال کریں گے، لیکن اس بار مہرین باجی نے لڑکی والوں کو کرم دین کے متعلق اس قدر سبز باغ دکھائے تھے کہ وہ مکمل طور پر مطمئن ہو کر رخصت ہوئے تھے۔

☆☆☆☆☆

عائشہ نے زیادہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی، مگر وہ انتہائی سمجھدار تھی، وہ دلہن بن کر کرم دین کے ہاں آئی تو کچھ ہی دنوں میں اس کے متعلق اچھی طرح جان گئی تھی۔ عائشہ کا تعلق انتہائی شریف گھرانے سے تھا، اس کی تربیت جس ماحول میں ہوئی تھی، وہ اسے اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ کرم دین کے بارے میں کوئی بھی بات اپنے گھر والوں تک پہنچائے، اس لیے اس نے خاموشی اختیار کر لی تھی اور جیسا وقت گزرے گزارنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

کرم دین کے کردار میں کوئی خرابی نہیں تھی، اس میں سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ وہ کہیں ٹک کر کام نہیں کرتا تھا، جس کی وجہ سے کئی کئی دن

گھر میں بے کار بیٹھا رہتا تھا، وہ کہیں بھی ڈھنگ کا کام نہ کرنے کے باوجود پلک جھپکنے سے پہلے امیر ترین شخص بن جانا چاہتا تھا، اس نے کئی پرائیویٹ اداروں میں ملازمت کی تھی، بہت سی فیکٹریوں میں نوکری کی، کئی پٹرول پمپوں پر کام کیا، آئس کریم کی کمپنی میں سیل مین رہا، غبارے بیچے، سبزی کی دکان کی اور نہ جانے کیا کیا کام کیا تھا، مگر ہر کام چھوڑنے کی ایک ہی وجہ تھی کہ وہ کام اس کے میعار کا نہیں تھا۔

☆☆☆☆☆

شادی کے بعد وہ چار بچوں کا باپ بن گیا تھا مگر اس نے خود کو نہیں بدلا تھا، اب بھی اس کی زندگی کا واحد مقصد دولت حاصل کرنا تھا۔ اس نے ایک معمولی گھرانے میں آنکھ کھولی تھی، جہاں قدم قدم پر محرومیاں اس کے ساتھ تھیں، وہ جیسے جیسے جوان ہوتا گیا مایوسیاں اور محرومیاں بھی اس کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتی گئیں۔ غربت سے چھٹکارا پانے کے لیے اس نے زندگی میں بہت سے پاپڑ بیلے تھے مگر وہ غربت کی لکیر کو پار نہ کر سکا۔

اس روز وہ اسی سلسلے میں سفر پر نکلا تھا، دوران سفر اس کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوگئی، جو عملیات کا ماہر تھا اور ستاروں کی چال سے لے کر قسمت کا حال، محبت میں کامیابی، جادو ٹونے اور بانڈ پر پہلا انعام نکالنے تک ہر طرح کے کام کروانے کے لیے نہ صرف عملیات کرتا تھا بلکہ تعویز دھاگہ بھی کرتا تھا۔

کرم دین اور بابا سائیں ایک ہی سیٹ پر بیٹھے سفر کر رہے تھے، سفر کافی لمبا تھا، کچھ دیر تک وہ دونوں ہی خاموش بیٹھے رہے مگر پھر باتوں کا سلسلہ چل نکلا اور مختلف موضوعات پر کھل کر بات ہونے لگی، یوں سفر کے دوران ہی وہ دونوں ایک دوسرے کے متعلق بہت کچھ جان گئے تھے۔ راستے میں کچھ دیر کے لیے گاڑی رکی تو دوسرے مسافروں کے ساتھ کرم دین اور بابا سائیں بھی نیچے اتر گئے، گاڑی سے اتر کر وہ ریسٹورنٹ میں داخل ہوگئے، جہاں دونوں نے مل کر چائے پی، جس کا بل کرم دین نے ادا کیا، چائے کے دوران بھی دونوں کی گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔

سفر پھر سے شروع ہوا تو بات کرتے کرتے بابا سائیں نے کرم دین کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اس کے ہاتھوں کی لکیروں کا جائزہ لینے لگا، بابا سائیں نے کرم دین کا ہاتھ دیکھ کر ایسے ایسے انکشافات کیے کہ کرم دین حیران رہ گیا اور بابا سائیں کے علم، تجربے اور ذہانت کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا، جیسے جیسے بابا سائیں کرم دین کے ہاتھوں کی لکیریں پڑھتا گیا، بہت سی باتیں کھل کر سامنے آتی گئیں۔

بابا سائیں نے محض ہاتھ دیکھ کر کرم دین کی زندگی کے ایسے بہت سے راز بھی بتا دیے تھے جن کے بارے میں سوائے اس کے کوئی دوسرا نہیں جانتا تھا، سفر جاری رہا اور ان کی باتیں بھی چلتی رہیں، جب سفر ختم ہوا تو بابا سائیں کا وزیٹنگ کارڈ کرم دین کی جیب میں آ چکا تھا اور پھر سے ملاقات کے وعدے بھی ہو چکے تھے۔

☆☆☆☆☆

بابا سائیں سے ملاقات اتفاقیہ تھی مگر اس ملاقات نے کرم دین کی زندگی میں بھونچال برپا کر دیا تھا، اب اٹھتے بیٹھتے کرم دین کی آنکھوں کے سامنے بابا سائیں کی صورت گھومتی رہتی، وہ ان سے ملاقات کے لیے بے قرار رہنے لگا اور جب دل کسی بھی طرح قابو میں نہ رہا تو وہ بابا سائیں سے ملنے کے لیے گھر سے نکل پڑا۔

مختلف بسوں اور ویگنوں میں سفر کرتا ہوا کرم دین آخر کار بابا سائیں کے دفتر کے سامنے جا کھڑا ہوا، وہ باہر کھڑا اس بورڈ کو بغور پڑھنے لگا، جس پر بابا سائیں کے عملیات کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا تھا، اس نے بورڈ پڑھا اور دھڑکتے دل کے ساتھ دفتر میں داخل ہوگیا۔

''بابا سائیں ہیں.....؟'' دفتر میں داخل ہوتے ہی کرم دین نے فرنٹ ڈیسک پر بیٹھے بابا سائیں کے ملازم، اشرف سے دریافت کیا۔

''جی ہیں۔'' اشرف نے چہرے پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے جواب دیا۔

''میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''آپ کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں؟''

''بس ان سے کہیں کرم دین آیا ہے۔''

کرم دین کی بات سن کر اشرف نے انٹر کام اٹھایا اور بابا سائیں کو اس کے آنے کی اطلاع دے دی، پھر بابا سائیں کی طرف سے اجازت ملتے ہی اشرف نے کرم دین کو ان کے کمرے میں بھجوا دیا، وہ کمرے میں داخل ہوا تو اسے دیکھتے ہی بابا سائیں اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑے ہوئے

اور آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا۔

''آؤ کرم دین! یہاں بیٹھو۔'' بابا سائیں نے اپنے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

کرم دین کے بیٹھتے ہی بابا سائیں نے اشرف کو چائے اور ساتھ کچھ کھانے کے لیے لانے کو کہہ دیا تھا، تھوڑی ہی دیر بعد اشرف چائے اور بسکٹ لے آیا۔

''میں جانتا تھا۔ تم ضرور آؤ گے۔'' بابا سائیں نے کرم دین سے بات کی۔

''آپ سے وعدہ جو کیا تھا پھر کیسے نہ آتا۔''

''اپنا وعدہ کسے یاد رہتا ہے کرم دین۔''

''لیکن میں ان میں سے نہیں، جنہیں اپنا کیا ہوا وعدہ یاد نہیں رہتا۔''

''وعدہ نبھانا بھی کسی کسی کو ہی آتا ہے مجھے وہ لوگ بہت اچھے لگتے ہیں جو اپنی کی ہوئی بات کو پورا کرتے ہیں اور یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ تم بھی انہی میں سے ہو۔''

''یہ تو آپ کی ذرہ نوازی ہے بابا سائیں ورنہ مجھے تو آپ سے ملنے آنا ہی تھا''

''مجھے خوشی ہے کہ تم آئے..... ورنہ راستے میں بہت سے مسافر ملتے ہیں اور سفر کے بعد یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ دوران سفر کسی سے ملاقات ہوئی تھی یا نہیں۔''

''ویسے تو آپ سے ملنے آنا ہی تھا، مگر سچ پوچھیں تو مجھے آپ کے پاس میری مجبوریاں کھینچ لائی ہیں۔''

''گھبراتے کیوں ہو کھل کر بات کرو''

''بات کرنے ہی تو آیا ہوں۔''

''مسئلہ کیا ہے کرم دین! تم جو کہنا چاہتے ہو بے دھڑک کہو۔''

''بات یہ ہے بابا سائیں۔ میں غربت کے ایسے دلدل میں پھنسا ہوا ہوں کہ کسی بھی طرح نکل نہیں پا رہا۔''

''میں اس سلسلے میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟''

''دراصل جب آپ سے ملاقات ہوئی تو مجھے ایسا لگا جیسے میری ہر مشکل، ہر الجھن کا حل مل گیا ہو''

''اللہ پہ بھروسہ رکھو، سب ٹھیک ہو جائے گا''

''بابا سائیں! آپ مجھے کوئی ایسا علم بتا دیں، جس کے پڑھنے سے میں ہر وہ چیز حاصل کر سکوں جس کی مجھے خواہش ہے۔''

''نماز پڑھا کرو کرم دین! پھر دیکھنا تمہارے سب کام سیدھے ہو جائیں گے''

''نمازیں پڑھنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا ہے بابا سائیں! میں نے بے نمازیوں کو بہت آگے جاتے دیکھا ہے اور پانچوں وقت کی نماز پڑھنے والوں کو دو وقت کی روٹی کے لیے بھی ترستے ہوئے دیکھا ہے۔ میری ماں بھی بہت نمازیں پڑھا کرتی تھی، لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے زندگی میں اسے کبھی سکھ کا سانس لیتے ہوئے نہیں دیکھا۔''

''تم تو خوامخواہ جزباتی ہو رہے ہو۔ ذرا سوچو تو سہی، خدا بھلا ان کو کیسے بھول سکتا ہے جو اسے یاد رکھتے ہوں۔ میں تمہارے جزبات کو سمجھتا ہوں، لیکن میں تمہارے خیالات سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ اس لیے تم جاؤ اور جیسا میں نے کہا ہے ویسا کرو، خدا بہتری فرمائے گا۔''

کرم دین کچھ کہنا چاہتا تھا مگر خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا اور ایک لمبی سانس چھوڑتے ہوئے بولا ''اچھا بابا سائیں! فی الحال تو میں آپ کے کہنے سے جا رہا ہوں لیکن اگلی بار آیا تو آپ کو میرے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہوگا۔''

''یہ تم سے میرا وعدہ رہا۔ اگلی بار آؤ گے تو میں تمہارے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کروں گا۔''

کرم دین نہ جانے دل میں کیا کیا خواب سجائے بابا سائیں کے پاس گیا تھا لیکن انہوں نے اس کی سوچ کے مطابق جواب نہیں دیا تھا، اس کا خیال تھا کہ بابا سائیں نے اسے ٹال دیا ہے مگر اس کے باوجود اسے مکمل یقین تھا کہ اس کی تمام پریشانیوں کا حل صرف اور صرف بابا سائیں کے پاس ہے۔

☆☆☆☆☆

سر پہ بازو رکھ کر لیٹے ہوئے گھنٹوں سوچتے رہنا کرم دین کی پرانی عادت تھی، جس سے عائشہ بخوبی واقف تھی، وہ جب سے بیاہ کر کرم دین کے گھر آئی تھی، اس نے اسے اسی کیفیت میں دیکھا تھا، وہ جب بھی اسے ایسی حالت میں دیکھتی تو اکثر اسے اس طرح سوچتے رہنے سے منع کرتے ہوئے سمجھاتی کہ اس طرح سوچتے رہنے سے بہتر ہے کہ وہ کوئی ڈھنگ کا کام کرلے، جس سے کچھ حاصل تو ہو، مگر وہ ہمیشہ سنی ان سنی کر دیتا اور اپنی اس عادت کو بدلنے کی ذرا سی بھی کوشش نہ کرتا اور ہر پل خدا سے شکوے گلے اس کی زبان پر رہتے۔

''تمہاری حالت دیکھ کر لگتا ہے، جس بابا سائیں کے پاس تم گئے تھے، وہاں سے کچھ حاصل نہیں ہوا.....'' عائشہ نے کرم دین کو مایوسی کی حالت میں لیٹے ہوئے دیکھ کر کہا۔

''تم دیکھنا تو سہی..... بابا سائیں میری ہر مشکل کو کیسے حل کرتے ہیں، وہ تو میری خوش قسمتی ہے کہ وہ مجھے سفر کے دوران مل گئے اور ان سے کچھ تعلق بن گیا، ورنہ لوگ تو ہزاروں روپے دے کر منت سماجت کے ساتھ ان سے اپنا کام کرواتے ہیں.....'' کرم دین نے بابا سائیں کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

''خدا کا شکر کرنا سیکھو کرم دین! اوپر والے نے ہمیں کیا کچھ نہیں دیا، ہمیں اولاد جیسی نعمت سے نوازا، رہنے کو چھت دی، پیٹ بھر کر دو وقت کی روٹی بھی مل جاتی ہے اور بھلا کیا چاہیے۔''

''تم ہمیشہ غریبوں والی ہی باتیں کرتی رہو گی کھانے پینے اور رہائش کے علاوہ اور بھی بہت سی خواہشات ہوتی ہیں۔''

''مگر وہ خواہشات محنت کرنے سے پوری ہوتی ہیں۔ تمہاری طرح ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنے سے نہیں۔''

''اب جاؤ اپنا کام کرو، میرا دماغ مت چاٹو۔''

''کام کی بات کرو تو کھانے کو دوڑتے ہو..... لیکن..... اتنا یاد رکھنا تمہاری طرح چارپائی پر پڑے رہنے سے کبھی کوئی خوشی، کوئی سکھ حاصل نہیں ہوتا۔'' عائشہ یہ کہتے ہوئے وہاں سے چلی گئی اور کرم دین پھر سے سر پہ بازو رکھے کھلی آنکھوں سے خواب دیکھنے لگا۔

کرم دین نے انٹر تک تعلیم حاصل کی تھی، اس نے زندگی میں کبھی کوئی ڈھنگ کا کام نہیں کیا تھا، مگر اس کے باوجود کسی بھی طرح کسی بھی راستے سے امیر بننے کی خواہش اس کے اندر موجود تھی، جس کے لیے وہ ہر جائز و ناجائز کام کرنے کے لیے تیار تھا۔ ابھی بابا سائیں سے مل کر آئے اسے چند دن ہی گزرے تھے کہ ایک بار پھر ان سے ملنے کی خواہش نے انگڑائی لے لی، بابا سائیں سے ملاقات کا ذہن میں آنا تھا کہ وہ بے چین ہو گیا اور پھر دل ہی دل میں ان سے ملنے کا پروگرام بنا لیا۔

☆☆☆☆☆

اشرف ابھی دفتر کی صفائی کر رہا تھا جب کرم دین ہاتھ میں دیسی گھی کا ڈبہ لیے بابا سائیں سے ملاقات کے لیے جا حاضر ہوا۔

''خیر تو ہے کرم دین..... آج صبح صبح ہی آ گئے؟'' اشرف نے کرم دین کو دیکھ کر سوال کیا۔

''جب دل میں کسی سے ملنے کی لگن ہو تو وقت کی کوئی قید نہیں ہوتی۔''

''لیکن ہمارا دفتر تو اپنے ٹائم پر ہی کھلتا ہے، اور بابا سائیں نے بھی اپنے آنے کا وقت مقرر کر رکھا ہے''

''یہاں تمہارے پاس بیٹھ کر انتظار تو کیا جا سکتا ہے ناں؟'' کرم دین نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بات کی۔

''میرے پاس تو جب تک چاہو بیٹھو..... مگر..... بابا سائیں سے نہیں مل پاؤ گے۔''

''کیوں؟'' کرم دین نے حیران ہو کر سوال کیا۔

''کیونکہ آج بابا سائیں اپنے اسلام آباد والے دفتر میں بیٹھیں گے۔''

''یہ تو میرے ذہن میں ہی نہیں رہا۔ بس بابا سائیں سے ملنے کو دل کیا اور چلا آیا۔'' بات کرتے ہوئے کرم دین اٹھ کھڑا ہوا۔

''کہاں چل دیئے؟'' اسے اٹھتے دیکھ کر اشرف بول پڑا۔

''بابا سائیں نے تو آنا نہیں، پھر یہاں بیٹھے رہنے سے کیا حاصل؟''

''دیکھ لو کرم دین! اگر بابا سائیں نہیں تو میں تو ہوں کچھ دیر کے لیے ہم غریبوں کے پاس بھی بیٹھ جاؤ۔ میں جانتا ہوں بابا سائیں کے ساتھ تمہارے بہت اچھے تعلقات ہیں مگر ہم بھی اتنے برے نہیں۔''

''کیوں شرمندہ کرتے ہو..... کہاں بابا سائیں اور کہاں میں۔''

''میں جھوٹ تو نہیں بول رہا کرم دین! پچھلی بار جب تم آئے تھے تو تمہارے جانے کے بعد بابا سائیں دیر تک تمہاری ہی باتیں کرتے رہے تھے۔''

''یہ تو ان کی مہربانی ہے۔ ورنہ میں کسی قابل کہاں۔''

''اچھا اب کہاں جا رہے ہو؟ جب بابا سائیں سے ملنے آئے ہو تو پھر مل کر ہی جانا۔''

''جب انہوں نے آنا ہی نہیں تو یہاں بیٹھ کر بھی کیا کرنا۔''

''مایوس کیوں ہوتے ہو۔ میں تو تم سے مزاق کر رہا تھا تم سکون سے بیٹھو بابا سائیں آتے ہی ہوں گے۔''

اشرف کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ سن کر کرم دین کو ایک زوردار جھٹکا لگا..... ''واقعی.....؟''

''ہاں.....'' اشرف نے مسکراتے ہوئے کرم دین کو دیکھ کر گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''مگر تم نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔''

''فکر نہ کرو بابا سائیں کے آتے ہی تمہاری جان میں جان آجائے گی۔''

اشرف ابھی بات کر رہا تھا کہ بابا سائیں بھی وہاں پہنچ گئے، بابا سائیں کو دیکھتے ہی کرم دین نے آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ، ہاتھوں میں لے کر اپنی آنکھوں سے لگائے اور پھر انہیں عقیدت سے چوما۔

''آؤ..... اندر آجاؤ.....'' بابا سائیں نے کرم دین کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے کہا اور پھر اشرف کی طرف دیکھتے ہوئے بولے ''ہمارا مہمان آیا ہے بھئی، اس کے لیے کوئی چائے وغیرہ کا بندوبست کرو۔''

''جی بابا سائیں ابھی لاتا ہوں۔'' اشرف نے آہستہ سے جواب دیا۔

وہ دونوں کمرے میں آبیٹھے تھے، بیٹھتے ہی کرم دین نے دیسی گھی والا ڈبہ نکال کر بابا سائیں کے سامنے رکھ دیا۔

''یہ کیا ہے کرم دین؟'' بابا سائیں نے ڈبے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اس میں دیسی گھی ہے بابا سائیں۔''

''اس کا کیا کروں؟''

''یہ آپ کے لیے لایا ہوں۔''

''کیا تم نے بھینسیں رکھی ہوئی ہیں؟''

''میرے پاس بھینسیں تو نہیں ہیں بابا سائیں! بس کہیں سے گھی مل گیا تو آپ کے لیے لے آیا۔''

''مگر میرے لیے کیوں لائے ہو؟ اپنے بچوں کو کھلاؤ۔ یہ سب ان کا حق ہے۔''

''ان کا حق اپنی جگہ بابا سائیں..... مگر آپ ان سے پہلے ہیں..... آپ اسے سوغات سمجھ کر ہی رکھ لیجئے.....''

''آج تو میں یہ رکھ لیتا ہوں..... مگر آئندہ اس طرح کی کوئی دوسری چیز نہ لانا'' بابا سائیں نے دیسی گھی والا ڈبہ اٹھا کر ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

اس دوران کرم دین اپنی سیٹ سے اٹھ کر بابا سائیں کے پاس آکھڑا ہوا تھا، اسے دیکھتے ہی بابا سائیں بول پڑے ''کیا بات ہے کرم دین! تم یہاں کیوں آکھڑے ہوئے؟''

''مجھے کچھ دیر کے لیے اپنے قدموں میں بیٹھا رہنے دیں بابا سائیں.....'' یہ کہتے ہوئے کرم دین بابا سائیں کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

''یہ کیا کر رہے ہو کرم دین.....؟'' بابا سائیں نے اپنے پاؤں پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔

''شائد اسے آپ گستاخی سمجھیں لیکن آج میں ان قدموں سے اس وقت تک نہیں اٹھوں گا، جب تک آپ مجھے کچھ عطا نہیں کر دیتے۔''

''یہ کیا بچوں والی حرکت ہے کرم دین! تم یہاں سے اٹھو اور میرے سامنے بیٹھ کر بات کرو۔'' بابا سائیں نے کرم دین کو کندھوں سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔

بابا سائیں کی بات کرم دین کی عقل میں آگئی تھی، اس لیے وہ خاموشی سے واپس اپنی جگہ پر آبیٹھا اور انتظار کرنے لگا کہ اب بابا سائیں کیا کہتے ہیں۔ وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ بابا سائیں کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی ''کرم دین! میری بات غور سے سنو آج اگر میں کچھ ہوں تو اس

کے پیچھے میری سالوں کی محنت اور ریاضت شامل ہے، اور یہ تم جان ہی گئے ہو گے کہ اگر میرے پاس کچھ ہے تو لوگ میرے پاس آتے ہیں لیکن میری ایک بات یاد رکھنا، میں وہ سب بانٹتا نہیں پھرتا مگر تم نہ جانے کیوں کسی ضدی بچے کی طرح ایک ہی بات کے پیچھے پڑے ہوئے ہو، جبکہ میں تمہیں ایک بار نہیں بار بار کہہ چکا ہوں کہ میرے پاس تمہیں دینے کے لیے کچھ بھی نہیں۔ تم گھر جاؤ، اپنے بیوی بچوں کے لیے محنت کرو اور روزی کماؤ۔"

"میں بہت سی امیدیں لیے آپ کے پاس آیا ہوں بابا سائیں! اس قدر مایوس تو نہ کیجئے۔"

"جانتے ہو جتنی دیر سے تم یہاں میرے پاس بیٹھے ہو، اتنی دیر میں تو میں یہاں آنے والوں سے ہزاروں روپے نکلوا لیتا ہوں۔"

"آپ پیسوں کی فکر نہ کریں۔ ایک بار حکم تو کریں، میں پیسے دینے کو بھی تیار ہوں۔"

"کرم دین کچھ تم سے تعلق ایسا بن گیا ہے کہ میں تم سے پیسے بھی نہیں لے سکتا۔"

"پھر کچھ نظر کرم فرما دیجئے۔"

کرم دین کی بات سن کر بابا سائیں نے ایک لمبی سانس لی اور بولے "اچھا آج تو میں تمہاری ضد مان کر کچھ کرتا ہوں لیکن آئندہ اس معاملے میں مجھے کبھی تنگ مت کرنا....."

"جی بابا سائیں ایسا ہی ہوگا....." کرم دین نے کسی اچھے بچے کی طرح گردن جھکا کر کہا۔

بابا سائیں نے میز کا دراز کھولا اور ایک سفید کاغذ نکال کر اس پر کچھ لکھنے لگے، کرم دین کی نظریں مسلسل اسی کاغذ پر لگی ہوئی تھیں جس پر بابا سائیں کچھ تحریر کر رہے تھے، بابا سائیں نے کاغذ پر کچھ کلمات لکھے اور وہ کاغذ کرم دین کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے "اس پر کچھ کلمات لکھے ہیں اگر کوئی بھینس یا گائے دودھ نہ دیتی ہو یا کم دیتی ہو، یہ گیارہ بار پڑھ کر کسی بھی چیز پر پھونک مار کر اس بھینس یا گائے کو کھلاؤ گے تو جو دودھ نہیں دیتی ہو گی وہ دودھ دینے لگے گی اور جو دودھ کم دیتی ہو گی وہ پہلے سے کہیں زیادہ دودھ دینے لگے گی۔ بس لوگ خوش ہو کر کچھ نہ کچھ دے جایا کریں گے، اسی کو بہت سمجھنا اور زیادہ لالچ نہ کرنا۔"

☆☆☆☆☆

کرم دین کو کسی نے کبھی نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، اس لیے وہ جس کسی سے بھی دم کرنے کی بات کرتا، وہ ہنس دیتا، اور تو اور عائشہ بھی یہ بات سن کر اپنی ہنسی پر قابو نہ پا سکی تھی، کیونکہ ان سب کی نظر میں کوئی نمازی، پرہیز گار یا مولوی تو اس طرح کے کام کرتا اچھا بھی لگتا ہے مگر کرم دین جیسا بے دین اور بے نمازی کیا کسی چیز کا دم کرتا۔

بستی میں اس طرح کی بھینسیں تو کئی گھروں میں تھیں جو دودھ کم دیتی تھیں، جس کی وجہ سے وہ لوگ پریشان بھی تھے، وہ ڈاکٹر سے دوائی لانے کے علاوہ کئی دیسی ٹوٹکے بھی آزماتے اور میاں جی سے پیڑے پر دم کروا کر بھی بھینس کو کھلاتے تھے۔ بستی کے لوگ کسی بھی طرح اس بات کے لیے تیار نہ تھے کہ وہ کرم دین سے اپنی بھینس یا گائے کے لیے کسی چیز پر دم کروائیں، کرم دین نے اس مشکل میں مبتلا کئی لوگوں سے بات کی مگر انہوں نے کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر اسے ٹال دیا تھا۔

کرم دین اپنے گھر کے باہر کھڑا تھا کہ اس نے اللہ داد کے بیٹے مبارک کو پلیٹ میں آٹے کا پیڑہ لیے وہاں سے گزرتے ہوئے دیکھا، پہلے تو وہ اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا پھر اچانک کچھ سوچ کر اسے آواز دی۔ "کہاں جا رہے ہو مبارک؟"

"میاں جی سے آٹے کا پیڑہ دم کروانے جا رہا ہوں۔"

"بھینس کو کھلانا ہے؟" کرم دین نے جانتے بوجھتے ہوئے بھی دریافت کیا۔

"ہاں! وہ دودھ بہت کم دیتی ہے ناں..... میاں جی سے دم کروا کر یہ آٹے کا پیڑہ کھلائیں گے تو وہ دودھ زیادہ دینے لگے گی۔"

"یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں....."

"تم اور دم؟" مبارک نے ہنستے ہوئے سوال کیا، پھر خود ہی بولا "نہ بھئی نہ..... میں تو میاں جی کے پاس ہی جاؤں گا۔"

"تمہاری مرضی ہے بھئی۔"

مبارک نے کرم دین کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور مسجد کی طرف چل پڑا، کرم دین خاموشی سے اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا اور اندر ہی اندر یہ سوچ کر کڑھتا رہا "میاں جی کے پاس ایسا کیا ہے جو لوگ انہی کے پاس جاتے ہیں، جب میں بھی یہ دم کرنا جانتا ہوں تو لوگ مجھ سے دم کیوں نہیں

کرواتے''۔

کرم دین وہیں کھڑا کچھ سوچ رہا تھا، مبارک کو گئے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ وہ واپس آتا دکھائی دیا، قریب آتے ہی کرم دین نے اسے پھر روک لیا اور بولا ''ہاں بھئی دم کروالائے؟''

''میاں جی ملے ہی نہیں.....''

''تو لاؤ پھر آج مجھ سے ہی پھونک مروالو.....''

کرم دین کی بات سن کر مبارک کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر پلیٹ کرم دین کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا ''چلو آج تم بھی اپنا شوق پورا کر لو..... ویسے بھی میاں جی کہیں گئے ہوئے ہیں، شائد ایک دو دن بعد ہی لوٹیں۔''

کچھ دیر پہلے تک کرم دین انتہائی پر اعتماد تھا مگر جیسے ہی مبارک نے آٹے کے پیڑے والی پلیٹ اس کے ہاتھوں میں پکڑائی، اس پر عجیب سا خوف طاری ہو گیا، اسے اپنے ہاتھوں میں ہلکی ہلکی سی لرزش محسوس ہونے لگی اور دل کسی انجانے ڈر سے تیز تیز دھڑکنے لگا، کیونکہ اس کے لیے یہ آزمائش کی گھڑی تھی، آج بہت صبر اور انتظار کے بعد اسے ایک موقعہ میسر آ گیا تھا، یہی وہ لمحے تھے جن سے اس کے آنے والے دنوں کا تعین ہونا تھا، کامیابی کی صورت میں اس کے لیے بہت سے دروازے کھل جانے تھے جبکہ ناکامی کی صورت میں اس پر سبھی راستے بند ہو سکتے تھے۔

کرم دین نے ایک دو لمبی لمبی سانسیں لیں اور پھر خود کو کنٹرول کرتے ہوئے مکمل یقین کے ساتھ بابا سائیں کے بتائے ہوئے کلمات پڑھ کر آٹے کے پیڑے پر پھونکنے لگا، وہ آنکھیں بند کیے آیات پڑھ کر پیڑے پر دم کرتا رہا اور مبارک بغور اس کا جائزہ لیتا رہا، وہ دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا کہ اس نے تو جان بوجھ کر محض کرم دین کا مزاق اڑانے کے لیے آٹے کے پیڑے والی پلیٹ اس کے حوالے کی تھی مگر وہ کچھ پڑھ کر پیڑے پر اس طرح پھونکیں مار رہا تھا جیسے اسی کے دم سے بھینس نے دودھ دینے لگ جانا ہے، کرم دین نے تسلی سے بابا سائیں کے بتائے ہوئے کلمات پڑھ کر پیڑے پر پھونکے اور پلیٹ مبارک کے حوالے کر دی۔

مبارک کی مرضی نہ تھی کہ وہ کرم دین سے بھینس کے لیے پیڑہ دم کروائے مگر اس نے کرم دین کا مزاق اڑانے کے لیے ایسا کیا تھا اور وہ اپنے ارادے میں کامیاب بھی ہوا تھا، اسی لیے گھر پہنچنے تک اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رقص کرتی رہی، گھر پہنچ کر مبارک نے آٹے والی پلیٹ اپنی ماں کے حوالے کی اور خود دوسرے کاموں میں لگ گیا۔

مبارک کو علم تھا کہ ابھی میاں جی ایک دو روز تک نہیں آئیں گے، مگر اس نے گھر میں کسی کو بھی یہ بات نہ بتائی اور نہ ہی کرم دین سے پیڑہ دم کروا کر لانے کا ذکر کیا، دم کیا ہوا آٹے کا پیڑہ بھینس کو کھلا دیا گیا تھا، لیکن بھینس نے حسب معمول دودھ تھوڑا ہی دیا تھا، اگلے روز مبارک نے اپنی ماں سے کہہ کر بھینس کو کھلانے کے لیے آٹے کا پیڑہ تیار کروایا اور یہ کہہ کر گھر سے نکل پڑا کہ وہ میاں جی سے دم کروا لائے۔

کرم دین نے پہلی بار بابا سائیں کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق کلمات پڑھ کر پیڑے پر پھونکیں ماری تھیں اور رات بھر یہ جاننے کے لیے بے چین رہا کہ اس کے دم نے کیا اثر کیا۔

آٹے کے پیڑے والی پلیٹ ہاتھوں میں لیے مبارک گھر سے نکل پڑا، کرم دین اپنے گھر کے سامنے ہی کھڑا تھا، اسے دیکھتے ہی اپنے پروگرام کے مطابق مبارک اس کی طرف بڑھنے لگا، مبارک کو ہاتھوں میں آٹے کے پیڑے والی پلیٹ لیے اپنی طرف آتا دیکھ کر کرم دین کے دل میں ہونے والی ہلکی ہلکی سی دھک دھک ڈھول کی طرح تیز تیز بجنے لگی تھی، وہ سوچنے لگا کہ ابھی کل تو وہ بلانے کے باوجود بھی نہیں آ رہا تھا مگر آج وہ خود ہی اس کی طرف چلا آ رہا تھا۔

''کیوں بھئی مبارک! کیسا رہا میرا دم؟'' مبارک کے قریب آتے ہی دھڑکتے دل کے ساتھ کرم دین نے دریافت کیا۔

''تمہارے دم نے تو کمال کر دیا'' مبارک نے کرم دین کی جھوٹی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

مبارک کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ نے کرم دین کا حوصلہ بڑھا دیا، اس لیے وہ خوش ہو کر بولا ''دیکھ لو تم تو مان ہی نہیں رہے تھے..... یہ تو میں نے ہی زبردستی پیڑے پر دم کر دیا، ورنہ تم تو واپس جا رہے تھے۔''

''میں غلطی پر تھا لیکن تمہارے دم میں تو واقعی بہت اثر ہے، اسی لیے تو ابا نے آج پھر تمہارے پاس بھیجا ہے۔''

''آج میں پھر تمہیں پیڑہ دم کر کے دیتا ہوں اگر پیڑے نے اپنا کام نہ کر دکھایا تو پھر کہنا۔'' کرم دین نے بات کی اور مبارک سے پلیٹ لے کر پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ کلمات پڑھ کر پیڑے پر پھونکنے لگا۔

کرم دین سے دم کروا کر مبارک نے گھر کی راہ لی اور گھر پہنچتے ہی پلیٹ اپنی ماں کے ہاتھوں میں تھما کر، یہ بتائے بغیر کہ وہ میاں جی سے دم کروالایا ہے یا نہیں، ادھر ادھر ہو گیا۔

مبارک کی ماں نے پیڑہ اٹھایا اور بھینس کو کھلا دیا۔ شام ہوئی تو اللہ داد نے بالٹی میں صاف پانی لے کر بھینس کے تھن اچھی طرح سے دھوئے اور پھر تھن دھونے کے بعد جو پانی بچ گیا تھا اسے گرا کر خدا کو یاد کرتے ہوئے بسم اللہ پڑھ کر دودھ نکالنے لگا، جیسے جیسے دودھ سے بالٹی بھرتی جاتی تھی، اللہ داد کی خوشی بڑھتی جاتی تھی، ایک عرصے کے بعد بھینس کے تھنوں سے اتنا دودھ نکل رہا تھا، اس کا خیال تھا کہ دودھ کے لیے بالٹی کافی ہو گی، مگر حیرانگی کی بات تھی کہ جس تیزی سے دودھ سے بالٹی بھر رہی تھی وہ بالٹی چھوٹی پڑ رہی تھی۔

''دودھ کے لیے کوئی برتن لے کر آنا.....'' اللہ داد نے اونچی آواز میں کہا۔

''ابھی تو بالٹی لے کر گئے ہو.....'' اللہ داد کی بیوی فاطمہ نے وہیں سے آواز لگائی۔

''وہ بالٹی میرے پاس ہے۔ تم جلدی سے کوئی دوسرا برتن لے کر آؤ۔''

خاوند کی بات سن کر فاطمہ نے کچن سے بالٹی اٹھائی اور فوراً اس کے پاس پہنچ گئی، اللہ داد نے دودھ سے بھری بالٹی اسے تھما دی اور اس سے دوسری بالٹی لے کر دودھ نکالنے لگا۔

''یہ..... یہ سارا اسی بھینس کا دودھ ہے.....؟'' دودھ سے بھری بالٹی دیکھ کر فاطمہ نے سوال کیا۔

''تو اور کیا..... یہ دودھ میں کہیں اور سے لایا ہوں.....؟''

''لگتا ہے میاں جی کا دم اثر کر گیا..... ورنہ ہم نے اس کے علاج کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔''

باتوں کے دوران ہی اللہ داد نے دودھ دھونے کا کام مکمل کر لیا تھا، پہلی بھری ہوئی بالٹی کے بعد آدھی بالٹی دودھ اور نکل آیا تھا، اللہ داد نے اٹھتے ہوئے خوش ہو کر بھینس کے جسم پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور دو تین تھپکیاں بھی دیں، وہ دونوں ہی بہت خوش تھے، دونوں کے ہاتھوں میں دودھ کی بالٹیاں پکڑی ہوئی تھیں اور باتیں کرتے ہوئے باورچی خانے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

''یہ والا دودھ میاں جی کو بھجوا دینا.....'' اللہ داد نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی دودھ کی بالٹی کو چولہے کے پاس رکھتے ہوئے کہا۔

''مبارک آتا ہے تو میں بھجوا دوں گی.....''

فاطمہ نے پتیلی میں دودھ ڈال کر گرم کرنے کے لیے چولہے پر رکھ دیا تھا، اس نے بہت دنوں کے بعد اتنا دودھ دیکھا تھا، اس لیے بار بار ماشاءاللہ، ماشاءاللہ کہتے ہوئے خوش ہو رہی تھی۔

''کیا بات ہے امی!..... آج بہت خوش نظر آ رہی ہو؟'' مبارک نے ماں کو خوش دیکھ کر سوال کیا۔

''ادھر دیکھو.....'' دودھ والی پتیلی کا ڈھکن اٹھا کر دودھ دکھاتے ہوئے فاطمہ نے کہا۔

''اتنا دودھ؟'' مبارک نے حیران ہو کر دریافت کیا۔

''یہی نہیں یہ بھی ہے.....'' فاطمہ نے دودھ والی بالٹی سے کپڑا اٹھاتے ہوئے کہا۔

''مگر اتنا دودھ کہاں سے آیا؟'' مبارک کی حیرانی ابھی تک برقرار تھی۔

''بس اللہ نے کرم کر دیا اور تم خود ہی تو میاں جی سے آٹے کا پیڑہ دم کروا کر لائے تھے۔''

ماں کی بات سن کر مبارک کے چہرے کی رنگت بدل گئی اور بولا ''مگر میاں جی تو کل ملے تھے نہ آج..... وہ تو ایک دو دن کے لیے کسی دوسرے شہر گئے ہوئے ہیں۔''

''تو پھر دم کس سے کروا کر لائے تھے؟''

''کرم دین سے۔''

''کرم دین سے دم کروا کر لائے تھے؟'' فاطمہ نے حیران ہو کر دریافت کیا اور پھر ساتھ ہی پوچھنے لگی ''وہ کب سے دم کرنے لگا؟''

''یہ تو پتہ نہیں امی لیکن کل جب میں میاں جی کے نہ ملنے کی وجہ سے واپس آ رہا تھا تو کرم دین اپنے گھر کے باہر کھڑا تھا، اس نے مجھے بلا لیا اور پیڑے پر دم کر دیا، لیکن آج میں اسے محض بیوقوف بنانے کے لیے خود آٹے کا پیڑہ لے کر اس کے پاس گیا تھا۔''

فاطمہ غور سے مبارک کی بات سنتی رہی اور پھر بولی ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ بھینس کے لیے آٹے پر میاں جی نے نہیں کرم دین نے دم کیا

تھا۔''

''ہاں امی! میں سچ کہہ رہا ہوں''

مبارک کی بات سن کر فاطمہ کچھ دیر تک سوچتی رہی پھر بولی ''یہ بالٹی میں دودھ میاں جی کے لیے رکھا تھا تم ایسا کرو یہ کرم دین کو دے آؤ۔''

فاطمہ کی بات کے دوران اللہ داد بھی وہاں آ گیا تھا، مگر اس نے پوری بات نہیں سنی تھی۔

''یہ کرم دین کو دودھ کس لیے بھجوانا ہے؟'' اللہ داد نے حیران ہو کر پوچھا۔

''تمہیں پتہ ہے، یہ جو بھینس نے اتنا دودھ دیا ہے ناں۔ یہ کرم دین کے دم کی وجہ سے ہوا ہے۔'' فاطمہ نے تمام تر تفصیل اللہ داد کے سامنے بیان کر دی۔

کرم دین کے متعلق باتیں سن کر اللہ داد حیران تھا، مگر اس نے بھی جلدی سے بیوی کی بات کی تائید کر دی اور بولا ''اگر ایسا ہے تو پھر اس دودھ پر اسی کا حق بنتا ہے۔''

اپنے والدین کی بات سن کر مبارک نے دودھ والی بالٹی اٹھائی اور اسے کپڑے سے ڈھک کر کرم دین کے گھر کی طرف چل پڑا۔ وہ دو بار محض کرم دین کا مزاق اڑانے اور اس کو بیوقوف بنانے کی خاطر گیا تھا، مگر اب دودھ کی بالٹی ہاتھوں میں تھامے کرم دین کے متعلق سوچتا ہوا جا رہا تھا، مبارک نے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹائی تو کچھ ہی دیر بعد کرم دین نے ہی دروازہ کھولا۔

''کیا بات ہے مبارک..... کہیں پھر پیڑہ دم کروانے تو نہیں آئے؟'' مبارک پر نظر پڑتے ہی کرم دین نے سوال کیا۔

''تمہارے لیے دودھ لایا ہوں۔'' مبارک نے دودھ والی بالٹی آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اس کا مطلب ہے تمہاری بھینس نے خوب دودھ دیا ہے۔'' کرم دین نے مبارک سے دودھ کی بالٹی پکڑتے ہوئے بات کی۔

''ہاں! اتنا دودھ دیا ہے کہ امی اور ابا کو تو اس بات کا یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب تمہارے دم کی وجہ سے ہوا ہے''

''ویسے مان تو تم بھی نہیں رہے تھے۔''

''کل کی بات اور تھی مگر آج تو میں خود آیا تھا ناں۔''

کرم دین اور بھی بہت سی باتیں کرنا چاہ رہا تھا، لیکن ساتھ ہی اسے اس بات کی بھی بے چینی لگی ہوئی تھی کہ وہ عائشہ کو بھی جلدی سے بتا دے کہ وہ تو مانتی نہیں تھی، مگر اب اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ محض اس کے دم کی وجہ سے بھینس کے دودھ میں کس قدر اضافہ ہوا ہے۔

''اچھا تم ایک منٹ ٹھہرو۔ میں دودھ اندر دے آؤں اور تمہیں بالٹی بھی لا دوں۔'' کرم دین نے اندر جاتے ہوئے مبارک کو کہا۔

''ٹھیک ہے میں یہیں کھڑا ہوں۔'' مبارک نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

کرم دین نے جلدی سے دروازہ کھولا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اندر داخل ہو گیا..... ''یہ لو دودھ.....'' کرم دین نے عائشہ کے سامنے دودھ کی بالٹی لہراتے ہوئے کہا۔

''یہ کہاں سے آیا ہے؟'' عائشہ نے حیران کن لہجے میں دریافت کیا۔

''یہ اللہ داد کا بیٹا مبارک لایا ہے۔''

''مگر کس لیے؟''

''تم تو نہیں مانتی تھی ناں..... مگر دیکھ لو یہ صرف میرے دم کی وجہ سے ہوا ہے کہ ان کی بھینس نے زیادہ دودھ دیا''

''یہ نہ کہو کہ تمہارے دم کی وجہ سے کیونکہ یہ اللہ کے کلام کی برکت سے ہوا ہے۔'' عائشہ نے کرم دین کو سمجھایا۔

''اچھا اچھا..... اپنی باتیں اپنے پاس رکھو اور دودھ کسی پتیلی میں ڈال کر بالٹی واپس دو..... مبارک باہر ہی کھڑا ہے''

عائشہ نے خاموشی سے بالٹی پکڑی اور دودھ پتیلی میں ڈال کر بالٹی اچھی طرح دھو کر کرم دین کو پکڑا دی۔

''یہ لو بالٹی، اور دیکھو اگر پھر کبھی ایسا کوئی مسئلہ ہو تو آ جانا۔ اب میاں جی کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔'' باہر آتے ہی کرم دین نے مبارک کو بالٹی پکڑاتے ہوئے کہا۔

''اب تم جو ہو میاں جی کے پاس کیا لینے جانا ہے۔'' مبارک نے ہنستے ہوئے جواب دیا اور خدا حافظ کہتا ہوا وہاں سے چل دیا۔

کرم دین اپنی پہلی کامیابی پر اس بچے کی طرح خوش تھا جو پہلی بار چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا چلنا شروع کرتا ہے، اس کا دل چاہ رہا تھا کہ

بستی کی ساری ہی بھینسیں دودھ دینا چھوڑ دیں اور لوگ دوڑتے ہوئے اس کے پاس آئیں، وہ دم کر کے آٹے کے پیڑے انہیں دے جس کی وجہ سے ان کی بھینسیں زیادہ دودھ دینے لگیں اور یوں ہر طرف اس کی شہرت کا ڈنکا بجنے لگے۔

☆☆☆☆☆

کرم دین کا خیال تھا کہ اب دیکھتے ہی دیکھتے گھر گھر اس کے چرچے ہونے لگیں گے، مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا، اللہ داد اور مبارک کی وجہ سے کچھ لوگوں کے کانوں میں اس بات کی بھنک ضرور پڑ گئی تھی کہ کرم دین بھی بھینس یا گائے کے لیے پیڑے پر دم کر کے دینے لگا ہے، لیکن کسی نے اتنا زیادہ نوٹس نہیں لیا تھا۔

اب بھی اگر کسی کو اس قسم کا کوئی مسئلہ محسوس ہوتا، وہ سیدھا میاں جی کے پاس ہی جاتا تھا، کبھی کبھی کسی سے سن سنا کر یا میاں جی کی غیر موجودگی میں کوئی ایک آدھ بندہ کرم دین کے پاس بھی چلا آتا، مگر اس کے عوض اگر کسی کی بھینس پہلے سے زیادہ دودھ دینے لگتی تو محض چند گڑ ویاں دودھ دے جاتا ورنہ کئی بار وہ بھی نہیں ہوتا تھا، جو تھوڑی بہت آمدن ہونے لگی تھی وہ انتظامیہ کے حکم پر بھینسوں کو شہری حدود سے باہر نکالنے کی وجہ سے کم ہوتے ہوتے ختم ہو کر رہ گئی تھی۔

کرم دین نے جو بڑے بڑے خواب دیکھے تھے وہ چکنا چور ہونے لگے تھے اور وہ پھر سے مایوسی کی طرف بڑھنے لگا، وہ ان لوگوں میں سے تھا جو راتوں رات امارت کی سبھی سیڑھیاں پھلانگ کر دولت مند بننا چاہتے ہیں، اس کے لیے وہ نہ تو محنت کرتے ہیں نہ ہی انتظار اور صبر۔ کرم دین بھی آنکھ جھپکنے سے پہلے اپنے سامنے دولت کے انبار لگے دیکھنا چاہتا تھا، اس لیے اس نے ایک بار پھر بابا سائیں کے پاس جانے کا پروگرام بنا لیا۔

☆☆☆☆☆

بابا سائیں کی طرف سے اخبار میں دیا جانے والا پرائز بانڈ پر پہلا انعام پانے کا اشتہار پڑھ کر بہت سے لوگ بابا سائیں کے پاس آ پہنچتے تھے، اشتہار پڑھ کر فرحان کے دل میں بھی پرائز بانڈ پر پہلا انعام حاصل کرنے کی خواہش نے انگڑائی لی تھی اور وہ پچاس ہزار روپے لے کر بابا سائیں کے دفتر پہنچا تھا، اس سے پہلے بھی کچھ لوگ بابا سائیں کے پاس آئے بیٹھے تھے، اس لیے اشرف نے اسے کچھ دیر انتظار کرنے کو کہا تھا، اشرف کے کہنے پر وہ بھی اپنی باری کے انتظار میں صوفے پر بیٹھ گیا۔

فرحان کے بیٹھتے ہی اشرف، بابا سائیں کے متعلق باتیں کرنے لگا اور ان کی کرامات کا ذکر کرتے ہوئے ایسے ایسے واقعات سنانے لگا، جب محض ان کی وجہ سے لوگوں کا پہلا انعام نکلا تھا اور پھر کس طرح لوگوں نے خوش ہو کر بابا سائیں کی خدمت کی تھی، اشرف باتیں سناتا رہا اور فرحان شوق اور دلچسپی سے سنتا رہا۔ کچھ دیر بعد جو لوگ بابا سائیں کے پاس بیٹھے تھے، وہ کمرے سے نکل آئے، ان کے جانے کے بعد اشرف بابا سائیں کے کمرے میں گیا اور اس کے آنے کی اطلاع دے کر واپس اپنی جگہ پر آ بیٹھا اور اسے بابا سائیں کے پاس جانے کی اجازت دے دی۔

وہ کمرے میں داخل ہوا تو بابا سائیں نے چہرے پر مسکراہٹ سجائے اس کا استقبال کیا اور پھر اس کے بیٹھنے پر پیار سے بولے..... ''جی فرمایئے۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''میں پرائز بانڈ کے سلسلے میں آیا ہوں۔'' فرحان نے بات کی۔

''لائیں پرائز بانڈ دیں۔''

''ابھی میں پرائز بانڈ تو نہیں لایا۔''

''کوئی بات نہیں آپ کیش دے دیں میں ابھی منگوا دیتا ہوں اگر آپ خود بانڈ خرید کر لانا چاہیں تو پھر بھی ٹھیک ہے۔''

''پہلا انعام تو نکلے گا ناں؟'' فرحان نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

فرحان کی بات سن کر بابا سائیں مکمل اعتماد سے بولے ''میں پہلا انعام نکلنے کی گارنٹی دیتا ہوں، اسی لیے لوگ میرے پاس آتے ہیں۔ میں دوسرے لوگوں کی طرح یہ بھی نہیں کہتا کہ اس نمبر کا بانڈ خرید لو پھر انعام نکلے گا، اور نہ ہی اس کام کے لیے میں کوئی اضافی رقم ہی وصول کرتا ہوں۔''

''اگر آپ کی اجازت ہو تو میں بانڈ خرید لاؤں؟'' بابا سائیں کی بات سن کر فرحان نے اجازت طلب کی۔

بابا سائیں نے اس کی اس بات پر کوئی اعتراض نہ کیا، کیونکہ وہ ایسا کرنے کے لیے خود بھی کہہ چکے تھے۔

فرحان کو پرائز بانڈ خرید کر لانے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی، پرائز بانڈ کی خریداری کے دوران ہی اس نے اپنے طور پر تمام تر منصوبہ بندی کر لی تھی، جب وہ بابا سائیں کے کمرے میں داخل ہوا تو انعامی بانڈ اس کے ہاتھ میں تھے۔

''ہاں بھئی لے آئے بانڈ.....'' بابا سائیں نے اس کے آنے پر دریافت کیا۔

''جی لے آیا ہوں.....لیکن کیا یہ ممکن ہے۔آپ نے جو عمل کرنا ہے.....وہ.....وہ ان کی فوٹو کاپیوں پر کر دیں.....'' فرحان نے رک رک کر بات کی۔

فرحان کی بات سن کر بابا سائیں کسی سوچ میں پڑ گئے، پھر اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولے.....''لائیں بانڈ مجھے دیں، میں ان کی فوٹو کاپیاں کروا دوں۔''

فرحان کے کہنے پر بابا سائیں بانڈز کی فوٹو کاپیوں پر عملیات کرنے کے لیے با آسانی تیار ہو گئے تھے اور اس سے بانڈ مانگ رہے تھے تا کہ وہ اشرف کو بھجوا کر ان کی فوٹو کاپیاں کروالیں۔فرحان اس بات پر بھی ڈر رہا تھا کہ کہیں وہ فوٹو کاپیاں کروانے کے دوران ہی کوئی گڑبڑ نہ کر دیں، اس لیے ڈرتے ہوئے بولا''اگر آپ برا نہ منائیں.....تو.....بانڈز کی کاپیاں.....میں خود کروا لاؤں.....''

''لگتا ہے آپ کے ذہن میں کہیں نہ کہیں کوئی شک ضرور ہے۔''

''نہیں نہیں.....ایسی کوئی بات نہیں.....'' فرحان نے جلدی سے صفائی پیش کی۔

''دیکھو برخوردار! آپ کے دل میں ذرا سا بھی کہیں کوئی ڈر یا خوف ہے تو اسی طرح کریں جس طرح آپ کی تسلی ہو اگر آپ بانڈز کی کاپیاں خود کروا کر لانا چاہتے ہیں تو خود کروا لائیں، تا کہ جب آپ یہاں سے جائیں تو پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ مطمئن ہو کر جائیں.....'' بابا سائیں اس قدر اعتماد کے ساتھ بات کر رہے تھے کہ ان کی ہر بات سے سچائی جھلک رہی تھی، اس کے باوجود فرحان بانڈز کی کاپیاں خود کروا کر لانا چاہتا تھا، اس لیے بابا سائیں کی بات سنتے ہی فوراً بولا''خدا گواہ ہے بابا سائیں.....میرے دل میں ایسی کوئی بات نہیں۔''

''ٹھیک ہے آپ کاپیاں کروا لائیں۔میں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔''

اجازت ملتے ہی فرحان اٹھا اور بانڈز کی کاپیاں کروا کر بابا سائیں کے حوالے کر دیں، بانڈز کی کاپیاں لے کر بابا سائیں نے اچھی طرح ان پر دھاگہ لپیٹا اور دراز میں رکھ دیں، پھر فرحان سے بانڈ بھی لے لیے اور ان پر بھی اچھی طرح دھاگہ لپیٹنے کے بعد انہیں لفافے میں ڈال کر اپنے سامنے میز پر رکھتے ہوئے بولے''میں نے فوٹو کاپیاں اپنے پاس رکھ لی ہیں۔آج سے پہلے میں نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ فوٹو کاپیوں پر عملیات کیے ہوں لیکن محض آپ کے اطمینان کے لیے ایسا کر رہا ہوں۔'' باتوں کے دوران ہی بابا سائیں نے میز کی دراز میں سے جائے نماز نکال لی تھی اور فرحان کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے.....''یہ نیچے بچھا لیں اور سچے دل کے ساتھ پہلے انعام کے لیے ہاتھ اٹھا کر دعا کریں۔''

فرحان نے بابا سائیں کے کہنے کے مطابق جائے نماز بچھایا اور اس پر بیٹھ کر دعا کی، دعا کے بعد پرائز بانڈ والا لفافہ فرحان کے حوالے کر دیا گیا، ساتھ ہی اسے ایک کاغذ بھی تھما دیا گیا، جس پر تمام ضروری ہدایات درج تھیں، جن کے مطابق پرائز بانڈ والا لفافہ قرعہ اندازی والے دن ہی کھولنا تھا اور انعام نکلنے پر انعام کا دسواں حصہ بابا سائیں کو ادا کرنا تھا، فرحان نے وہیں کھڑے کھڑے سرسری سی نظر اس ہدایت نامے پر ڈالی اور اسے احتیاط سے جیب میں ڈال کر بابا سائیں سے اجازت لیتے ہوئے وہاں سے نکل گیا۔

☆☆☆☆☆

فرحان نے بابا سائیں سے دم کروا کر پرائز بانڈ الماری میں لا کر رکھ دیے تھے، مگر وہ مطمئن نہیں تھا، وہ دن بھر بے چین رہا اور اس کے دل میں طرح طرح کے خیالات جگہ پاتے رہے، اس نے اپنے گھر والوں سے بھی یہ بات چھپائی تھی اس لیے کسی سے اپنی کیفیت کا اظہار بھی نہیں کر سکتا تھا۔

رات ہوئی تو اس نے بابا سائیں کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق عمل کرنے کے لیے جائے نماز بچھائی اور نفل ادا کرنے کے لیے نیت باندھ لی، نفل ادا کرنے کے بعد وہ تسبیح لے کر بابا سائیں کے بتائے ہوئے الفاظ پڑھ کر تسبیح کا ایک ایک دانہ گرانے لگا، اس نے سوچ رکھا تھا کہ اگر بابا سائیں کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق عمل کرنے سے اسے دلی اطمینان ہوا تو وہ یہ عمل جاری رکھے گا، لیکن اگر اس کے دل کی کھٹک دور نہ ہوئی تو وہ اس عمل سے باز رہے گا۔

فرحان نوافل اور تسبیح سے فارغ ہو چکا تھا مگر اس کے خدشات ابھی تک اپنی جگہ تھے، اس نے بہتر یہی سمجھا کہ مزید وقت ضائع کیے بغیر

الماری میں پڑے ہوئے لفافے کو کھول کر بانڈ چیک کر لیے جائیں، وہ جلدی سے الماری کی طرف بڑھا اور لفافہ پکڑ کر چارپائی پر آ بیٹھا، لفافہ کھولتے ہوئے اس کے دل کی دھڑکنوں کی رفتار تیز ہوتی گئی، لیکن جیسے ہی لفافہ کھلا، ایک لمحے کے لیے اس کے دل کی دھڑکن تھم گئی تھی، کیونکہ اس کے تمام تر خدشات صحیح ثابت ہوئے تھے، لفافے میں بانڈز کی جگہ دھاگے میں لپٹے ہوئے بانڈ کے سائز کے ادھ جلے کاغذ موجود تھے، یہ دیکھ کر اس کا سر چکرا کر رہ گیا تھا مگر جلد ہی اس نے خود پر قابو پا لیا اور اپنے آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں سوچنے لگا، اس نے خود کو بستر پر گرا دیا تھا، اس کی آنکھیں بند تھیں مگر نیند اس کی آنکھوں سے بہت دور تھی۔

سورج نکل آیا تھا اور ہر طرف روشنی پھیل چکی تھی، فرحان نے اپنی موٹر سائکل لی اور کسی کو بتائے بغیر گھر سے نکل پڑا، گھر سے نکلتے ہوئے اس نے پرائز بانڈ والا لفافہ شاپر میں ڈال کر موٹر سائیکل کے ہینڈل سے لٹکا لیا تھا، بابا سائیں کے پاس جانے سے پہلے اس نے اپنے انتہائی قریبی دوست کو تمام واقعات سنائے تھے اور اسے اپنے ساتھ موٹر سائیکل پر بٹھا کر بابا سائیں کے دفتر کی جانب چل پڑا تھا۔

دونوں دوست بابا سائیں کے دفتر پہنچے تو آٹھ بج چکے تھے، مگر ابھی دفتر بند تھا، انہوں نے دفتر کے سامنے ہی موٹر سائیکل کھڑی کر دی اور دفتر کھلنے کا انتظار کرنے لگے، کچھ ہی دیر بعد اشرف وہاں آ پہنچا اور دفتر کے تالے کھولنے لگا، اسے دیکھتے ہی وہ دونوں تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے اس کے پاس جا پہنچے، ابھی وہ تالے کھول ہی رہا تھا کہ فرحان نے اس کے کندھے پر ہاتھ جا رکھا، اشرف نے جلدی سے گردن گھما کر دیکھا اور انہیں اپنے سامنے کھڑے دیکھ کر حیران ہو گیا، فرحان وہیں کھڑے کھڑے تمام باتیں کر دینا چاہتا تھا مگر اشرف نے اسے ایسا نہ کرنے دیا اور انہیں ساتھ لیے دفتر میں داخل ہو گیا، فرحان کے صبح سویرے دفتر آنے پر اشرف تمام بات سمجھ چکا تھا، لیکن پھر بھی اس نے انہیں اپنے سامنے بٹھا لیا اور باتیں کرنے لگا۔

''خیر تو ہے..... اتنی صبح صبح کیسے آنا ہوا.....؟''

''اسے دیکھو.....'' اشرف کی بات سن کر فرحان نے بانڈز والا لفافہ اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

اشرف نے لفافہ اٹھایا اور اس کے اندر جھانک کر بولا ''تمہیں پرائز بانڈ والا لفافہ کھول کر دیکھنے کی غلطی نہیں کرنی چاہئے تھی، کیونکہ ہدایات والے کاغذ پر صاف صاف درج ہے کہ جو شخص قرعہ اندازی سے پہلے لفافے کو کھول کر دیکھے گا، وہ نقصان کا خود ذمہ دار ہو گا۔''

''میں ذہنی طور پر مطمئن نہیں تھا اس لیے لفافہ کھول کر دیکھنا ہی تھا۔''

''اس طرح کے واقعات تو یہاں آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا، اس لیے بہتر یہی ہے کہ سب کچھ بھول جاؤ اور صبر شکر کر کے اپنے گھر جا بیٹھو کیونکہ یہاں سے تمہیں کچھ ملنے والا نہیں'' اشرف نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''لیکن جو میرا نقصان ہوا ہے وہ کون پورا کرے گا؟''

''اس بارے میں تو تمہیں پہلے سوچنا چاہئے تھا.....''

''مجھے کیا معلوم تھا کہ میں اس قدر صفائی سے لٹ جاؤں گا''

''اگر تم یہ سمجھ رہے ہو کہ کسی طرح تمہیں تمہاری رقم مل جائے گی تو ایسا ممکن نہیں۔''

''آج ہم تمہیں ناممکن کو ممکن بنا کر دکھائیں گے۔ ذرا تمہارے بابا سائیں کو آ لینے دو پھر جو کچھ یہاں ہو گا وہ تم بھی دیکھنا'' فرحان نے تیز لہجے میں بات کی، اسی دوران بابا سائیں بھی پہنچ گئے۔

بابا سائیں نے فرحان اور اس کے ساتھی کو اشرف کے ساتھ الجھتے ہوئے دیکھ لیا تھا مگر وہ انجان بن کر وہاں رکے بغیر اپنے کمرے میں جا بیٹھے تھے، ان کے کمرے میں جاتے ہی فرحان اور اس کا ساتھی بھی اٹھ کھڑے ہوئے تاکہ بابا سائیں سے اپنی رقم کے بارے میں بات کر سکیں، انہیں بابا سائیں کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے دیکھ کر اشرف جلدی سے ان کے سامنے آ کھڑا ہوا اور بولا ''تم یہیں ٹھہرو پہلے میں بابا سائیں کے ساتھ بات کر لوں۔''

''تمہاری ایسی کی تیسی.....'' فرحان نے یہ کہتے ہوئے اوپر تلے دو زوردار مکے اشرف کے منہ پر دے مارے۔

اشرف کے منہ پر جو مکے پڑے تھے ان کی وجہ سے اس کے منہ سے خون نکلنے لگا تھا، وہ سہم کر ایک طرف ہو گیا اور پھر اسے انہیں روکنے کی جرأت نہ ہوئی۔

بابا سائیں حالات کی نزاکت کو سمجھ چکے تھے، پھر بھی ان دونوں کے کمرے میں داخل ہونے پر مسکراتے ہوئے بولے ''آیئے آیئے تشریف

رکھیے۔''

''اپنی یہ جھوٹی مسکراہٹ اپنے پاس رکھو اور ہمیں ہماری رقم دو۔'' فرحان نے بانڈز والا لفافہ بابا سائیں کے سامنے میز پر پھینکتے ہوئے کہا۔

''ہوا کیا ہے برخوردار.....؟ کچھ مجھے بھی تو پتہ چلے.....'' بابا سائیں نے انتہائی دھیمے لہجے میں دریافت کیا۔

''اتنے انجان مت بنو فراڈ بھی کرتے ہو اور بھولے بھی بنتے ہو۔''

''کہیں آپ نے یہ لفافہ کھول کر تو نہیں دیکھ لیا؟''

''ہاں کھولا تھا..... تبھی تو تمہارے فراڈ کا پتہ چلا۔''

''آپکو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا اس لیے تو تمام عملیات الٹے پڑ گئیمیں نے آپ کو جو ہدایات نامہ دیا تھا اس پر تمام باتیں لکھی ہوئی تھیں اس پر واضع الفاظ میں تحریر ہے کہ قرعہ اندازی سے قبل اس لفافے کو کھولنے والا اپنے نقصان کا خود ذمہ دار ہوگا تم نے ایسا کیا ہے تو نقصان بھی خود ہی بھگتو۔''

''بس..... بابا سائیں تقریر بہت ہوگئی..... اب سیدھی طرح یہ بتاؤ، ہماری رقم واپس کرتے ہو یا نہیں.....؟''

''میرے پاس کونسی رقم ہے جو میں واپس کروں.....'' بابا سائیں نے انتہائی ڈھٹائی سے جواب دیا۔

بابا سائیں کی بات سنتے ہی دونوں دوست بجلی کی سی تیزی سے بابا سائیں کے سر پر پہنچ گئے، دونوں نے بابا سائیں کو گردن سے دبوچ کر اوپر اٹھاتے ہوئے زمین پر جھٹک دیا اور ان پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش برسانے لگے۔

☆☆☆☆☆

کرم دین بابا سائیں سے ملنے گھر سے نکلا تو اس کے ایک ہاتھ میں کالے رنگ کا خوب پلا ہوا بکرا پکڑا ہوا تھا، جو اس نے منہ مانگی رقم ادا کر کے ایک روز قبل ہی خریدا تھا، جبکہ اس کے دوسرے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ تھا، جس میں باداموں والی برفی تھی جو اس نے خاص طور پر بابا سائیں کے لیے تیار کروائی تھی۔ بابا سائیں کے ہاں پہنچ کر اس نے بکرا دفتر کے باہر ہی ایک طرف باندھ دیا اور خود مٹھائی کا ڈبہ ہاتھ میں لیے اندر داخل ہوگیا۔

دفتر میں قدم رکھتے ہی عجیب سی آوازیں اس کے کانوں سے ٹکرائیں، وہ تھوڑا سا آگے بڑھا تو اشرف اپنے کاؤنٹر پر موجود نہیں تھا، عجیب چیخ و پکار ہو رہی تھی، آوازیں بابا سائیں کے کمرے سے آ رہی تھیں، اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا مٹھائی کا ڈبہ وہیں پھینکا اور تیزی سے بابا سائیں کے کمرے کی طرف دوڑ لگا دی۔

وہ کمرے میں داخل ہوا تو وہاں اس کے لیے ناقابل یقین سماں تھا، دو نوجوان مل کر لاتوں اور گھونسوں سے بابا سائیں کی پٹائی کر رہے تھے، انہوں نے مار مار کر بابا سائیں کا برا حال کر رکھا تھا، بابا سائیں مار کھاتے ہوئے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر منت سماجت کر رہے تھے، بابا سائیں کی حالت اس بکرے کی سی ہو رہی تھی جسے کچھ لوگ پکڑ کر ذبح کر رہے ہوں اور وہ ان سے جان چھڑانے کے لیے بھیں بھیں کر رہا ہو۔

کرم دین سے بابا سائیں کی حالت دیکھی نہ گئی اور اس نے بابا سائیں کی پٹائی کیے جانے کا سبب جانے بغیر ان دونوں میں سے ایک کو پکڑ کر پوری طاقت سے ایک طرف اچھال دیا، پھر دوسرے کو گریبان سے پکڑ کر اس کے منہ پر کئی گھونسے ٹکا دیے، بابا سائیں کو پٹتا دیکھ کر کرم دین پر عجیب سی وحشت طاری ہوگئی تھی، اسے کچھ ہوش نہیں رہا تھا کہ اس کا مارا ہوا گھونسہ کسے کہاں لگ رہا تھا، وہ کسی بھی بات کی پرواہ کیے بغیر ان دونوں کی پٹائی کیے جا رہا تھا۔

فرحان اور اس کا ساتھی کچھ دیر پہلے تک تسلی سے بابا سائیں کی ٹھکائی کر رہے تھے، مگر کرم دین کے اچانک حملے سے وہ بوکھلاہٹ کا شکار ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے، انہیں پکڑنے کے لیے کرم دین ان کے پیچھے دوڑا مگر وہ پھرتی سے جان چھڑا کر نکل گئے، وہ کوشش کرتا تو ان میں سے کسی ایک کو با آسانی دبوچ سکتا تھا مگر اسے بابا سائیں کی فکر تھی جنہیں وہ کمرے میں تڑپتا ہوا چھوڑ آیا تھا۔

کرم دین کمرے میں واپس آیا تو بابا سائیں فرش پر گرے پڑے تھے اور درد سے کراہ رہے تھے، بابا سائیں نے ایک ہاتھ اپنے دل پر رکھا ہوا تھا اور دوسرے ہاتھ سے گلے کو دبا کر پکڑ رکھا تھا، وہ بولنے کی کوشش کر رہے تھے مگر آواز ان کے حلق سے نہیں نکل پا رہی تھی، وہ کرم دین سے کچھ کہنا چاہ رہے تھے مگر کہہ نہیں پا رہے تھے، بابا سائیں کی آنکھوں سے بے بسی صاف دکھائی دے رہی تھی اور ان کے چہرے پر تکلیف کی شدت کے آثار نمایاں تھے۔

کرم دین سے بابا سائیں کی تکلیف دیکھی نہیں جا رہی تھی، وہ جان چکا تھا کہ ان کی جو حالت ہو رہی ہے وہ محض چوٹوں کی وجہ سے نہیں تھی، انہیں ساتھ ہی ساتھ کوئی اور تکلیف بھی ہو رہی تھی، جو وہ بتا نہیں پا رہے تھے، اس نے اپنا پورا زور لگا کر بابا سائیں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر صوفے پر لٹا دیا اور جلدی سے گلاس میں پانی ڈال کر لے آیا، کرم دین نے پانی کا گلاس بابا سائیں کی طرف بڑھاتے ہوئے پینے کو کہا مگر انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے پانی پلانے سے منع کر دیا۔

بابا سائیں کی سانسیں اکھڑی ہوئی تھیں اور وہ سانس لینے میں بہت تکلیف محسوس کر رہے تھے، کرم دین نے کچھ سوچے سمجھے بغیر انہیں اپنی بانہوں میں اٹھا لیا اور جلدی سے باہر کی طرف چل پڑا۔ باہر نکلتے ہی اس نے ایک ٹیکسی والے کو رکنے کا اشارہ کر دیا تھا، کرم دین نے بابا سائیں کو بازوؤں پہ اٹھا رکھا تھا، ٹیکسی والا گاڑی روک کر باہر نکل آیا اور جلدی سے پچھلا دروازہ کھول دیا، کرم دین نے ٹیکسی ڈرائیور کی مدد سے بابا سائیں کو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹایا، پھر خود بھی بیٹھ گیا اور بابا سائیں کا سر اپنی ٹانگوں پر رکھ لیا۔

کرم دین کے کہنے پر ٹیکسی والے نے انہیں قریبی ہسپتال پہنچا دیا تھا اور گاڑی ایمرجینسی کے سامنے لا کھڑی کی تھی، بابا سائیں کو سٹریچر پر لٹا کر فوری طور پر ایمرجینسی میں پہنچا دیا گیا تھا، ان کی حالت دیکھتے ہی وارڈ میں موجود ڈاکٹر انہی کی طرف دوڑ پڑے تھے، فوری طور پر بابا سائیں کو آکسیجن لگا دی گئی تھی تاکہ انہیں سانس لینے میں آسانی ہو سکے۔

ڈاکٹر، بابا سائیں کا مکمل معائنہ کر رہے تھے اس لیے کرم دین کو تسلی تھی مگر اس کے باوجود وہ مطمئن نہیں تھا، ڈاکٹروں نے کرم دین کو بابا سائیں کے پاس ٹھہرنے نہیں دیا تھا لیکن اس کی نظریں مسلسل انہی پر ہی لگی ہوئی تھیں، وہ جب سے بابا سائیں کو ہسپتال لایا تھا، تب سے ایک پل کے لیے بھی چین سے نہیں بیٹھا تھا۔

کچھ دیر بعد بابا سائیں کی حالت قدرے سنبھل گئی تھی اس لیے انہیں ایمرجینسی سے آئی سی یو میں شفٹ کر دیا گیا، کرم دین سائے کی طرح بابا سائیں کے ساتھ ساتھ تھا، وارڈ میں آ کر دوائیوں کے اثر سے بابا سائیں کی آنکھ لگ گئی تھی، وہ سو رہے تھے، کرم دین پاس ہی بنچ پر بیٹھا تھا، اس کی نگاہیں مسلسل بابا سائیں کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں، گو کہ اب ان کے چہرے سے کسی قسم کی تکلیف کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے مگر اس کے باوجود کرم دین بے سکونی کی سی حالت میں تھا، آخر کار اس سے رہا نہ گیا اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر وارڈ میں ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر کے پاس جا کھڑا ہوا۔

''کیا بات ہے.....؟'' ڈاکٹر نے پاس کھڑے کرم دین کو دیکھ کر سوال کیا۔

''وہ.....ڈاکٹر صاحب.....بابا سائیں ٹھیک تو ہیں.....وہ باتیں کیوں نہیں کر رہے.....؟''

''ابھی وہ سو رہے ہیں، جب اٹھیں گے تو باتیں بھی کر لیں گے۔'' ڈاکٹر نے کرم دین کی طرف دیکھے بغیر کاغذ پر کچھ لکھتے ہوئے جواب دیا۔

ڈاکٹر کے جواب سے کرم دین کی پوری طرح تسلی نہیں ہوئی تھی، اس لیے بولا ''لیکن وہ کب تک سوئے رہیں گے؟''

''تم فکر کیوں کرتے ہو.....وہ جتنا سوئیں گے ان کے لیے اتنا ہی اچھا ہے۔''

''فکر کی تو بات ہے ناں ڈاکٹر صاحب۔''

''شکر کرو وہ بچ گئے ہیں.....جانتے ہو انہیں ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔''

''ہارٹ اٹیک ہوا تھا بابا سائیں کو.....؟'' کرم دین نے لاعلمی میں دریافت کیا۔

''تمہارے کیا لگتے ہیں وہ؟''

ڈاکٹر کے اس سوال پر کرم دین پریشان ہو گیا تھا، فوری طور پر اسے اپنے اور بابا سائیں کے رشتے کی سمجھ نہ آئی پھر بولا ''وہ.....وہ.....وہ جی میرے بہت کچھ ہیں۔''

''اچھا چلو تم اپنی جگہ بیٹھو، فکر کی کوئی بات نہیں بس تھوڑی دیر میں خود ہی اٹھ جائیں گے تم انہیں نہ اٹھانا''

''ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب۔'' کرم دین نے ڈاکٹر کو مختصر سا جواب دیا اور واپس اپنی جگہ پر آ بیٹھا، اور بیٹھتے ہی پھر سے بابا سائیں کے چہرے پر ٹکٹکی باندھ لی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد بابا سائیں نے آنکھیں کھول دیں، ان کی آنکھیں کھلتے ہی کرم دین ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''بسم اللہ.....بسم اللہ.....شکر ہے.....شکر ہے میرے بابا سائیں نے آنکھیں کھولیں.....اب کیسی طبیعت ہے سرکار.....؟''

''میں ٹھیک ہوں کرم دین! مگر آج تم وقت پر نہ آتے تو پھر نہ جانے کیا ہو جاتا.....''

''لیکن سرکار وہ کون لوگ تھے جو اس قدر بے دردی سے وحشیوں کی طرح آپ کو مار رہے تھے؟''

ایک لمحے کے لیے کرم دین کے سوال نے بابا سائیں کو پریشان کر دیا تھا، پھر وہ سوچنے لگے کہ کرم دین کو تمام تفصیل سے آگاہ کرنا مناسب نہیں، اس لیے بات گول مول کرنے کے لیے بولے ''میں تو انہیں جانتا نہیں..... بس وہ لوگ اچانک دفتر میں گھس آئے، میرے پاس جو رقم تھی ان کے کہنے پر وہ بھی میں نے انہیں دے دی تھی مگر اس کے باوجود وہ مجھ پر حملہ آور ہو گئے کہ ابھی اور بھی بہت کچھ ہے مگر میں انہیں دے نہیں رہا۔''

''سرکار ایک بار مجھے ان کے بارے میں پتہ چل جائے، پھر دیکھیں میں ان کا کیا حشر کرتا ہوں'' کرم دین نے بابا سائیں کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے جزباتی ہو کر کہا۔

''جو ہونا تھا وہ ہو چکا..... اب تم کیوں پریشان ہوتے ہو۔''

''پریشانی کی بات تو ہے سرکار..... کوئی میرے ہوتے ہوئے آپ پر ہاتھ اٹھانا تو ایک طرف میلی آنکھ سے بھی دیکھ جائے تو پھر لعنت ہے میری زندگی پر۔''

کرم دین جزباتی ہو رہا تھا، بابا سائیں نے اس کی پیٹھ پر تھپکی دی اور تسلی دیتے ہوئے بولے ''بس کرم دین اس بات کو یہیں ختم کرو اور ڈاکٹر سے پوچھو کہ ہمیں یہاں سے کب فارغ کر دیں گے۔''

کرم دین کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا مگر بابا سائیں کے کہنے پر خاموش ہو گیا اور ''اچھا سرکار میں ابھی پوچھ کر آتا ہوں'' کہتا ہوا ڈاکٹر کی طرف چل پڑا۔

''ڈاکٹر صاحب!.....''

''ہوں..... کیا مسئلہ ہے.....؟'' ڈاکٹر نے اپنے پاس کھڑے کرم دین کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''ڈاکٹر صاحب!..... بابا سائیں کہہ رہے ہیں کہ اب وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ انہیں چھٹی دے دیں۔''

''ابھی ایک دو دن انہیں یہیں رہنا پڑے گا''

''مگر اب تو وہ بالکل ٹھیک ہیں۔''

''ڈاکٹر تم ہو یا میں؟''

''ڈاکٹر تو آپ ہی ہیں..... مگر..... وہ.....'' اس سے آگے کرم دین کچھ اور نہ بول سکا کیونکہ اس کے بولنے پر ڈاکٹر صاحب اسے غصے سے دیکھنے لگے تھے، اس لیے خاموشی سے واپس بابا سائیں کے پاس آ گیا۔

''کیا کہہ رہا ہے ڈاکٹر.....؟'' بابا سائیں نے کرم دین کو قریب پا کر دریافت کیا۔

''وہ کہہ رہے ہیں ایک دو روز بعد چھٹی ملے گی۔''

''تم نے ان سے کہنا تھا کہ اب مریض بالکل ٹھیک ہے۔''

''میں نے کہا تھا سرکار..... مگر ڈاکٹر صاحب ناراض ہونے لگے، اس لیے واپس آ گیا''

''کرم دین آج اشرف بھی نہیں آیا..... دفتر یونہی کھلا پڑا ہو گا..... کہیں کوئی اور نقصان نہ ہو جائے..... ویسے بھی اب میں ٹھیک ہوں..... تم ڈاکٹر کو بلاؤ، میں خود بات کرتا ہوں۔''

کرم دین ڈاکٹر کے پاس جانے سے گھبرا رہا تھا، اسے معلوم تھا کہ اگر اب اس نے ڈاکٹر سے چھٹی کی بات کی تو اسے ڈانٹ پڑ جائے گی، مگر وہ بابا سائیں کے حکم کو بھی نہیں ٹال سکتا تھا، اس لیے ہمت کر کے ایک بار پھر ڈاکٹر کے پاس جا کھڑا ہوا تھا مگر اسے بات کرنے کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا، اس لیے خاموش تھا۔

ڈاکٹر نے اسے کھڑے دیکھا تو خود ہی بول پڑے ''اب کیا بات ہے۔''

''کچھ نہیں ڈاکٹر صاحب..... وہ..... وہ..... بابا سائیں بلا رہے تھے آپ کو۔''

''اچھا تم چلو میں آتا ہوں۔''

اس ڈر سے کہ کہیں ڈاکٹر صاحب اسے ڈانٹنے نہ لگیں، کرم دین جلدی سے وہاں سے چل پڑا اور واپس بابا سائیں کے پاس آ کھڑا ہوا۔
''اب کیا کہہ رہا ہے ڈاکٹر؟'' کرم دین کے واپس آنے پر بابا سائیں نے سوال کیا۔
''ڈاکٹر صاحب ابھی آجاتے ہیں سرکار۔''
کچھ ہی دیر بعد ڈاکٹر بابا سائیں کے پاس آ گیا اور آتے ہی ان کی فائل دیکھنے لگا۔
''ڈاکٹر صاحب مجھے چھٹی دے دیں۔'' بابا سائیں نے ڈاکٹر سے کہا۔
''ابھی آپ کو ایک دو روز اور یہیں رہنا پڑے گا۔''
''نہیں ڈاکٹر صاحب مجھے جانا ہے۔''
''ٹھیک ہے..... اگر آپ جانا چاہتے ہیں تو لکھ کر دے دیں، تاکہ اگر کوئی مجھ سے پوچھے تو میں کہہ سکوں کہ آپ اپنی مرضی سے گئے ہیں۔''
''میں لکھ دیتا ہوں ڈاکٹر صاحب! بس آپ چھٹی دے دیں۔'' بابا سائیں بضد تھے کہ انہیں ہسپتال سے فارغ کر دیا جائے، اس لیے ڈاکٹر خاموشی سے وہاں سے نکل کر اپنی جگہ پر جا بیٹھا اور کچھ ہی دیر بعد بابا سائیں کو ہسپتال سے فارغ کر دیا گیا۔

☆☆☆☆☆

بابا سائیں ہسپتال سے واپس اپنے کمرے میں کرسی پر آ بیٹھے تھے، جھگڑے کے دوران کمرے کی جو چیزیں الٹ پلٹ گئی تھیں وہ ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں، کرم دین بکھری ہوئی چیزیں سمیٹنے لگا، وہ زمین پر گری ہوئی مختلف اشیاء اٹھا کر میز پر رکھ رہا تھا کہ اسی دوران اس کی نظر اس کتاب پر پڑی جو کافی پرانی لگ رہی تھی، اس کی جلد پر کتاب کا نام بھی تحریر تھا، کتاب دیکھتے ہی کرم دین کے دل میں خیال آیا کہ یقیناً یہ کتاب بہت قیمتی اور فائدہ مند ہوگی، اس نے جان بوجھ کر کتاب وہیں پڑی رہنے دی اور دیگر اشیاء اٹھاتا رہا، کرم دین وہ کتاب وہاں سے چرا لینا چاہتا تھا مگر بابا سائیں کی نظریں مسلسل اسی پر تھیں، اس لیے وہ ایسا نہیں کر پا رہا تھا۔
کرم دین کا دماغ اس کتاب کے متعلق تیزی سے کام کر رہا تھا مگر اسے کامیابی کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے، اچانک بابا سائیں اپنی سیٹ سے اٹھے اور اس کی طرف بڑھنے لگے، کرم دین کا دل دھک دھک کرنے لگا تھا، بابا سائیں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر وہ یہی سمجھا کہ انہیں شک ہو گیا ہے اور وہ کتاب اٹھانے خود اپنی سیٹ سے اٹھے ہیں، بابا سائیں کے قدم جیسے جیسے اس کی طرف بڑھ رہے تھے اس کے دل کی رفتار میں اسی قدر تیزی آتی جا رہی تھی لیکن جیسا کرم دین سوچ رہا تھا ویسا نہیں تھا، دراصل بابا سائیں باتھ روم میں جانے کے لیے اٹھے تھے، وہ جیسے ہی اس کے پاس سے گزر کر باتھ روم کی طرف بڑھے کرم دین کی جان میں جان آ گئی۔
اب کرم دین کی نظریں بابا سائیں کا پیچھا کر رہی تھیں، جونہی انہوں نے باتھ روم میں داخل ہو کر دروازہ بند کیا، وہ بجلی کی سی تیزی سے اٹھا اور کتاب باہر صوفے کے پیچھے چھپا کر جلدی سے واپس کمرے میں آ گیا، وہ اس بات سے مطمئن تھا کہ اس نے کتاب کو ٹھکانے لگا دیا تھا، اب وہ جاتے ہوئے وہاں سے با آسانی کتاب اپنے ساتھ لے جا سکتا تھا، لیکن ساتھ ہی ساتھ اسے اس بات کا بھی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں بابا سائیں اس کتاب کے متعلق پوچھ نہ لیں، بابا سائیں کے باتھ روم سے واپس آنے تک کرم دین اپنے کام سے فارغ ہو چکا تھا۔
''آج جو احسان تم نے مجھ پر کیا ہے میں وہ زندگی بھر بھلا نہیں پاؤں گا'' بابا سائیں نے باتھ روم سے واپس آ کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
''آپ احسان کی بات کرتے ہیں بابا سائیں! مجھے تو اس بات کا افسوس رہے گا کہ میں ان لوگوں کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکا، جنہوں نے آپ کو اس قدر اذیت پہنچائی۔''
''اچھا کرم دین! اب اس بات کو یہیں چھوڑ دو اور بھول جاؤ کہ کبھی کچھ ہوا تھا بلکہ اس بات کا ذکر کبھی اشرف سے بھی نہ کرنا۔''
''جیسا آپ کہتے ہیں بابا سائیں ویسا ہی ہوگا۔'' کرم دین یہ کہتا ہوا کمرے سے نکل گیا اور باہر سے مٹھائی کا ڈبہ اٹھا لایا جو وہ خاص طور پر بابا سائیں کے لیے لے کر آیا تھا ''یہ آپ کے لیے ہے بابا سائیں'' کرم دین نے مٹھائی کا ڈبہ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔
''یہ کیا ہے کرم دین.....؟''
''باداموں والی برفی ہے سرکار، یہ میں نے خاص طور پر آپ کے لیے تیار کروائی تھی اور ہاں سرکار باہر ایک بکرا بھی بندھا ہے''
''یہ سب کیوں لاتے ہو کرم دین؟''
''یہ تو کچھ بھی نہیں سرکار اگر میرے پاس کچھ اور ہوتا تو وہ بھی لا کر آپ کے قدموں میں ڈھیر کر دیتا''

''بہت کچھ ملے گا تمہیں کرم دین! اتنا کچھ کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔''
''مگر کب ملے گا سرکار؟'' کرم دین نے بے چین ہو کر دریافت کیا۔
''کرم دین سچ پوچھو تو اب تک میں تمہیں اور لوگوں کی طرح ٹرخاتا ہی آیا ہوں، کیونکہ تمہاری طرح کے بہت سے جنونی میرے پاس آتے ہیں، مگر میں انہیں اسی طرح ٹال دیتا ہوں لیکن آج تم نے مجھ پر جو احسان کر دیا ہے۔ اب میرا دل بھی چاہ رہا ہے کہ میں بھی تمہارے لیے کچھ کروں۔''
''میں نے تو سرکار آپ کے لیے کچھ بھی نہیں کیا لیکن اگر آپ کچھ مہربانی فرما دیں گے تو یہ آپ کا مجھ پر بہت بڑا احسان ہوگا''
''ٹھیک ہے کرم دین میں تمہیں کچھ عملیات سکھا دیتا ہوں، لیکن یہ یاد رکھنا..... تمہیں ملے گا تو بہت کچھ مگر اس میں تمہیں کچھ مشکلات بھی پیش آسکتی ہیں۔''
''مجھے دولت چاہیے سرکار! صرف دولت.....اور دولت کے لیے میں سب کچھ برداشت کرنے کو تیار ہوں۔''
''میرے پاس بہت سے علم ہیں.....رشتوں کی بندش، شادی میں رکاوٹ، لڑکیوں کی شادیوں کے حل، اولاد کا نہ ہونا یا ہو کر مر جانا، اولاد کی نافرمانی، گھریلو جھگڑے، جادو ٹونہ، دشمن کو زیر کرنا، امتحان میں کامیابی، انعامی چانس، شوہر کو راہ راست پر لانا، جادو کا کاٹ کالے علم سے کس طرح کیا جاتا ہے، اور اس کے علاوہ جنتو کا علم، منتو کا علم، سفلی کا علم، گدیلوں کا علم، شانتی دیوی کا علم، لشمی دیوی کا علم، کالی دیوی کا علم، پرتل دیوی کا علم، کالی ماتا کا علم، ہنومان کا علم، بھوت پریت کا علم، پریوں کا علم، جنات کا علم.....'' بابا سائیں یہ کہتے ہوئے سانس لینے کے لیے رکے اور پھر بولے ''اور بھی بہت سے علم ہیں جو میں جانتا ہوں تم بتاؤ کون سا علم سیکھنا چاہتے ہو؟''
''سارے ہی سکھا دیں سرکار.....'' کرم دین نے کسی بچے کی طرح اپنی خواہش کا اظہار کیا۔
''یہ سارے تو ممکن نہیں ہاں ان میں سے کچھ ایسے علم بتا دیتا ہوں جو تمہارے کام آئیں گے اور آگے چل کر تمہیں ان سے فائدہ بھی ہوگا۔''
''سرکار جب مہربانی کرنے ہی لگے ہیں تو دل کھول کر کریں پتہ تو چلے کہ بابا سائیں کسی پر مہربان ہوئے تھے۔''
کرم دین کی بات سن کر بابا سائیں دیر تک کچھ سوچتے رہے، پھر اندر ہی اندر کچھ بڑبڑاتے رہے، بعد میں خلا میں گھورتے ہوئے کسی سے باتیں کرنے لگے، پھر کرم دین کو اپنے پاس بٹھا لیا اور کاغذ قلم نکال کر کچھ لکھنے لگے، بابا سائیں ایک کاغذ پر کچھ لکھ کر ایک طرف رکھ دیتے پھر دوسرے کاغذ پر لکھنے لگتے، اسی طرح انہوں نے کئی کاغذات پر کچھ لکھا اور پھر انہیں تہہ کر کے اپنے پاس رکھ لیا۔ بابا سائیں کچھ لکھنے میں مصروف تھے اور کرم دین ان کا بغور جائزہ لے رہا تھا، کچھ دیر اسی کیفیت میں گزر گئی پھر بابا سائیں نے کرم دین کو تمام کاغذات کے بارے میں تفصیل سے بتایا اور تمام عملیات سمجھانے کے بعد ضروری ہدایات دے کر اسے رخصت کر دیا۔

☆☆☆☆☆

بابا سائیں نے کرم دین کو جو عملیات بتائے تھے، اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ تمام عملیات ایک ساتھ کر ڈالے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اپنی تمام تر خواہشات پوری کر لے، لیکن بابا سائیں نے اس بات کی سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ ایک کے بعد دوسرا عمل کرے، اگر بابا سائیں نے نصیحت نہ کی ہوتی تو شائد وہ ویسا ہی کرتا، جیسا اس کا دل چاہ رہا تھا۔
گھر پہنچ کر جب کرم دین نے بابا سائیں کے ساتھ ہونے والی تمام تر گفتگو اور ان کے بتائے ہوئے عملیات کے بارے میں عائشہ سے ذکر کیا تو وہ اپنی عادت کے مطابق کرم دین کو سمجھانے لگی، مگر کرم دین نے جس طرح کی مشکلات برداشت کرنے اور صبر آزما گھڑیوں کے بعد کسی طرح بابا سائیں سے عملیات حاصل کیے تھے وہ کس طرح عائشہ کی بات یاں سکتا تھا، اس نے عائشہ کی ایک نہ سنی اور اسے بری طرح جھڑک دیا۔
عملیات کی جو کتاب بابا سائیں کے ہاں سے کرم دین کے ہاتھ لگی تھی، وہ اس نے آتے ہی چھپا کر رکھ دی تھی، وہ کتاب اس کے لیے ایسا خزانہ تھی کہ جس کسی کی بھی نظر اس پر پڑ جاتی، وہ اسے چرا کر لے جاتا، ایک دو روز تک کرم دین نے جہاں کتاب رکھی تھی وہیں پڑی رہنے دی، وہ جلد از جلد اس کتاب کو پڑھ کر اس کے متعلق سب کچھ جان لینا چاہتا تھا لیکن اس کے دل میں کھٹکا سا تھا۔
رات کا وقت تھا عائشہ اور بچے سکون سے سو رہے تھے، وہ خاموشی سے اٹھا اور زیرو کے بلب کی روشنی میں ہی کسی قسم کا شور کیے بغیر کمرے سے نکل گیا، پھر اس نے چپکے سے کتاب اٹھائی اور دوسرے کمرے میں جا کر اسے اپنے سامنے رکھ کر بیٹھ گیا، کتاب کی شکل میں اس کی منزل اس کے سامنے تھی اور وہ اسے بغور دیکھے جا رہا تھا، گو کہ بابا سائیں نے بھی کچھ انتہائی اہم عملیات کرم دین کو بتائے تھے مگر کتاب کی موجودگی میں اب

وہ اسے معمولی اور غیر اہم لگنے لگے تھے۔

کتاب کافی موٹی تھی، لیکن وہ ایک ہی رات میں ساری کی ساری پڑھ لینا چاہتا تھا، اس نے ابھی چند اوراق ہی پڑھے تھے کہ اس کے پورے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی اور وہ کانپنے لگا، ایسی حالت میں وہ کسی بھی طرح کتاب نہیں پڑھ سکتا تھا، اس نے کتاب ایک طرف رکھ دی اور لمبی لمبی سانسیں لے کر خود کو مضبوط کرنے لگا، اس عمل نے اسے کافی تقویت بخشی تھی، اس لیے وہ چند منٹ تک یہی عمل دہراتا رہا،

تھوڑی ہی دیر بعد اسے محسوس ہونے لگا کہ اب وہ بلا خوف سکون سے بیٹھ کر کتاب پڑھ سکتا ہے، اس نے دیوار سے ٹیک لگالی اور کتاب کی ورق گردانی کرنے لگا، کتاب طرح طرح کے عملیات سے بھری پڑی تھی، اس کی نظریں ایسے عملیات کی تلاش میں تھیں جن کے ذریعے وہ اپنے ان مقاصد میں با آسانی کامیاب ہو جاتا، جن کے بارے میں اس نے سوچ رکھا تھا۔

رات گزرتی جا رہی تھی، اس نے اپنے مطلب کے کئی صفحات ایک کونے سے موڑ دیے تھے، وہ صبح ہونے سے پہلے اس کام سے فارغ ہو جانا چاہتا تھا، اس لیے وہ مزید تیزی سے اوراق پلٹنے اور مطلوبہ صفحات پر نشانی لگانے لگا، اس نے ابتدائی طور پر بہت سے عملیات پر نشان لگا لیے تھے، بعد میں وہ سکون سے بیٹھ کر ان میں سے چند ایسے عملیات منتخب کرنا چاہتا تھا، جو اس کے کام کے تھے، ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جن کے کرنے سے اسے بہت سے خطرات کا سامنا کرنا پڑ سکتا تھا، مگر وہ ہر طرح کے خطرات سے کھیلنے کے لیے تیار تھا۔

کرم دین کتاب میں اس قدر کھویا رہا کہ اسے رات گزرنے کا احساس بھی نہ ہوا، جب مختلف مساجد سے فجر کی اذان کی آوازیں اس کے کانوں میں پڑیں تو اس نے جہاں سے کتاب اٹھائی تھی وہیں چھپا دی اور خود چپکے سے واپس اپنی چارپائی پر آ کر لیٹ گیا۔ رات بیت گئی تھی ،اس کی بیوی اور بچے ابھی تک سکون سے سو رہے تھے جبکہ کرم دین نے ایک پل کے لیے بھی آنکھ بند نہیں کی تھی، اب وہ کچھ دیر کے لیے سو جانا چاہتا تھا، اس نے لیٹتے ہی آنکھیں بند کر لیں، مگر اس کا ذہن کتاب میں الجھ کر رہ گیا، کتاب کے متعلق سوچنے کے عمل میں وہ اس قدر الجھا کہ پھر سو نہ سکا اور کچھ دیر بعد جب عائشہ اور بچے اٹھے تو اس نے بھی چارپائی چھوڑ دی۔

رات بھر جاگتے رہنے سے کرم دین سستی کا شکار تھا، اس کا جسم اس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا اور وہ ادھر ادھر لڑھکتا پھر رہا تھا، وہ اس کیفیت سے نکلنے کے لیے باتھ روم میں گھس گیا، تا کہ نہا کر فریش ہو سکے، کرم دین کی عادت تھی کہ وہ نہانے میں زیادہ وقت نہیں لگاتا تھا مگر اس روز وہ دیر تک سر پہ پانی ڈالتا رہا، نہانے کے بعد کرم دین نے ناشتہ کیا، پیٹ بھرتے ہی نیند اس پر غالب آ گئی اور وہ چارپائی پر لیٹ گیا، پھر کچھ دیر بعد ہی اس کے خراٹوں سے کمرہ گونجنے لگا۔

☆☆☆☆☆

کمرے میں بلب روشن تھا اور باہر گھپ اندھیرا تھا، آدھی سے زیادہ رات بیت چکی تھی، لوگ گہری نیند میں تھے اور ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا، کرم دین کی بیوی اور بچے کمرے میں سوئے ہوئے تھے اور وہ الگ کمرے میں تنہا بیٹھا عملیات کی کتاب میں الجھا ہوا تھا، اچانک کوئی سایہ اس کے سامنے سے گزرتا ہوا دکھائی دیا، کمرے میں اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں تھا، اس لیے وہ حیران تھا کہ وہ سایہ کس کا تھا، اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی مگر وہاں کوئی بھی نہیں تھا، اس نے سائے کو اپنا وہم سمجھا اور پھر سے کتاب پر نظریں جما دیں۔

چند لمحوں بعد کرم دین کو پھر سے کمرے میں کچھ سائے محسوس ہوئے جو آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہے تھے، کرم دین نے ایک جھٹکے کے ساتھ گردن اوپر اٹھائی تو یہ دیکھ کر اس کے جسم میں کپکپی طاری ہو گئی کہ کچھ عجیب سی شکلوں والے لوگ اس کی طرف بڑھ رہے تھے، وہ ڈر کر وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا مگر انہوں نے بجلی کی تیزی سے آگے بڑھ کر اسے دبوچ لیا۔ ان میں سے کسی نے اسے گردن، کسی نے بالوں اور کسی نے بازوؤں سے پکڑ رکھا تھا، قریب تھا کہ وہ چیر پھاڑ کر اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتے، اس نے اپنے جسم کی پوری طاقت کا استعمال کرتے ہوئے خود کو ان سے چھڑانے کی کوشش کی تھی، اس کوشش میں کتاب اس کے ہاتھوں سے نکل کر فرش پر گر پڑی۔

کتاب کے گرتے ہی وہ لوگ اسے چھوڑ کر کتاب پر جھپٹ پڑے، اب کرم دین آزاد تھا اور چاہتا تو جان بچا کر وہاں سے بھاگ سکتا تھا، مگر اب اس کی جان سے بھی قیمتی چیز عجیب مخلوق کے رحم و کرم پر تھی، وہ جس طرح چھینا جھپٹی کر رہے تھے اس سے کتاب پھٹ بھی سکتی تھی یا پھر ان میں سے کوئی ایک، کتاب چھین کر لے جا بھی سکتا تھا، جو اسے کسی بھی صورت میں قبول نہیں تھا، اس نے اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر ان کے اوپر ہی چھلانگ لگا دی، کرم دین کی یہ حرکت انہیں انتہائی ناگوار گزری تھی اس لیے ان میں سے ایک نے ہاتھ کے ہلکے سے اشارے سے اسے دور اچھال دیا تھا، وہ ایک بار پھر ہمت کر کے اٹھا اور پوری طاقت کے ساتھ ان کی طرف دوڑا، مگر اس کے ان تک پہنچنے سے پہلے ہی کتاب کے کئی

ٹکڑے ہو کر مختلف ہاتھوں میں تقسیم ہو چکے تھے، کتاب کی یہ حالت دیکھ کر کرم دین رونے لگا تھا مگر اسی لمحے اس کی آنکھ کھل گئی اور اس نے خود کو چارپائی پر لیٹا ہوا پایا۔

یہ جان کر کہ اس نے ابھی جو کچھ دیکھا وہ سب ایک خواب تھا، کرم دین کی جان میں جان آ گئی تھی، مگر اسے پھر بھی تسلی نہ ہوئی، اس نے جلدی سے چارپائی چھوڑ دی اور فوراً اس جگہ پہنچا جہاں اس نے کتاب چھپا رکھی تھی، کتاب کو اپنی جگہ پا کر اسے اطمینان نصیب ہوا تھا مگر وہ وہاں سے واپس آنے کی بجائے اسی کمرے میں چارپائی پر لیٹ گیا، تھوڑی ہی دیر بعد اس نے اس بات کا فیصلہ کر لیا تھا کہ اس سے پہلے کہ کوئی حقیقت میں وہ نایاب کتاب اس سے چھین کر لے جائے، اسے بلا تاخیر عملیات کا آغاز کر دینا چاہئے۔

وہ پلک جھپکنے سے پہلے کتاب میں دیے ہوئے عملیات مکمل کر لینا چاہتا تھا مگر کسی انجانے خوف نے اسے گھیر رکھا تھا، جس کی وجہ سے وہ انتہائی پریشان تھا، اس نے فیصلہ کیا کہ پہلے وہ عملیات کیے جائیں جن کے لیے بابا سائیں نے اجازت دی تھی۔

کرم دین نے عائشہ سے کہہ کر وہ کمرہ خالی کروالیا جو گھر کے ایک کونے میں واقع تھا، جب صفائی ہو گئی تو کرم دین نے فرش پر چٹائی بچھا کر اس پر سفید چادر بچھا دی اور کمرے میں جگہ جگہ اگر بتیاں جلا دیں، اس طرح اس نے سورج غروب ہونے سے قبل ہی اپنی تمام تیاری مکمل کر لی تھی، عائشہ تمام باتوں سے آگاہ تھی جبکہ کرم دین کے بچے حیران تھے کہ آج ان کے گھر میں یہ سب کیا ہو رہا تھا، شام ہوتے ہی کرم دین نے عائشہ کو کچھ ضروری ہدایات دیں اور کمرے میں جا گھسا۔

چلہ کاٹنے کے لیے کرم دین نے گھر کے کونے میں بنے ہوئے ایک چھوٹے سے کمرے کا انتخاب کیا تھا، اس نے جس عمل سے ابتدا کی تھی اس کا دورانیہ کم سے کم سات دن تھا اور اس میں کسی قسم کا کوئی خطرہ بھی نہیں تھا، چند آیات کی تسبیح کرتے ہوئے مقررہ تعداد پوری کرنا تھی، جس چلے کو پورا کرنے کے لیے چھ سات دن درکار تھے، اسے مکمل کرنے کے لیے کرم دین نے دن رات ایک کر دیا اور صرف تین دن میں تسبیحوں کی مقررہ تعداد پوری کر لی۔

اب کرم دین کے شب و روز اسی کوٹھری نما کمرے میں گزرنے لگے تھے، عائشہ کرم دین کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق تینوں وقت کا کھانا کمرے کے دروازے پر رکھ آتی اور دروازے پر ہلکی سی دستک کر دیتی تاکہ کرم دین کو معلوم ہو جائے کہ وہاں کھانا رکھ دیا گیا ہے، اس نے کرم دین کو کبھی کھانا اٹھاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، وہ جب بھی کھانا رکھنے جاتی وہاں پہلے والے خالی برتن کمرے سے باہر پڑے ہوتے، وہ انہیں اٹھا لاتی اور کھانا وہاں رکھ آتی۔

جب سے کرم دین نے خود کو کمرے میں قید کیا تھا، عائشہ نے اس کی شکل تک نہیں دیکھی تھی، اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کب کمرے سے نکل کر باہر آتا تھا اور کب حاجات سے فارغ ہونے کے بعد وضو کر کے کمرے میں جا گھستا تھا۔ شام ہوتے ہی عائشہ تمام کام نمٹا کر اپنے کمرے میں جا لیٹتی تھی، وہ دونوں چھوٹے بچوں کو سینے سے چمٹا کر لیٹ جاتی اور دونوں بڑے بچوں کو پاس ہی دوسری چارپائی پر لٹا کر احتیاط سے کنڈی لگا لیتی، جب تک اس کی آنکھ نہ لگ جاتی، اسے ڈر محسوس ہوتا رہتا، پھر وہ خود کو تسلی دے لیتی کہ اس کا شوہر اسی گھر میں موجود ہے، فکر کی کیا ضرورت ہے، یہ سوچ کر اسے کچھ حوصلہ مل جاتا اور سکون سے سو جاتی۔

وہ روز کی طرح بچوں کو ساتھ چمٹائے سو رہی تھی کہ کمرے کے دروازے کی کنڈی کھٹکنے لگی، دروازہ کھٹکنے کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی، اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا، وہ اس خیال سے خاموشی سے لیٹی رہی کہ شاید یہ اس کا وہم ہو، مگر یہ وہم نہیں تھا، کنڈی کھٹکنے کی آواز پھر سے اس کے کانوں سے ٹکرائی تھی، وہ یہ سوچ کر کہ یہ کرم دین ہی ہوگا، آواز دینے سے کہیں بچوں کی آنکھ نہ کھل جائے، آہستہ سے چارپائی سے اٹھی اور کنڈی کھول دی۔ دروازہ کھلتے ہی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اس کے بدن کو چھوتا ہوا گزر گیا، دروازے پر کوئی بھی موجود نہ تھا، اس نے اپنی تسلی کے لیے ڈرتے ڈرتے ادھر ادھر نظر دوڑائی مگر اسے کہیں کوئی دکھائی نہ دیا، اس لیے اس نے اپنا وہم جان کر کنڈی بند کر دی، مگر اسے یوں محسوس ہوا جیسے دروازہ بند کرتے ہوئے کوئی ہیولا سا کمرے میں داخل ہوا تھا، اسے ہیولا بھی ایک وہم لگا تھا مگر اس نے کمرے کا بلب جلا کر اپنی تسلی کر لی اور پھر خاموشی سے اپنی چارپائی پر لیٹ گئی، کمرے میں کچھ بھی نہیں تھا مگر پھر بھی اسے ڈر محسوس ہونے لگا تھا، اس لیے اس نے اپنے دونوں بچوں کو کھینچ کر زور سے اپنے سینے سے لگا لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

☆☆☆☆☆

پچھلی رات کی طرح آج بھی وہ ڈر کر اٹھ بیٹھی تھی، کمرے میں مکمل اندھیرا تھا، اس لیے اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا، اس نے آنکھیں

پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی مگر کامیابی حاصل نہ ہوئی، گو کہ کمرے میں کوئی غیر معمولی چیز دیکھنے میں نہیں آ رہی تھی مگر اس کے باوجود اس کا خوف بڑھتا جا رہا تھا، بچے سو رہے تھے لائٹ جلانے سے ان کی آنکھ کھل سکتی تھی لیکن لائٹ جلائے بغیر تسلی بھی نہیں ہو سکتی تھی، وہ خوف کی وجہ سے بری طرح کانپ رہی تھی، مگر اس کے باوجود اس نے ہمت کی اور ڈرتے ڈرتے کمرے کا بلب جلا دیا، اس کا خیال تھا کہ جیسے ہی بلب روشن ہوگا کوئی اسے دبوچ لے گا مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا، کمرے کی ہر چیز اپنی جگہ موجود تھی، دروازے کی کنڈی لگی ہوئی تھی اور کسی بھی جگہ سے ایسا دکھائی نہیں دے رہا تھا کہ کوئی کمرے سے باہر گیا ہو یا کمرے میں آیا ہو۔

ایک رات قبل بھی وہ اسی کیفیت سے گزری تھی اور آج پھر وہ ڈر رہی تھی، کرم دین کمرے میں لیٹا ہوتا تھا تو اس قسم کا کوئی بھی ڈر یا خوف اس پر کبھی طاری نہیں ہوا تھا اور وہ ہمیشہ بے خوف ہو کر سوئی تھی۔ اب کرم دین نہ جانے کن راستوں پر چل نکلا تھا کہ اس کی ہر رات پریشانی میں گزر رہی تھی، اس نے اچھی طرح تسلی کر لی اور واپس اپنی چارپائی پر آ کر لیٹ گئی، بلب جلنے سے سبھی بچوں نے کروٹ بدلی تھی مگر پھر سکون سے سو گئے تھے، کمرے میں روشنی ہونے کے باوجود بچے سکون سے سوئے ہوئے تھے اس لیے اس نے بلب جلتا رہنے دیا تھا، وہ کچھ دیر تک مختلف قرآنی آیات کا ورد کرتی رہی جس کی وجہ سے اسے کافی حد تک سکون محسوس ہونے لگا، پھر کچھ ہی دیر بعد اس کی آنکھ لگ گئی۔

کرم دین کے گھر سے نہ نکلنے کی وجہ سے محلے میں طرح طرح کی باتیں ہونے لگی تھیں، جہاں محلے کے چند افراد اکٹھے ہوتے وہیں اس کے متعلق بات ہونے لگتی، کرم دین کے بارے میں ایسی ایسی کہانیاں جنم لینے لگی تھیں، جن کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا، عائشہ یوں بھی خاموش طبیعت کی مالک تھی، نہ اس نے کسی سے کوئی بات کی تھی اور نہ ہی کسی نے اس سے کرم دین کے بارے میں دریافت کیا تھا۔

''کرم دین کہیں گیا ہوا ہے کیا؟'' چاچی خیری نے عائشہ سے رازداری کے ساتھ دریافت کیا۔

''اس نے کہاں جانا ہے چاچی..... یہیں ہے وہ.....'' عائشہ نے مختصر سا جواب دیا۔

عائشہ کے جواب سے چاچی کی تسلی نہیں ہوئی تھی، اس لیے تفصیل جاننے کے لیے اس نے ایک اور سوال کر ڈالا..... ''مگر ہے کہاں؟ باہر کہیں نظر تو نہیں آیا۔''

''کہیں نہیں گیا چاچی گھر میں ہی ہے''

''لیکن اتنے دنوں سے گھر میں پڑا کیا کر رہا ہے وہ؟'' چاچی نے حیران ہو کر سوال کیا۔

''چاچی تم تو جانتی ہی ہو..... میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا وہ ہے تو گھر میں ہی، مگر اس نے کسی کو بتانے سے منع کیا ہوا ہے..... اصل میں پچھلے کچھ دنوں سے وہ کمرے میں بیٹھا کچھ عملیات کر رہا ہے'' عائشہ نے چاچی کے سوال کی اچھی طرح وضاحت کی۔

''مگر یہ اور کتنے دن تک یوں کمرے میں گھسا بیٹھا رہے گا؟''

''یہ تو میں نہیں جانتی کرم دین کی عادت سے تو تم اچھی طرح واقف ہو، وہ اپنے کاموں میں کسی اور کی مداخلت کہاں برداشت کرتا ہے۔''

''ہاں کہتی تو تم ٹھیک ہو.....'' یہ کہتے ہوئے چاچی اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر آہستہ سے بولی ''مجھے کرم دین کی فکر ہو رہی تھی، اس لیے چلی آئی، ورنہ تم جانتی ہی ہو، میں کسی کے معاملات میں دخل نہیں دیتی۔'' چاچی نے بات کرتے ہوئے برقعہ سنبھالا اور برقعے کو جھاڑ کر پہنتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔

تھوڑی ہی دیر میں چاچی نے بہت سی معلومات اکٹھی کر لی تھیں، اس لیے اب وہ ان معلومات کو مرچ مصالحہ لگا کر محلے کے ہر گھر میں پہنچا دینا چاہتی تھی، عائشہ کے گھر سے نکل کر اس نے اپنے گھر جانے کی بجائے ایسے گھروں کا رخ کیا تھا جہاں بات کرنے کا اس لیے بھی بہت مزا آتا تھا کہ وہ لوگ نہ صرف پوری توجہ سے بات سنتے تھے بلکہ اس میں اپنی طرف سے بھی کچھ اضافوں کے ساتھ جلد از جلد دوسروں تک پہنچا دیتے تھے۔

بستی والوں کو اس بات کی بہت فکر تھی کہ کرم دین بستی میں دکھائی کیوں نہیں دیتا تھا مگر اب انہیں اس کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی فکر لگ گئی تھی کہ وہ گھر میں بیٹھا کس قسم کے عملیات کر رہا تھا اور وہ جو عملیات کر رہا تھا، اس میں اسے کس حد تک کامیابی حاصل ہوئی تھی۔

کتنے ہی دن گزر گئے تھے عائشہ نے کرم دین کی شکل نہیں دیکھی تھی اور نہ ہی وہ اس سے کوئی بات ہی کر پائی تھی، اسے دیکھنے اور بات کرنے کو عائشہ کا دل تو بہت چاہ رہا تھا مگر کرم دین نے سختی سے منع کر رکھا تھا اس لیے وہ اپنا سا منہ لے کر رہ جاتی، وہ شام ہوتے ہی کرم دین کا کھانا اس کے کمرے کے دروازے پر رکھ آتی اور پھر بچوں کو کھانا کھلانے کے بعد خود کھاتی اور بچوں کو لے کر کمرے میں جا لیٹتی۔

وہ روز کی طرح کرم دین کے لیے کھانا رکھتے ہوئے خالی برتن اٹھا کر واپس آنے لگی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ خالی برتنوں کے اوپر ہی کاغذ کا ایک ٹکڑا بھی رکھا ہوا تھا، اس نے جلدی سے برتن زمین پر رکھ دیے اور کاغذ کے ٹکڑے کو کھول کر دھڑکتے دل کے ساتھ پڑھنے لگی۔ یہ کرم دین کے ہاتھوں سے لکھی ہوئی تحریر تھی جس میں اس نے صرف اتنا لکھا تھا ''میں نے اپنا پہلا وظیفہ مکمل کر لیا ہے''۔

عائشہ نے کرم دین کا رقعہ لپیٹ کر ہاتھ میں سنبھال لیا اور برتن اٹھا کر واپس کمرے میں آ گئی، وہ نہیں جانتی تھی کہ اس نے کون سا وظیفہ مکمل کیا تھا لیکن وہ اس بات پر ہی خوش تھی کہ کرم دین نے کاغذ کے ٹکڑے پر لکھے ہوئے چند لفظوں کے ذریعے اس سے بات کی ہے، اس نے لیٹتے ہی اپنے چھوٹے بیٹے کو سینے سے چمٹا لیا اور کرم دین کے متعلق سوچتے ہوئے سو گئی۔

ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ جس بچے کو اس نے اپنے سینے سے چمٹا رکھا تھا، وہ تڑپنے لگا، عائشہ نے یہ سوچ کر کہ وہ سوتے ہوئے ڈر گیا ہوگا، اسے اچھی طرح اپنے سینے سے لگا لیا مگر بچہ اس بکرے کی طرح تڑپ رہا تھا جسے قربان کیا جا رہا ہو، وہ بچے کو سینے سے چمٹائے لیٹی رہی مگر اس کا تڑپنا بند نہیں ہوا تھا۔

جیسے ہی عائشہ کا ہاتھ بچے کی گردن پر لگا، اسے یوں محسوس ہوا جیسے گرم گرم پانی جیسی کوئی چیز اس کے ہاتھوں سے لگی ہو، ایک لمحے کے لیے اسے کچھ سمجھ نہ لگی، پھر یہ جاننے کے لیے کہ اس کے ہاتھوں سے کیا چیز لگی تھی اس نے جلدی سے اٹھ کر کمرے کی لائٹ جلا دی، بلب روشن ہوتے ہی جیسے ہی اس کی نظر اپنے ہاتھوں پر پڑی تو ہاتھوں میں لگا خون دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی اور وہ بچے کی حالت دیکھنے کے لیے تیزی سے اس کی طرف دوڑی، بچے کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی، اس کی گردن سے بہت سا خون نکل کر چارپائی پر بچھی ہوئی چادر کو سرخ کر چکا تھا، اور مزید خون اس کی گردن سے بہہ رہا تھا۔

عائشہ نے بچے کو اپنی بانہوں میں اٹھا لیا اور دروازہ کھول کر کرم دین کے کمرے کی طرف دوڑ لگا دی، کمرے کا بلب جلنے اور عائشہ کے چیخنے سے وہاں سوئے ہوئے تینوں بچے بھی اٹھ بیٹھے تھے اور انہوں نے بھائی کو اپنی بانہوں میں اٹھائے ماں کو جاتے ہوئے بھی دیکھ لیا تھا، اس لیے وہ بھی ماں کے پیچھے ہی دوڑ پڑے۔

رات کی تاریکی میں اپنے کمرے سے نکل کر گھر کے دوسرے کونے میں جانا عائشہ کے لیے کسی بھی صورت میں ممکن نہیں تھا، لیکن معصوم بیٹے کی محبت نے اس کے دل کے سبھی خوف اور ڈر ختم کر کے رکھ دیے تھے، دوسرے بچے بھی اس کے پیچھے پیچھے دوڑے چلے آ رہے تھے، ان کے قدموں کی آواز عائشہ کے کانوں میں پڑ رہی تھی، وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ بچے بھی اس کے پیچھے دوڑے چلے آ رہے ہیں مگر اس کے باوجود اس نے ایک بار بھی مڑ کر نہیں دیکھا تھا کہ اس کے پیچھے کون ہے۔

ماں کو اپنے بچے کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا، اس کی گردن سے مسلسل خون بہہ رہا تھا، بچے کی گردن سے بہنے والے خون نے عائشہ کو تڑپا رکھا تھا، کرم دین کے کمرے کے سامنے پہنچتے ہی عائشہ نے پورے زور سے دروازہ پیٹ ڈالا، اس نے دروازے کو اس قدر زور سے پیٹا تھا کہ اس کی آواز دور دور تک گئی تھی، مگر کمرے کے اندر مکمل خاموشی تھی، عائشہ نے انتظار کیے بغیر پھر سے دروازہ پیٹا لیکن کرم دین کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔

وہ دروازے پر مسلسل زور زور سے ہاتھ مار رہی تھی جس کی وجہ سے اس کی کلائیوں میں پہنی ہوئی چوڑیاں بھی ٹوٹ کر زمین پر بکھر رہی تھیں، کچھ دیر بعد بچے بھی ماں کے ساتھ مل کر دروازہ پیٹنے لگے، کرم دین اس وقت کمرے میں بیٹھا عملیات کر رہا تھا، اس لیے وہ جان بوجھ کر خاموش تھا کیونکہ اس کے بولنے سے اس کے عملیات میں خلل پڑ سکتا تھا، مگر جب دروازے پر ہونے والی ٹھک ٹھک کا سلسلہ ختم نہ ہوا اور ساتھ ہی عائشہ کے رونے اور اسے کوسنے کی آوازیں بھی شامل ہونے لگیں تو اس نے انتہائی غصے کے عالم میں مجبوراً دروازہ کھول دیا۔

''کون سی قیامت ٹوٹ پڑی ہے، جو اس وقت یہاں شور مچا رکھا ہے.....؟'' دروازہ کھلتے ہی کرم دین برس پڑا۔

''ایک ماں کے لیے تو قیامت ہی ٹوٹ پڑی ہے۔''

''میں نے تم سے کہا بھی تھا..... خواہ کچھ بھی ہو جائے مجھے مت بلانا۔''

''معاملہ اولاد کا نہ ہوتا تو شائد میں بھی تمہیں کبھی تنگ نہ کرتی۔''

''ایسا کیا ہو گیا ہے؟''

''یہ دیکھو..... اس کی گردن سے خون بہہ رہا ہے جیسے کسی نے اس کی گردن ہی کاٹ دی ہو.....'' عائشہ نے روتے ہوئے بات کی اور بانہوں

میں لیا ہوا بچہ آگے کر دیا۔

کرم دین نے ابھی تک کمرے کا بلب نہیں جلایا تھا، صحن میں بھی اندھیرا ہی تھا، یوں وہ سبھی اندھیرے میں کھڑے باتیں کر رہے تھے اور ان کو ایک دوسرے کے سائے ہی دکھائی دے رہے تھے۔

''اسے اندر لے آؤ.....'' کرم دین نے بلب کا سوئچ دباتے ہوئے کہا۔

جیسے ہی کمرے میں جلنے والے بلب کی روشنی بچے پر پڑی تو عائشہ کی چیخ نکل گئی..... ''میرے بچے کا سر کہاں گیا.....؟'' عائشہ نے چیختے ہوئے کہا۔

عائشہ کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ بچے کا سر تن سے جدا ہو چکا تھا، اس نے تو محض گردن سے نکلنے والا خون دیکھا تھا اور اسی لمحے وہ اسے بانہوں میں اٹھا کر دوڑ پڑی تھی، اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ بچے کا دھڑ اٹھا لائی تھی یا گرا اٹھاتے وقت سر تن کے ساتھ تھا تو وہ کہیں راستے میں ہی گرا آئی تھی، وہ پریشانی کے عالم میں محض یہ سوچ کر دوڑ پڑی تھی کہ کسی طرح کرم دین سے کہہ کر اس کی پٹی کروائی جا سکے، اسے کیا معلوم تھا کہ وہ اتنی دیر سے اپنے بچے کی لاش اٹھائے کھڑی تھی۔ اس نے بغیر سر کے بچے کی لاش کو اس قدر زور سے سینے سے چمٹا لیا کہ اگر اس کی گرفت ذرا سی بھی کمزور ہوئی تو کہیں کوئی اس سے لاش ہی نہ چھین لے، وہ دھاڑیں مار رہی تھی، اسے دیکھ کر بچے بھی رونے لگے تھے، اتنے میں کرم دین کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''یہ سب کیا ہے عائشہ؟''

''یہ ہمارے بچے کی لاش ہے کرم دین اور یہ سب تمہارے عملیات کا نتیجہ ہے''

''زیادہ چلانے کی ضرورت نہیں، ورنہ ابھی تھوڑی ہی دیر میں محلے کے لوگ یہاں آ جمع ہوں گے میرے ساتھ چلو اور پہلے اس کا کٹا ہوا سر تلاش کرو۔'' کرم دین ابھی بات کر رہا تھا کہ بجلی چلی گئی ''اسے بھی ابھی بند ہونا تھا۔'' کرم دین نے غصے سے کہا اور وہاں سے ٹارچ اٹھالی اور اسے جلا کر چلتے ہوئے بولا ''آؤ جلدی سے میرے ساتھ آؤ۔''

ہاتھ میں ٹارچ لیے کرم دین آگے آگے تھا اور بچے کی سر کٹی لاش کندھے سے لگائے عائشہ اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی، دوسرے بچے بھی ڈرے سہمے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ان کے پیچھے پیچھے تھے، وہ سبھی اس کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں کچھ دیر پہلے تک وہ سو رہے تھے، ٹارچ کی روشنی میں بچے کی گردن سے نکلنے والی خون کی لکیر صاف دکھائی دے رہی تھی، وہ کمرے کے دروازے پر آ پہنچے تھے مگر انہیں کہیں بھی بچے کا کٹا ہوا سر دکھائی نہیں دیا تھا۔

عائشہ اور بچے کرم دین کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کمرے کے دروازے تک تو آ گئے تھے مگر اب دروازہ کھول کر اندر جانے کی ہمت کسی میں بھی نہیں پڑ رہی تھی، کرم دین نے ہاتھ کے زور سے دروازے کو اندر کی طرف دھکیل دیا، کمرے میں مکمل اندھیرا تھا لیکن جس کونے میں بھی ٹارچ کی روشنی پڑتی وہ جگہ صاف دکھائی دینے لگتی تھی، جیسے ہی ٹارچ کی لائٹ اس چارپائی پر پڑی جہاں عائشہ بچے کے ساتھ لیٹی تھی، بستر کی چادر خون سے سرخ ہو رہی تھی اور وہیں بچے کا کٹا ہوا سر پڑا تھا۔

''اسے کہیں تم نے تو.....؟'' کرم دین نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

عائشہ، کرم دین کی ادھوری بات کا مطلب بھی پوری طرح سمجھ گئی تھی، اس لیے فوراً چیخی ''میں تو کیا۔ دنیا کی کوئی بھی ماں اتنی ظالم نہیں ہو سکتی، جو اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے پھول جیسے بچے کا سر تن سے جدا کر دے ہو نہ ہو یہ سب تمہارے وظیفوں اور عملیات کی وجہ سے ہوا ہے، کیونکہ ڈر تو ہمیں کچھ روز پہلے سے ہی لگنے لگا تھا''

کرم دین کو پہلے سے ہی بتا دیا گیا تھا کہ جیسے جیسے اس کے عملیات پورے ہوتے جائیں گے، اسے کسی بھی قسم کا نقصان پہنچ سکتا ہے، اس لیے اس نے اس بات کو مزید کریدنے کی بجائے بہتر یہی جانا کہ خاموشی اختیار کر لی جائے اور اس سے پہلے کہ محلے دار وہاں آ دھمکیں، ہر چیز سے اس بات کے نشان مٹا دیے جائیں جن سے یہ ظاہر ہو کہ بچے کو کسی وجہ سے قتل کر دیا گیا تھا، عائشہ سہم کر ایک طرف چارپائی پر بیٹھ گئی تھی، بچے بھی ڈر اور خوف کے مارے اس سے چمٹ گئے تھے، کچھ ہی دیر بعد لائٹ بھی آ گئی اور کمرہ روشن ہو گیا۔

روشنی ہوتے ہی کرم دین جلدی سے بستر کی چادر تبدیل کرنے لگا، اس کام سے فارغ ہوتے ہی اس نے صحن میں بننے والی خون کی لکیر کو بھی اچھی طرح صاف کر دیا، یوں تھوڑی ہی دیر میں وہ تمام ثبوت مٹا دیے گئے جن سے بچے کے بارے میں کسی قسم کا سوال اٹھ سکتا تھا، بچے کو بے

دردی سے قتل کیے جانے پر عائشہ مکمل طور پر دہشت زدہ تھی جبکہ کرم دین پرسکون تھا، کیونکہ وہ بابا سائیں کی بتائی ہوئی باتوں کی وجہ سے مطمئن تھا اور بچے کے قتل کی صورت میں نقصان ہونے کو اپنی کامیابی کی نشانی سمجھ کر دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔

عائشہ کے حلق سے نکلنے والی چیخیں محلے والوں کے کانوں میں رات کو ہی پڑ گئی تھیں، اس لیے وہ صبح ہوتے ہی ان چیخوں کا سبب جاننے کے لیے کرم دین کے ہاں پہنچنا شروع ہو گئے تھے۔ کرم دین کے ہاں آنے والوں میں چاچی خیری سب سے پہلے پہنچی تھی، عائشہ کے چیخنے کی آوازیں رات کو ہی اس کے کانوں میں پڑ گئی تھیں اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اسی وقت کرم دین کے ہاں جا کر چیخوں کا سبب جان لے، لیکن کچھ رات کی تاریکی اور کچھ بہو کے ڈر نے اسے ایسا کرنے سے روکے رکھا تھا، مگر جیسے ہی صبح ہوئی اس نے برقعہ اٹھایا اور کرم دین کے ہاں پہنچ گئی۔

محلے کے لوگ ایک دوسرے سے اس قدر جڑے ہوئے تھے کہ ایک دوسرے کی ذرا سی تکلیف کا سن کر بھی فوراً پہنچ جاتے، کرم دین نے عائشہ کو خاموش کروا دیا تھا، ورنہ وہ ایک دو بار اور چیختی تو محلے کے لوگ اسی وقت اپنے اپنے بستر چھوڑ کر وہاں آ جمع ہوتے، مگر جس کسی کے کانوں میں بھی چیخوں کی آواز پڑی تھی وہ خیریت جاننے کے لیے آ گیا تھا، کرم دین کے ہاں آنے والوں کی زیادہ تعداد مردوں کی تھی، چاچی خیری نے آتے ہوئے کچھ اور خواتین کو بھی ساتھ لے لیا تھا۔

''خیر تو تھی عائشہ! رات کو تمہارے چیخنے کی آوازیں کیوں آ رہی تھیں؟'' چاچی خیری نے برقعہ اتار کر ہاتھوں میں پکڑتے ہوئے سوال کیا۔

عائشہ جواب تک سر جھکائے چارپائی پر بیٹھی تھی، پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، اسے روتے ہوئے دیکھ کر چاچی خیری تڑپ اٹھی اور جلدی سے اس کے پاس جا بیٹھی پھر اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی ''کیا ہوا میری بچی تو اس طرح کیوں رو رہی ہے؟''

''میرا عامر مر گیا چاچی۔'' عائشہ نے روتے ہوئے بتایا۔

''ہائے..... ہائے..... ہائے..... یہ کیسے ہو گیا؟'' چاچی نے اپنے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے دریافت کیا۔

''رات کو اچھا بھلا سویا تھا چاچی..... بس ایک دو بار خون کی الٹیاں کیں اور پھر کچھ دیر میں ہی میرے ہاتھوں میں ٹھنڈا ہو گیا''

عائشہ کی بات سن کر محلے کی عورتیں رونے پیٹنے لگی تھیں، کچھ ہی دیر بعد محلے میں بچے کی موت کی خبر پہنچ گئی تھی، بچے کی موت کا اعلان مسجد میں بھی کروا دیا گیا تھا مگر اعلان سے پہلے ہی دور و نزدیک یہ خبر پھیل چکی تھی۔

بچے کے غسل سے لے کر کفن دفن تک کے تمام معاملات کرم دین نے خود اپنے ہاتھوں انجام دیے تھے، کیونکہ اسے ڈر تھا کہ کہیں کسی وجہ سے بچے کی موت کی اصل حقیقت محلے والوں کی نظر میں نہ آ جائے، جب تک بچے کو قبر میں اتار کر اس کی قبر نہ بنا دی گئی، اس وقت تک کرم دین پریشان رہا مگر جب تمام معاملات بخیر و خوبی انجام پا گئے تو اس نے سکھ کا سانس لیا۔

☆☆☆☆☆

بچے کی موت نے کرم دین کے سارے پروگرام خاک میں ملا دیے تھے، وہ جلد از جلد تمام وظائف اور عملیات ختم کر کے اپنا چلہ پورا کرنا چاہتا تھا، مگر بچے کی وجہ سے اسے اپنے عملیات ادھورے چھوڑ کر اٹھنا پڑا تھا، اس نے بابا سائیں کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ذرا سی کامیابی حاصل کر لی تھی مگر اب اسے پھر سے عملیات کا آغاز کرنا تھا لیکن عائشہ اسے ایسا کرنے سے منع کر رہی تھی۔ کرم دین کو یہ کہاں برداشت تھا کہ کوئی بھی اس کی کامیابیوں کی راہ میں روڑے اٹکائے، وہ کچھ روز تک انتہائی نرمی سے عائشہ کو قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا، مگر جب بات بنتی دکھائی نہ دی تو سختی پر اتر آیا۔

''جو ہونا تھا وہ ہو گیا..... تم یہ مت سوچو کہ میں اپنے ارادوں سے باز آ جاؤں گا کیونکہ میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا اور ویسے بھی اگر کسی ڈر یا خوف کی وجہ سے مجھے یہ کام نہ کرنا ہوتا تو میں یہ سلسلہ شروع ہی نہ کرتا۔'' کرم دین نے عائشہ کو سمجھاتے ہوئے اپنا مدعا بیان کیا۔

''ان چیزوں سے تمہیں کیا ملے گا کرم دین؟ ایک بچہ تو ہم گنوا بیٹھے ہیں، اور میں بھی کسی نہ کسی طرح صبر کر گئی ہوں اب تو اپنے ارادوں سے باز آ جاؤ''

''عائشہ! میری ایک بات یاد رکھنا..... مجھے دولت چاہیے۔ میں گھٹ گھٹ کر بہت جی لیا، اب اور جیا نہیں جاتا۔''

عائشہ جان چکی تھی کہ اب کرم دین کسی بھی طرح اس کی بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہو گا اور نہ ہی وہ زبردستی اس سے اپنی بات منوا پائے گی، پھر بھی اسے سمجھانے لگی ''کرم دین اگر تم یہ سب کرنا ہی چاہتے ہو تو چلو ایسا کر لو، اسی کمرے کے کسی کونے میں چادر تان کر بیٹھ جاؤ ہم میں سے

کوئی بھی تمہیں تنگ نہیں کرے گا، کم از کم اس طرح ہمیں تسلی رہے گی کہ تم ہمارے پاس ہی ہو۔"

"عائشہ! اپنے مشورے بس یہیں ختم کرو اور اسی کمرے کی جھاڑ پونچ کر دو میں آج ہی سے اپنا کام شروع کر دینا چاہتا ہوں" کرم دین نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔

کرم دین کا دوٹوک فیصلہ سن کر عائشہ خاموش ہوگئی اور اس کی ہدایات کے مطابق کمرے کی صفائی کے بعد وہاں بچھی ہوئی چادریں وغیرہ تبدیل کر دیں۔

بابا سائیں کے کہنے کے مطابق کرم دین نے یہ طریقہ اختیار کر رکھا تھا کہ وہ دن کے وقت آرام کرتا اور رات کی تاریکی میں خاموشی سے اپنے کمرے میں بیٹھا وظائف کرتا رہتا تھا۔ شام کو کھانا کھانے کے بعد وہ عائشہ کو اپنی بتائی ہوئی نصیحتوں پر سختی سے عمل کرنے کا کہہ کر حجرے میں آ بیٹھا تھا، اس نے کمرے کے تمام بلب بند کر دیے اور ہاتھ میں تسبیح لیے کچھ پڑھنے لگا، ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ کمرے میں آواز گونجی "تم پھر سے آ بیٹھے۔"

کمرے میں اچانک گونجنے والی آواز سے کرم دین کانپ کر رہ گیا تھا مگر اس نے خود کو مضبوط کیا اور ذرا سے وقفے کے بعد پھر سے کچھ پڑھتے ہوئے تسبیح گھمانے لگا۔

"ایک بچہ مروانے کے بعد بھی تم نے کوئی نصیحت نہیں پکڑی۔" وہی آواز پھر سے کرم دین کے کانوں سے ٹکرائی۔

گو کہ کرم دین ایک بار پھر سے ڈر گیا تھا مگر اب اس نے پاس پڑی ہوئی روئی اٹھا کر اپنے دونوں کانوں میں ٹھونس لی تھی تاکہ نہ اس طرح کی آوازیں اسے سنائی دیں گی اور نہ ہی وہ کسی خلل کا شکار ہوگا، کرم دین کے اس عمل کے بعد کوئی آواز اس کے کانوں میں نہ پڑی اور وہ اپنے عملیات میں مشغول رہا، پھر ایک ایک کر کے دن گزرنے لگے، ڈری سہمی عائشہ اپنے بچوں کو ساتھ چمٹائے کبھی سوتے کبھی جاگتے رات گزار دیتی اور کرم دین اپنے حجرے میں قید، چلہ کاٹتے ہوئے رات بتا دیتا۔

☆☆☆☆☆

ایک بچہ گنوانے کے بعد عائشہ بہت سہم گئی تھی، وہ ہر پل ڈری سہمی رہنے لگی تھی جبکہ کرم دین نے اس واقعہ کا ذرا سی بھی اثر نہیں لیا تھا، اب عائشہ ایک پل کے لیے بھی بچوں کو اپنی نظروں سے دور نہیں ہونے دیتی تھی، اس نے بچوں کو گلی میں جانے سے بھی منع کر دیا تھا، اسے جب بھی کوئی ذرا سا بھی شک ہوتا یا خطرے کی بو محسوس ہوتی، وہ تینوں بچوں کو بلا کر اپنے پاس بٹھا لیتی اور اس وقت تک اپنے سینے سے لگائے بیٹھی رہتی جب تک خطرہ ٹل نہ جاتا، بچے ابھی تک اس بات سے لاعلم تھے کہ انہیں گلی میں کھیلنے سے کیوں روکا گیا ہے اور گھر میں کھیلتے ہوئے بھی ان کی نگرانی کیوں کی جاتی ہے، انہوں نے محض ماں کا حکم جان کر خاموشی سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔

شام کا وقت تھا عمر، حاجرہ اور ماجدہ صحن میں کھیل رہے تھے، عائشہ چارپائی پر بیٹھی سبزی بنا رہی تھی اور ساتھ ہی بچوں کی نگرانی بھی کر رہی تھی، اچانک حاجرہ ایک جگہ پر رک گئی، بظاہر یہ معمولی سی بات تھی لیکن عائشہ کے ذہن میں گھنٹیاں بج اٹھی تھیں، وہ انہیں اپنے پاس بلانے ہی والی تھی کہ حاجرہ کی ایڑھیاں اٹھ گئیں اور اس کا سارا وزن پاؤں کے پنجوں پر آ گیا، ایسا محسوس ہو رہا تھا، جیسے کوئی اسے بالوں سے پکڑ کر اوپر کھینچ رہا تھا، عائشہ نے حاجرہ کی یہ حالت دیکھی تو فوراً چارپائی سے چھلانگ لگائی اور جوتا پہنے بغیر اس کی مدد کے لیے دوڑ پڑی۔

عائشہ بجلی کی سی تیزی سے حاجرہ کے پاس پہنچی تھی مگر تب تک حاجرہ کا جسم دو اڑھائی فٹ اوپر اٹھ چکا تھا، عمر اور ماجدہ ڈر کر ایک دوسرے کے ساتھ چمٹ گئے تھے، عائشہ نے لپک کر حاجرہ کی ٹانگوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا تھا، اس کے باوجود کوئی ان دیکھی طاقت اسے اوپر اٹھائے جا رہی تھی، خوف کے مارے عائشہ کا پورا جسم بری طرح کانپ رہا تھا، ایسا لگ رہا تھا کوئی طاقت حاجرہ کے ساتھ ساتھ اسے بھی اٹھائے لے جا رہی تھی، اس کے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں جواب دے گئی تھیں، اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

عائشہ نے سن رکھا تھا کہ اگر کسی مشکل گھڑی میں سورہ یاسین پڑھی جائے تو خدا کے فضل و کرم سے وہ مشکل گھڑی ٹل جاتی ہے، یہ خیال آتے ہی اس نے خدا کو یاد کیا اور سورہ یاسین پڑھنے لگی، سورہ یاسین کا پڑھنا تھا کہ انہیں زمین پر پٹخ دیا گیا، عائشہ پہلے زمین پر گری تھی پھر حاجرہ بھی اس کے اوپر ہی گر پڑی، عائشہ کے سر اور کمر میں چوٹ آئی تھی جبکہ حاجرہ مکمل طور پر محفوظ رہی تھی۔

عائشہ نے اپنی چوٹ بھول کر بیٹی کو گلے لگا لیا اور وہیں بیٹھی رونے لگی۔ عمر اور ماجدہ ابھی تک پاس ہی ایک دوسرے سے چمٹے سہمے کھڑے تھے، ماں اور بہن کو روتے دیکھ کر وہ بھی ماں کے گلے لگ کر رونے لگے تھے، ان چاروں کے رونے کی آواز کرم دین نے بھی سن لی تھی مگر وہ

کمرے سے باہر نہیں آیا تھا، کچھ دیر تک وہ چاروں وہیں فرش پر ہی بیٹھے ایک دوسرے کے گلے لگ کر روتے رہے، پھر جب آنسو تھمے تو عائشہ وہاں سے اٹھی اور بچوں کو ساتھ لیے چارپائی پر جا لیٹی۔

چوٹ لگنے سے عائشہ کی کمر اور سر میں شدید تکلیف محسوس ہو رہی تھی، ماں کو تکلیف میں دیکھ کر تینوں بہن بھائی اس کا جسم دبانے لگے، حاجرہ سر دبا رہی تھی جبکہ عمر اور ماجدہ کمر اور ٹانگیں دبا رہے تھے۔

''امی خون!'' حاجرہ نے ہاتھوں میں لگا خون دیکھ کر ڈرتے ہوئے کہا۔

حاجرہ کے منہ سے خون کا سن کر عائشہ بھی جلدی سے اٹھ بیٹھی اور اس کے ہاتھوں میں لگے خون کو دیکھنے لگی۔

''امی! یہ دیکھو سرہانے پر بھی خون لگا ہوا ہے'' عمر نے سرہانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''لگتا ہے سر پھٹ گیا ہے، جس کی وجہ سے خون بہہ رہا ہے'' عائشہ نے سرہانے پر لگے خون کو دیکھ کر بات کی۔

وہ ابھی باتیں کر رہے تھے کہ ماجدہ نے باپ کے کمرے کا دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔

''ابو! دروازہ کھولو..... ابو..... ابو..... ابو دروازہ کھولو..... امی کے سر سے خون بہہ رہا ہے..... ابو جلدی سے آ کر دیکھو..... ابو..... ابو میری بات سن رہے ہو کہ نہیں..... خدا کے لیے جلدی دروازہ کھولو ابو.....'' ماجدہ نے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے دروازہ پیٹتے ہوئے رو کر کہا۔

کرم دین کچھ دیر تک دروازہ پیٹے جانے کی آوازیں سن کر برداشت کرتا رہا پھر ایک جھٹکے کے ساتھ دروازہ کھول کر چیخا۔ ''کیوں شور مچا رہے ہو؟'' کرم دین جس قدر چیخ کر بولا تھا، اس سے ماجدہ سہم گئی، پھر بھی ماں کی طرف ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

''وہ دیکھو ابو! امی کے سر سے کتنا خون بہہ رہا ہے''

''خون بہہ رہا ہے تو ڈاکٹر کے پاس جاؤ۔'' مجھے کیوں تنگ کر رہے ہو؟'' کرم دین نے انتہائی غصے کے عالم میں بات کی اور زور سے دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈی لگا لی۔

کرم دین اس قدر غصے سے چیخا تھا کہ ماجدہ کے آنسو نکل پڑے تھے اور وہ روتی ہوئی ماں کے پاس آ گئی تھی، عائشہ سر پر ہاتھ رکھے چارپائی پر لیٹی سب کچھ دیکھ رہی تھی، اس نے ماجدہ کو اپنے پاس بٹھا لیا اور اسے پیار سے بہلانے لگی، اس کے تسلی دینے سے تھوڑی ہی دیر بعد ماجدہ بہل گئی اور اپنے ہاتھوں سے آنسو صاف کر لیے۔

ماجدہ کے دروازہ کھٹکھٹانے اور زور زور سے آوازیں دینے پر کرم دین کو مجبوراً دروازہ کھولنا پڑا تھا اور پھر وہ ماجدہ کو ڈانٹ کر دوبارہ کمرے میں چلا گیا تھا، کچھ دیر بعد غصہ ٹھنڈا ہوا تو وہ سوچنے لگا کہ جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا، اب کم از کم باہر نکل کر دیکھ تو لیا جائے کہ عائشہ کا سر کس وجہ سے پھٹ گیا۔ وہ اپنے حجرے سے باہر آیا تو تینوں بچے باپ کے ڈر سے سہم کر ماں کے پیچھے سمٹ کر بیٹھ گئے۔

''ماجدہ کہہ رہی تھی۔ تمہارے سر سے خون بہہ رہا ہے'' کرم دین نے عائشہ سے دریافت کیا۔

''کچھ بھی نہیں ہوا۔'' کرم دین کی بات سن کر عائشہ نے غصے کو دباتے ہوئے جواب دیا اور چہرہ دوسری طرف کر لیا۔

ماں کی بات سن کر تینوں بچے سمجھ گئے تھے کہ وہ غصے کی وجہ سے جان بوجھ کر ایسا کہہ رہی ہے، مگر کسی بچے میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ آگے بڑھ کر باپ کو حقیقت حال سے آگاہ کرتا، عائشہ کے لہجے کو دیکھ کر کرم دین بھی جان گیا تھا کہ کچھ نہ کچھ ضرور ہے مگر وہ جان بوجھ کر بتانے سے گریز کر رہی ہے۔

''تم تو کہہ رہی تھی، امی کے سر سے بہت خون بہہ رہا ہے، مگر تمہاری ماں تو کہہ رہی ہے کہ کچھ بھی نہیں ہوا'' کرم دین نے صحیح صورت حال جاننے کے لیے ماجدہ سے بات کی۔

''امی جان بوجھ کر آپ کو نہیں بتا رہی۔'' ماجدہ نے ڈرتے ڈرتے بات کی اور پھر سرہانے پر لگا خون دکھاتے ہوئے بولی ''یہ دیکھیں سرہانے پر بھی خون لگا ہوا ہے۔''

''مگر چوٹ لگی کیسے؟'' کرم دین نے حیران ہو کر پوچھا۔

باپ کا سوال سن کر ماجدہ نے تمام تفصیل بیان کر دی، اس کی بات سن کر کرم دین تلخ لہجے میں بولا ''تم لوگ وہ بات کیا کرو جسے عقل تسلیم بھی کر لے۔''

''ابو! اگر یقین نہیں آتا تو ان سے پوچھ لیں۔'' ماجدہ نے عمر اور حاجرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اس سے پہلے کہ کرم دین کچھ کہتا، عائشہ بول پڑی ''تم کن باتوں میں پڑ گئی ہو ماجدہ۔ تمہارا ابو ہماری بات پر کہاں یقین کرے گا۔''

''تم لوگ تو ہر بات کو میرے عملیات اور وظائف سے جوڑ دیتے ہو۔ کیا اس گھر میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے، وہ سب میری وجہ سے ہی ہو رہا ہے؟'' کرم دین نے عائشہ کی بات سن کر غصے میں بات کی، پھر جیب میں سے کچھ روپے نکال کر عائشہ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا ''یہ پیسے لے لو اور جا کر ڈاکٹر سے پٹی کروا لاؤ۔''

عائشہ نے کرم دین کی بات کا کوئی جواب دیا تھا اور نہ ہی جو رقم وہ دے رہا تھا وہی لی تھی، کرم دین نے پیسے اس کے پاس ہی چارپائی پر رکھے اور پھر سے اپنے حجرے میں جا گھسا۔

☆☆☆☆☆

عائشہ اچھی طرح جان چکی تھی کہ کرم دین جن چکروں میں پڑا ہوا ہے، ان کی وجہ سے وہ اور اس کے بچے خطرے میں ہیں، اس لیے اس نے بچوں کی نگرانی اور بھی سخت کر دی تھی، وہ جس عذاب میں مبتلا تھی، اسے اکیلے ہی برداشت کیے جا رہی تھی، اسے کسی پل بھی سکون نصیب نہیں تھا، سوتے جاگتے خطرے کی گھنٹیاں اس کے کانوں میں بجتی رہتیں مگر وہ اس قدر بے بس تھی کہ کسی سے کچھ کہہ سکتی تھی نہ خود ہی کچھ کر سکتی تھی۔

تینوں بچے ایک ہی چارپائی پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے، عائشہ پاس ہی بیٹھی ان کی باتیں سن رہی تھی، باتیں کرتے کرتے حاجرہ اٹھی اور باتھ روم میں چلی گئی، گو کہ یہ معمول کی بات تھی مگر عائشہ کی نظر اس پر لگ گئی، حاجرہ باتھ روم میں چلی گئی تھی لیکن عائشہ کی نظریں مسلسل باتھ روم کے دروازے پر لگی ہوئی تھیں، کچھ دیر بعد وہ باتھ روم سے نکل کر باہر آئی تو عائشہ نے سکھ کا سانس لیا، حاجرہ کے ساتھ پیش آنے والے واقعے سے وہ اس قدر سہم گئی تھی کہ جب تک وہ فارغ ہو کر باتھ روم سے باہر نہیں نکل آئی تھی، عائشہ کی جان سولی پر لٹکی رہی تھی۔

حاجرہ باتھ روم سے نکل کر آ رہی تھی کہ اچانک اس کے چلنے کی رفتار میں تیزی آ گئی، پھر یوں محسوس ہونے لگا جیسے کوئی زبردستی اسے دھکیل رہا ہو، اس لمحے عائشہ کے دماغ پر ہتھوڑے برسنے لگے اور وہ جان گئی کہ کوئی غیر معمولی واقعہ رونما ہونے والا ہے، وہ جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھی تاکہ حاجرہ کو تھام لے مگر اس سے پہلے کہ وہ اس تک پہنچ پاتی، حاجرہ کی رفتار میں اس قدر تیزی آ گئی تھی کہ وہ اڑتی ہوئی سامنے والی دیوار سے جا ٹکرائی، عائشہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے اپنی بانہوں میں اٹھا لیا، حاجرہ کے منہ سے خون نکل رہا تھا اور اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔

''آنکھیں کھولو..... آنکھیں کھولو حاجرہ! میری بچی آنکھیں کھولو۔'' عائشہ نے حاجرہ کے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

عائشہ، حاجرہ کو اپنی بانہوں میں لیے چارپائی پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی، اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر حاجرہ کے چہرے پر گر رہے تھے، اسے اب تک یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ اپنی بچی کی لاش بازوؤں میں لیے بیٹھی ہے، اس لیے اسے ہوش میں لانے کے لیے مسلسل اس کے گالوں کو تھپتھپا رہی تھی۔

عمر اور ماجدہ کچھ دیر تک گم سم کھڑے ماں اور بہن کی حالت دیکھتے رہے، پھر دونوں باپ کے کمرے کا دروازہ پیٹنے لگے، مگر کرم دین اتنی آسانی سے دروازہ کھولنے والا کہاں تھا، وہ دروازہ کھلنے کے انتظار میں تھوڑی دیر کے لیے دروازہ پیٹنا بند کر دیتے مگر اندر سے کوئی جواب نہ پا کر پھر سے دروازہ پیٹنے لگتے، آخر کار ان دونوں کی کوشش رنگ لے آئی اور دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولتے ہی کرم دین ان دونوں پر برس پڑا، قریب تھا کہ وہ غصے میں بے قابو ہو کر انہیں برا بھلا کہتا یا ان کی پٹائی کرنے لگتا، عائشہ نے بانہوں میں لی ہوئی حاجرہ کی لاش کرم دین کے سامنے کر دی اور بولی۔ ''یہ لو ایک اور بچے کی لاش قبول کرو۔''

''کیا ہوا اسے؟'' کرم دین نے حاجرہ کو عائشہ کی بانہوں میں خون میں لت پت دیکھ کر دریافت کیا۔

''تمہارے کرتوتوں کی سزا ملی ہے اسے۔''

کرم دین، عائشہ کی بات کا مطلب پوری طرح سمجھ گیا تھا پھر بھی انجان بن کر بولا ''میں نے ایسا کیا کیا ہے جس کی سزا اسے ملی ہے؟''

''کرم دین! جس دولت کو پانے کے لیے تم نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا رکھا ہے، ایسا نہ ہو کہ اسے پانے کے چکر میں، جو نعمتیں خدا نے تمہیں دے رکھی ہیں وہ بھی چھن جائیں اور تم خالی ہاتھ رہ جاؤ۔''

''تم اپنی بے وقت کی تقریر بند کرو اور اسے چارپائی پر لٹاؤ۔'' کرم دین دھاڑا۔

عائشہ روتی ہوئی وہاں سے چل پڑی اور حاجرہ کی لاش کو چارپائی پر لٹا کر اس پر چادر ڈال دی، ماں کو روتے دیکھ کر عمر اور ماجدہ بھی مسلسل روئے جا رہے تھے مگر پتھر دل باپ کی آنکھوں سے ایک آنسو بھی نہیں نکلا تھا۔

☆☆☆☆☆

کرم دین پر ایک ہی دھن سوار تھی کہ جو بھی ہو اور جس قیمت پر بھی ہو، کسی بھی طرح ایسی قوتوں کو اپنے ہاتھ میں کرنا ہے جن سے کام لے کر وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جائے اور وہ سب کچھ پا لے جس کے لیے اس نے ہمیشہ سے خواہش کی تھی، بابا سائیں نے اسے جو عملیات بتائے تھے انہیں گھر کے ہی کسی کونے میں تنہا بیٹھ کر مکمل کرنے کو کہا تھا مگر اس نے کتاب سے پڑھ کر اپنی مرضی سے جو عملیات شروع کر دیے تھے، ان میں درج ہدایات کے مطابق آبادی سے دور کھلے آسمان تلے بیٹھ کر چلہ کاٹنا تھا، ورنہ کوئی بھی نقصان ہو سکتا تھا، لیکن کرم دین نے کتاب میں دی گئی ہدایات کی کوئی پرواہ نہیں کی تھی اور جو الٹا سیدھا سمجھ میں آیا، کرتا گیا تھا۔

وہ اپنے ارادوں کا مضبوط نکلا اور آخر کار اپنی مطلوبہ منزل پر پہنچ گیا تھا، اس دوران کئی ناخوش گوار واقعات بھی پیش آئے تھے مگر کوئی بھی چیز اسے اس کے ارادوں سے روک نہ سکی تھی، ان ایام میں عائشہ کئی بار ڈری، کئی بار کسی انجانے اور ان دیکھے خوف نے اسے رات بھر جگائے رکھا لیکن وہ خاوند کی ضد کی وجہ سے مجبوراً سب کچھ برداشت کر گئی تھی۔

آدھی رات کا وقت تھا جب کرم دین نے چلے میں پڑھنے والی تسبیح مکمل کر لی، جونہی اس نے تسبیح کا آخری دانہ پھینکا، اسی لمحے اس نے دروازے کی کنڈی کھولی اور جزبات سے بے قابو ہو کر اس کمرے کی طرف دوڑ پڑا جہاں اس کی بیوی اور بچے لیٹے تھے۔ عائشہ اور بچے گہری نیند سو رہے تھے، دروازے پر پہنچتے ہی کرم دین نے زور زور سے کنڈی کھٹکھٹائی تھی، جیسے ہی کنڈی کھٹکنے کی آواز عائشہ کے کانوں میں پڑی تو اس کی آنکھ کھل گئی، وہ ڈر کر سمٹ گئی تھی اور اپنے ساتھ لیٹے ہوئے بچے کو زور سے اپنے ساتھ چمٹا لیا تھا، اب عائشہ کی آنکھیں کھلی تھیں مگر وہ سانس روکے خاموشی سے لیٹی تھی اور اس کے کان پوری طرح دروازے پر لگے ہوئے تھے، کچھ ہی دیر بعد ایک بار پھر دروازے پر دستک ہوئی تھی۔

''کک..... کک..... کون ہے؟'' عائشہ نے چارپائی پر لیٹے، ڈرتے ہوئے دریافت کیا۔

''دروازہ کھولو عائشہ۔'' کرم دین نے آہستہ سے کہا۔

آواز عائشہ کے کانوں سے ٹکرائی تھی مگر اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا، اس لیے پھر سے بولی ''کون ہے؟ بتاتے کیوں نہیں؟''

''میں کرم دین ہوں عائشہ! دروازہ تو کھولو''

اس بار عائشہ نے کرم دین کی آواز سن لی تھی مگر اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا، کیونکہ اسے معلوم تھا کہ وہ اس وقت حجرے میں بیٹھا چلہ کاٹنے میں لگا ہوگا اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ کرم دین کسی بھی صورت میں اپنا کام ادھورا چھوڑ کر وہاں آنے والا نہیں تھا۔

''کیوں جھوٹ بولتے ہو۔ تم کرم دین نہیں ہو سکتے۔'' عائشہ نے اپنی تسلی کے لیے بات کی۔

''تم دروازہ کیوں نہیں کھول رہی ہو۔ میں کہہ رہا ہوں کہ میں کرم دین ہوں۔ تمہیں اس بات کا یقین کیوں نہیں آ رہا؟''

''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ تمہیں تو اس وقت اپنے کمرے میں ہونا چاہئے تھا''

''دروازہ کھولو گی تو کوئی بات ہو گی۔ میں یہاں باہر کھڑا تمہیں کیا بتاؤں''

اب تک عائشہ تمام باتیں چارپائی پر ہی لیٹی ہوئی کر رہی تھی مگر کرم دین کی آواز پہچان کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی، لیکن کنڈی کھولنے سے پہلے اس نے اپنی تسلی کے لیے چھوٹے سے سوراخ میں سے آنکھ لگا کر دیکھا تھا، جب اسے مکمل یقین ہو گیا کہ دروازے پر کھڑا شخص کرم دین ہی ہے تو اس نے کمرے کی لائٹ جلا دی اور دروازہ کھول دیا۔

عائشہ کے پوچھنے پر کرم دین نے اسے تمام تفصیلات سے آگاہ کر دیا تھا، بابا سائیں کے بتائے ہوئے طریقوں اور کتاب میں دی گئی ہدایات کے مطابق اپنے عملیات مکمل کرنے پر اسے جو خوشی حاصل ہوئی تھی وہ اس کے چہرے سے صاف جھلک رہی تھی، کرم دین اپنی کامیابی پر خوش تھا اور عائشہ یہ سوچ کر مطمئن تھی کہ اب خاوند کے ہوتے ہوئے اسے ڈر ڈر کر راتیں نہیں گزارنی پڑیں گی۔

☆☆☆☆☆

ایک عرصے کے بعد کرم دین اپنے حجرے سے نکل کر محلے داروں کے سامنے آیا تھا، وہ گھر سے نکل کر باہر آ کھڑا ہوا تھا اور ہر آنے جانے والے کو انتہائی پرتپاک طریقے سے مل رہا تھا، لوگ اس کی خیریت دریافت کرتے اور آگے بڑھ جاتے تھے، کرم دین کو کسی ایسے شخص کی تلاش تھی جس کے سامنے وہ کچھ کر کے دکھا سکے تاکہ پھر اس کے ذریعے دوسرے لوگوں تک بھی بات پہنچ جائے۔ کچھ ہی دیر بعد دور سے اسے مبارک آتا ہوا دکھائی دیا، وہ جیسے جیسے قریب آ رہا تھا، کرم دین کا دماغ اتنی ہی تیزی سے منصوبہ بندی کر رہا تھا۔

''کہاں ہوتے ہو کرم دین۔ آج بہت دنوں بعد شکل دکھائی ہے؟'' مبارک نے آتے ہی سوال کیا۔
''میں نے کہاں جانا ہے۔ میں تو گھر پر ہی ہوتا ہوں''
''مگر کبھی دکھائی تو نہیں دیے!''
''دراصل آج بہت دنوں کے بعد گھر سے نکلا ہوں۔''
''یہی تو میں کہہ رہا ہوں''
''چلو اب مل گئے ہو تو آؤ بیٹھ کر گپ شپ لگاتے ہیں''
''پھر کبھی سہی۔''
''آؤ تو سہی کچھ دیر کے لیے بیٹھو پھر چلے جانا'' کرم دین نے مبارک کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ وہ بضد تھا، اس لیے مبارک نے کسی قسم کا احتجاج نہ کیا اور خاموشی سے کرم دین کے ساتھ ساتھ چل دیا۔
''کیا کھاؤ گے؟ کیا پیو گے۔؟'' کمرے میں بیٹھتے ہی کرم دین نے مبارک سے دریافت کیا۔
''فی الحال تو کسی چیز کی طلب نہیں۔
''شرماؤ نہیں یار! جو چاہو بتاؤ۔''
''کہا ناں کچھ نہیں چاہیے۔ میں تو ابا کے لیے دکان سے سگریٹ لینے جا رہا تھا۔''
''کمال ہے یار۔ میرے ہوتے ہوئے سگریٹ لینے کے لیے دکان پر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ بس تم یہ بتاؤ کون سے سگریٹ چاہئیں؟''
''کوئی سے بھی۔ اچھے سے سگریٹ ہوں''
''لاؤ بھئی مبارک کے لیے سگریٹ لاؤ۔'' کرم دین چھت کی طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔
کرم دین کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ سن کر مبارک کبھی چھت کبھی کرم دین کو دیکھنے لگا، مگر جب تھوڑی ہی دیر بعد سگریٹ کا پیکٹ اس کے سامنے آ کر گرا تو اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا، وہ پھٹی پھٹی نظروں سے کبھی سگریٹ کے پیکٹ کو دیکھنے لگتا اور کبھی اس جگہ کا جائزہ لینے لگتا جہاں سے کچھ ہی دیر پہلے سگریٹ کی ڈبی پھینکی گئی تھی۔
''یہ سب کیا ہے کرم دین؟'' مبارک نے سگریٹ کا پیکٹ حیرانگی سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔
''بس یوں سمجھ لو۔ میں نے اپنے وظائف اور چلوں کے ذریعے کچھ طاقتوں کو اپنے ہاتھ میں کر لیا ہے، اسی وجہ سے میں ایک عرصے تک ایک ہی کمرے میں قید رہا ہوں اور کہیں باہر نہیں نکلا۔''
''یہ تو کمال ہو گیا۔''
''ہاں۔ لیکن اصل کمال تو اس وقت ہو گا، جب مختلف پریشانیوں میں گھرے ہوئے لوگ میرے پاس آئیں گے اور میں ان کے کام آؤں گا۔ سگریٹ کی ڈبی تو تمہیں مفت میں مل گئی۔ لیکن تب ہر کام پیسوں سے ہو گا۔''
کرم دین کو یقین تھا کہ اس نے مبارک کے سامنے جو کام کر دکھایا ہے، اس کی دھوم جلد ہی ساری بستی میں پھیل جائے گی اور وہ دن دور نہیں جب دور و نزدیک سے لوگ تعویز دھاگے کے لیے اس کے پاس چلے آئیں گے، پھر پیسہ ہی پیسہ اور موجیں ہی موجیں ہوں گی۔
مبارک نے سگریٹ کی ڈبی جیب میں ڈالی اور وہاں سے نکل گیا، وہ گھر پہنچنے تک بھی سوچتا رہا تھا۔ ''یہ لو سگریٹ۔ اور یہ لو اپنے پیسے۔'' مبارک نے سگریٹ کی ڈبی اور پیسے اپنے باپ کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے کہا۔
سگریٹ کی ڈبی اور پیسے اللہ داد کے ہاتھ میں تھے، وہ حیرانگی سے مبارک کو دیکھتے ہوئے بولا ''تم سگریٹ کی ڈبی کے پیسے دے کر نہیں آئے؟''
''نہیں۔ آج سگریٹ مفت ملے ہیں۔''
''کیا مطلب؟''
''یہ سگریٹ کرم دین نے اپنے جنوں سے منگوا کر دیے ہیں''
''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''میں سچ کہہ رہا ہوں ابا! یہ ڈبی اس نے میرے سامنے منگوائی ہے۔''
''اچھا!'' اللہ داد نے حیران ہو کر تصدیق چاہی۔
''ہاں ابا! اور پتہ ہے کرم دین کہہ رہا تھا کہ اب کسی کا کوئی بھی مسئلہ ہو، وہ میرے پاس چلا آئے''
ان کی باتیں سن کر فاطمہ بھی وہاں آ گئی اور بولی ''یہ تم کس کی باتیں کر رہے ہو؟''
''آؤ تم بھی سن لو اور سن کر تم بھی میری طرح حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکو گی'' اللہ داد نے بات کی اور پھر مبارک کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ''ذرا اپنی ماں کو بھی سنا دو۔''
''ماں تمہیں پتہ ہے کرم دین کے پاس جن ہیں۔''
''واقعی؟''
''ہاں ماں۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، میرے سامنے ہی اس نے سگریٹ کی ڈبی جن سے منگوائی تھی۔''
''اس کا مطلب ہے کرم دین تو اپنے میاں جی سے بھی آگے نکل گیا'' فاطمہ نے حیران ہو کر بات کی۔
فاطمہ کی بات سن کر اللہ داد بول پڑا ''یہ نہ کہو۔ کیونکہ میاں جی آل رسول ﷺ میں سے ہیں اور کرم دین تو کیا، ہم میں سے کوئی بھی ان کے قدموں کی خاک کی برابری بھی نہیں کر سکتا''
''لیکن پھر بھی اب میاں جی کو کون پوچھے گا۔ ویسے بھی میاں جی کے دم میں بھی اب کچھ نہیں رہ گیا۔''
''ایسا نہ کہو، کیونکہ میاں جی جو کچھ بھی کرتے ہیں وہ بغیر کسی لالچ کے ہوتا ہے..... لوگ اپنی مرضی سے اگر انہیں کچھ دے بھی آتے ہیں تو وہ اس سے بھی لنگر پکوا کر غریبوں میں تقسیم کر دیتے ہیں اور کبھی ایک پیسہ بھی اپنی جیب میں نہیں ڈالتے'' اللہ داد نے بات کی تو فاطمہ کوئی جواب نہ دے سکی اور خاموش بیٹھی رہی۔
مبارک کے ذریعے کرم دین کے متعلق جو بات اس کے ماں باپ تک پہنچی تھی، وہ آہستہ آہستہ علاقے میں سفر کرتی ہوئی چاچی خبری کے کانوں میں بھی پڑ گئی تھی۔ جیسے ہی چاچی کے کانوں میں بات پڑی، اس نے حسب عادت برقعہ اٹھایا اور کرم دین کے ہاں پہنچ گئی۔
دوپہر کا وقت تھا کرم دین چارپائی پر بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ ''سنا ہے تمہارے پاس جن ہیں؟ اور تم جو چاہو ان سے کام کروا سکتے ہو۔'' چاچی خبری نے آتے ہی دریافت کیا۔
''یہ تم سے کس نے کہہ دیا؟'' کرم دین نے جان بوجھ کر چاچی سے معلومات حاصل کرنے کے لیے بات کی۔
''سارے محلے والے ہی باتیں کر رہے ہیں۔''
''کیا کہتے ہیں محلے والے؟''
''سچ پوچھو تو کچھ حیران ہیں اور کچھ کو یقین ہی نہیں آ رہا۔''
''یقین نہیں آ رہا تو آ جائے گا چاچی۔ مگر تم اپنی بتاؤ، تمہیں یقین آیا کہ نہیں؟''
''مجھے بھی تب یقین آئے گا، جب تم میرا کام کرو گے''
''چاچی تم اس کونے والے کمرے میں جا کر بیٹھو، میں ابھی کھانا کھا کر آتا ہوں اور پھر تم سے بات کرتا ہوں''
کرم دین کی بات سن کر چاچی وہاں سے اٹھی اور خاموشی سے اس کمرے میں جا بیٹھی جہاں کرم دین نے اشارہ کیا تھا، فرش پر بچھی ہوئی سفید چادریں دیکھ کر چاچی نے اپنے جوتے باہر ہی اتار دیے تھے، کمرے میں اگر بتیاں جل رہی تھیں اور ان کی خوشبو پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی، ابھی چاچی کمرے کا جائزہ لے رہی تھی کہ کرم دین وہاں آ گیا اور آتے ہی ایک طرف بیٹھتے ہوئے بولا۔
''ہاں چاچی! اب بتاؤ کیا کہتی ہو''
''تم تو جانتے ہی ہو، میری بہو نے میرے بیٹے کو اپنے قابو میں کر رکھا ہے۔ کچھ ایسا کر دو کہ وہ میرے کہنے میں آ جائے اور اس کی بیوی بھی میرے اشاروں پر ناچنے لگے''
''یہ کام تو اتنا بڑا نہیں ہے چاچی۔ کام تو تمہارا میں کر دوں گا، مگر کچھ پیسے خرچ کرنا پڑیں گے''
''ہاں ہاں کیوں نہیں۔ بس میرا کام ہو جائے، میں گیارہویں والے کے نام پر پورے گیارہ روپے دوں گی''

''اب گیارہ روپے سے کام نہیں چلے گا چاچی''
''مگر میاں جی کو تو ہم گیارہ روپے ہی دیتے ہیں''
''اسی لیے تو کام بھی نہیں ہوتا۔ میں اس کام کے پانچ سو روپے لوں گا اور اس بات کی بھی گارنٹی ہے کہ جیسا تم چاہتی ہو ویسا ہی ہوگا''

☆☆☆☆☆

کرم دین کی بات سن کر چاچی خاموش ہوگئی تھی، اس کا خیال تھا کہ وہ اس کے ہاتھوں میں پلا بڑھا ہے، اس کا کام یونہی کر دے گا اور اس کام کے لیے اسے میاں جی کی طرح گیارہ روپے بھی نہیں دینے پڑیں گے۔ چاچی خیری نے اپنی بہو اور بیٹے کو اپنے ہاتھ میں کرنے کے لیے کئی بار میاں جی سے تعویز لیے تھے اور ہر بار انہیں نیاز کے لیے گیارہ روپے بھی ادا کرتی رہی تھی لیکن تعویزوں کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا، اسے میاں جی سے یہی گلا تھا کہ وہ اس سے کتنی ہی بار گیارہویں والے کے نام کے گیارہ روپے لے چکے تھے مگر اس کا کام پھر بھی نہیں ہوا تھا۔

کرم دین کی بات سن کر چاچی خاموشی سے اپنے گھر واپس چلی آئی تھی لیکن اسے بار بار یہ سوچ کر دکھ ہو رہا تھا کہ کرم دین کو جو کام بغیر پیسوں کے بخوشی کر دینا چاہئے تھا، اس نے اس کے لیے پانچ سو روپے مانگے تھے، وہ سوچنے لگی کہ کرم دین کو بغیر کسی لالچ کے اس کا کام کر دینا چاہئے تھا، بعد میں وہ خود اپنی خوشی سے کچھ دے دیتی تو اور بات تھی، مگر اس نے تو منہ کھول کر پانچ سو روپے مانگ لیے تھے۔

کرم دین کی باتوں نے چاچی کو پریشان کر دیا تھا لیکن وہ ساتھ ہی یہ بھی سوچ رہی تھی کہ اگر کرم دین کو پانچ سو روپے دینے سے اس کے بہو بیٹا ہاتھوں میں آجاتے ہیں تو پھر بھی سودا برا نہیں، لیکن سوال یہ تھا کہ پانچ سو روپے کا انتظام کہاں سے کیا جائے۔

گھر کا تمام نظام چاچی کے بیٹے کے پاس تھا اور وہ روپیہ پیسہ اپنی بیوی کے پاس رکھتا تھا، اسے کھانے پینے کے لیے دو وقت کی روٹی مل جاتی تھی مگر پیسے کی شکل دیکھنا اسے کم ہی نصیب ہوتا تھا، میاں جی سے تعویز بنوانے کے لیے اسے جو دو تین بار گیارہ گیارہ روپے دینے پڑے تھے اس کے لیے بھی اس نے بہو سے چوری مرغیوں کے انڈے بیچے تھے تب جا کر وہ میاں جی کو دینے کے لیے جمع کر پائی تھی، اب اٹھتے بیٹھتے چاچی کے ذہن میں ایک ہی سوال اٹھتا تھا کہ وہ کرم دین کو دینے کے لیے پانچ سو روپے کا انتظام کس طرح کرے، گھر کا مکمل کنٹرول حاصل کرنے کے لیے صرف پانچ سو روپے درکار تھے، وہ پانچ سو روپے اسے کہیں سے بھی حاصل کرنا تھے مگر نہیں ہو پا رہے تھے۔

کئی منصوبے چاچی کے دماغ میں بنے تھے مگر ہر منصوبے میں کہیں نہ کہیں جھول ہوتی تھی، اس لیے وہ منصوبہ ختم ہو جاتا اور پھر کوئی نئی منصوبہ بندی شروع ہو جاتی تھی، وہ کوئی نہ کوئی قدم اٹھا تو لیتی مگر اسے کسی بھی جگہ پکڑی جانے کا ڈر ہوتا تھا اس لیے اپنے منصوبے پر عمل نہ کر پاتی۔

جب سے چاچی خیری، کرم دین کے ہاں سے ہو کر آئی تھی، بہو اور بیٹے کو اپنے ہاتھوں میں کرنے کی امید بندھ گئی تھی لیکن پانچ سو روپے کی رقم مسئلہ بنی ہوئی تھی، جب پیسوں کے حصول کی کوئی راہ دکھائی نہ دی تو چاچی نے رقم اکٹھی کرنے کے لیے اپنے ذہن میں لائحہ عمل تیار کر لیا اور اپنے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے کسی نہ کسی طرح جوڑ توڑ کر کے ڈیڈھ سو روپے اکٹھے کر لیے، ڈیڈھ سو روپے جمع کرنے میں بھی اسے کئی دن لگ گئے تھے، اب مزید انتظار اس کے بس میں نہیں تھا، اس نے انتہائی احتیاط سے پیسے نکال کر گنے اور پھر گٹھلی میں ڈال کر اپنے پاس محفوظ کیے اور کرم دین کے پاس پہنچ گئی۔

کرم دین اپنے مخصوص کمرے میں بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا، چاچی بھی عائشہ سے پوچھ کر وہیں پہنچ گئی۔ ''آؤ چاچی آؤ۔'' کرم دین نے چاچی کو دیکھ کر سنبھلتے ہوئے کہا۔

وہ کرم دین کے سامنے ہی بیٹھ گئی اور سوچنے لگی کہ بات کا آغاز کس طرح سے کرے، ابھی وہ بات کرنے کے لیے مناسب الفاظ تلاش کر رہی تھی کہ کرم دین کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''بہت دنوں کے بعد چکر لگایا ہے چاچی؟''
''ہاں۔ آنا تو میں کئی دن سے چاہ رہی تھی مگر تم نے پیسے ہی اتنے زیادہ مانگے تھے کہ انتظام ہی نہیں ہو پا رہا تھا''
''چاچی۔ پانچ سو روپے کیا بہت زیادہ ہوتے ہیں؟''
''ہاں۔ مجھ جیسی غریب اور بے بس کے لیے تو زیادہ ہی ہوتے ہیں''
''اچھا اب تو پیسوں کا انتظام کر لیا ہے ناں؟''
''مشکل سے یہ ڈیڈھ سو روپے اکٹھے ہوئے ہیں'' چاچی نے گٹھلی میں سے پیسے نکالتے ہوئے کہا۔

''صرف ڈیڈھ سو؟''
''فی الحال یہ تو رکھو۔ باقی بھی تھوڑے تھوڑے کر کے لادوں گی''
''چاچی کام تو پورا کروانا چاہتی ہو اور پیسے قسطوں میں''
''تو میرا کام تو کر دے۔ پھر میں تمہیں سود و سوز یادہ ہی دے دوں گی''
کرم دین کے وظائف اور چلوں کے بارے میں پورے علاقے کے لوگ جان چکے تھے مگر اس کے پاس کوئی بھی نہیں آیا تھا، لوگ اب بھی میاں جی کے پاس ہی جاتے تھے، صرف چاچی خبری تھی جو اپنی کوئی غرض لے کر اس کے پاس آئی تھی، جس کے لیے اس نے پانچ سو روپے مانگے تھے مگر وہ ڈیڈھ سو روپے لے کر آئی تھی، کرم دین کے بھی اتنے اچھے حالات نہیں تھے، اس لیے اس نے چاچی سے ڈیڈھ سو روپے ہی لینے کا فیصلہ کر لیا اور بولا۔ ''تم بھی کیا یاد کرو گی چاچی۔ لاؤ یہ پیسے مجھے دو، میں تمہارا کام کر دیتا ہوں لیکن کام ہونے کے بعد میرے پیسے بھول نہ جانا''

''کیسی باتیں کرتے ہو تم بھی..... میں بھلا ایسی ہوں کیا؟ بس میرا کام ہو جائے پھر دیکھنا میں تمہیں خوش کر دوں گی''
دونوں ہی ضرورت مند تھے، اس لیے کچھ ہی دیر میں دونوں کی ضرورتوں کا تبادلہ ہو گیا، چاچی تعویز اور کچھ پڑھنے کے لیے کلمات لیے اپنے گھر روانہ ہو گئی تھی جبکہ کرم دین نے چاچی سے ڈیڈھ سو روپے لے کر جیب میں ڈال لیے تھے۔
گھر پہنچتے ہی چاچی نے پہلے اس بات کی تسلی کر لی کہ اس کی بہو اپنے کاموں میں لگی ہوئی تھی اور اس کی توجہ اس کی طرف نہیں تھی، پھر اس نے احتیاط سے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر دیا تا کہ وہ کرم دین کے دیے ہوئے تعویز کہیں سنبھال کر رکھ سکے، چاچی کو اس بات کا اچھی طرح علم تھا کہ اس کی بہو کبھی بھی اس کے کمرے میں نہیں آئی تھی، اس کے لیے کھانا بھی وہ بچوں کے ہاتھ کمرے میں ہی بھجوا دیا کرتی تھی، مگر اس کے باوجود ڈر اور خوف نے اسے بری طرح جکڑ رکھا تھا، کچھ ہی دیر میں چاچی نے تعویز ٹھکانے لگا دیے اور کمرے کا دروازہ کھول دیا۔
وقت اپنی رفتار سے گزر رہا تھا لیکن چاچی کو یوں لگ رہا تھا جیسے وقت تھم گیا تھا، رات ہونے میں ہی نہیں آ رہی تھی، پھر جیسے ہی عشاء کی اذان ہوئی چاچی نے جلدی سے نماز پڑھی اور تسبیح لے کر اپنی چارپائی پر بیٹھ کر کرم دین کے بتائے ہوئے کلمات پڑھتے ہوئے تسبیح کرنے لگی اور دانے پہ دانہ گرنے لگا، تسبیح مکمل ہونے میں قریب قریب ایک گھنٹہ لگا تھا، اس کام سے فارغ ہو کر چاچی سکون سے لیٹ گئی تھی۔

☆☆☆☆☆

جمعہ کے خطبے میں میاں جی کی تقریر کا موضوع والدین کی خدمت تھا، وہیں چاچی خبری کا بیٹا اسلم بھی موجود تھا اور ان کی بتائی ہوئی باتوں کو غور سے سن رہا تھا، میاں جی نے والدین کی نافرمانی کرنے والوں کے متعلق ایسی ایسی احادیث اور واقعات سنائے تھے کہ اسلم کانپ کر رہ گیا تھا۔ اس طرح کی باتیں اس نے پہلے بھی کئی بار سنی تھیں، جو اس نے ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دی تھیں، شائد اس نے زندگی میں پہلی بار یہ باتیں غور سے سنی تھیں یا میاں جی کا انداز بیاں ایسا تھا کہ اس روز میاں جی کے منہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ اس کے دل میں اترتا جا رہا تھا۔
نماز جمعہ کے بعد اسلم خود کو ٹٹولنے لگا کہ کہیں وہ بھی والدین کے نافرمانوں میں سے تو نہیں، اس کا باپ تو بہت سال پہلے ہی اس جہاں سے چل بسا تھا، اس کی زندگی میں وہ ہمیشہ باپ کا محتاج رہا تھا اور اسے یاد نہیں تھا کہ اس نے کبھی اپنے باپ کی نافرمانی کی ہو۔ باپ کی وفات کے بعد تمام تر معاملات اس کے ہاتھوں میں آ گئے تھے اور وہ اپنے طور پر اپنی ذمہ داریاں پوری طرح نبھا رہا تھا۔ وہ گھر پہنچا تو ابھی تک میاں جی کی کہی ہوئی باتوں کے حصار میں تھا، وہ معمول کے مطابق اپنے دیگر امور نمٹاتا رہا مگر اس کا ذہن اسی معاملے میں الجھ کر رہ گیا تھا، شام ہوئی تو اس کی بیوی شہناز، اس کے لیے کھانا لے آئی۔
''اماں نے کھانا کھا لیا ہے؟'' اسلم نے منہ میں نوالہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔
''ہاں۔ اماں کو تو میں نے بچوں سے بھی پہلے گرم گرم روٹی بھجوا دی تھی''
''اچھی بات ہے''
''مگر آج تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''
''بس یونہی۔ میں سوچ رہا تھا کہیں کسی وجہ سے اماں ہم سے ناخوش نہ ہو''

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے بھلا۔ میں اپنی طرف سے ان کا پورا خیال رکھتی ہوں''
''یہ تو میں سمجھتا ہوں، لیکن پھر بھی رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ ہم اماں کے پاس جا کر نہیں بیٹھتے، اسے وقت نہیں دیتے''
''سارا دن تو اماں یہیں میرے پاس ہی ہوتی ہیں اور رات کا کھانا میں انہیں ان کے کمرے میں ہی بچوں کے ہاتھ بھجوا دیتی ہوں، بس اسی وجہ سے اماں کے پاس کبھی جا کر بیٹھنا نہیں ہوتا''
''ایسا ہی کچھ میرے ساتھ ہے۔ دن بھر کام کاج سے فرصت نہیں ملتی اور رات کو وہ اپنے کمرے میں لیٹی ہوتی ہیں۔ میں سوچتا ہوں اس وقت لیٹی ہوں گی، اب انہیں کیا تنگ کرنا ہے'' باتوں کے دوران ہی اسلم کھانے سے فارغ ہو گیا تھا، شہناز نے برتن اٹھائے اور انہیں کچن میں رکھ کر واپس وہیں آ بیٹھی۔
''آج اماں کے پاس جا کر نہ بیٹھیں؟'' اسلم نے دل کی بات کی۔
''چلیں ابھی چلتے ہیں'' بات کرتے ہی شہناز اٹھ کھڑی ہوئی۔
شہناز کو اٹھتے دیکھ کر اسلم بھی اٹھ گیا، پھر وہ دونوں اماں کے کمرے کی طرف چل پڑے، وہ کمرے میں داخل ہوئے تو چاچی تسبیح کرنے میں مشغول تھی، چاچی کو یہ امید نہ تھی کہ وہ اچانک وہاں آ جائیں گے، پھر بھی وہ خوش تھی کہ کرم دین کے تعویزوں نے کام کر دکھایا تھا اور اس کی بہو اور بیٹا، جو کبھی بھی اس کے کمرے میں نہیں آئے تھے، وہ آج چلے آئے تھے۔
''کیا کر رہی ہو اماں؟'' ماں کے پاس بیٹھتے ہی اسلم نے سوال کیا۔
''میں نے کیا کرنا ہے پتر۔ بس نماز پڑھ کر تسبیح کر رہی تھی''
''کبھی ادھر ہمارے کمرے میں بھی آ کر بیٹھ جایا کرو''
''بس تم لوگ اپنی باتوں میں لگے ہوتے ہو۔ میں یہاں اللہ اللہ میں لگی رہتی ہوں''
''اماں تم ہم سے خوش تو ہو ناں؟'' اسلم نے ماں کے کندھے دباتے ہوئے کہا۔
''میں تو خوش ہوں، لیکن آج تم لوگوں کو میرا خیال کیسے آ گیا؟''
''اماں اب ایسے تو نہ کہو۔ کیا میں ہر روز وقت پر تمہیں تازہ روٹی پکا کر نہیں دیتی؟'' چارپائی پر بیٹھی چاچی کی ٹانگیں دباتے ہوئے شہناز نے پیار سے کہا۔
''میں نے تو کسی سے کوئی شکوہ نہیں کیا، تم لوگ خود ہی ایسا سوچ رہے ہو''
''بس اماں آج میرا دل چاہ رہا تھا تمہارے پاس بیٹھوں، اس لیے ہم دونوں آ گئے۔ سچ پوچھو تو اب کچھ دیر تمہارے پاس بیٹھنے سے سکون سا مل گیا ہے'' اسلم نے اٹھتے ہوئے کہا۔
''خوش رہو میرے بچو۔ خدا تمہیں کبھی کوئی پریشانی نہ دکھائے'' چاچی نے دونوں کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔
وہ دونوں جانے لگے تو اچانک اسلم کی نظر سرہانے پر پڑ گئی، جو بہت گندہ ہو رہا تھا۔
''سرہانے کا کور دیکھو کس قدر گندہ ہو رہا ہے، اسے تو بدلو'' اسلم نے سرہانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شہناز سے کہا۔
''میں ابھی بدل دیتی ہوں'' شہناز نے سرہانہ اٹھاتے ہوئے کہا۔
''نہیں نہیں۔ پھر کبھی بدل دینا'' چاچی نے شہناز سے سرہانہ جھپٹتے ہوئے کہا۔
''اماں کیا ہو گیا۔ دو منٹ لگیں گے میں ابھی بدل کے لا دوں گی'' شہناز نے چاچی سے سرہانہ پکڑتے ہوئے کہا۔
چاچی نے سرہانہ مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا، جیسے کسی نے لے لیا تو اس کے ہاتھ سے بہت بڑا خزانہ چھن جائے گا، پھر شہناز کو سمجھاتے ہوئے بولی ''میں کہہ جو رہی ہوں، کل دن میں کسی وقت بدل دینا، اس وقت بدلنے کی ایسی بھی کیا جلدی ہے''
''چلو اماں جیسے کہتی ہے ویسے کر لو۔ مگر یاد سے کل صبح ہی بدل دینا'' اسلم نے بات ختم کرنے کے لیے کہا پھر ماں کی طرف منہ کرتے ہوئے بولا ''اچھا اماں اب تم آرام کرو، ہم چلتے ہیں''
وہ کمرے سے نکلے تو چاچی کی جان میں جان آئی، وہ کچھ دیر تک اسی حالت میں بیٹھی رہی، جب اسے اس بات کی تسلی ہو گئی کہ وہ دونوں ہی اپنے کمرے میں چلے گئے ہیں تو اٹھی اور احتیاط سے دروازے کی چٹخنی چڑھا دی، اسے معلوم تھا کہ اب وہاں کوئی نہیں آئے گا مگر پھر بھی

اس نے اپنی تسلی کے لیے چٹخنی چڑھادی تھی تاکہ کہیں ان دونوں میں سے پھر کوئی وہاں نہ آدھمکے۔ سب سے زیادہ اسے اس بات کا ڈر تھا کہ کہیں اس کی بہو ابھی سرہانے کا گلاف بدلنے کے لیے نہ چلی آئے، اس لیے اس نے جلدی سے سرہانے میں ہاتھ ڈالا اور اس میں سے وہ تعویز نکال لیے جو اس نے کرم دین کے کہنے کے مطابق وہاں رکھے تھے۔

چاچی نے بہو اور بیٹے کے جانے پر خدا کا شکر ادا کیا تھا اور تعویز ٹھکانے لگانے کے بعد اپنی چارپائی پر بیٹھی پھر سے تسبیح کرنے لگی تھی، بیٹے اور بہو کے آنے سے قبل وہ مکمل یکسوئی کے ساتھ تسبیح کر رہی تھی مگر اب تسبیح تو اسی طرح ہو رہی تھی لیکن ذہن اس بات میں الجھا ہوا تھا کہ سرہانے میں رکھے ہوئے تعویزوں پر اگر ان کی نظر پڑ جاتی تو کیا ہوتا۔

شہناز، خاوند کے کہنے پر خاموشی سے ساس کے کمرے سے چلی تو آئی تھی مگر اس کے ہاتھوں سے چاچی کے سرہانا چھیننے پر اس کا ذہن الجھ کر رہ گیا تھا اور اس کے دماغ میں بہت سے سوال اٹھنے لگے تھے، وہ سوچنے لگی تھی کہ ہو نہ ہو اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی راز ضرور ہے، ورنہ وہ اس کے ہاتھوں سے سرہانا کبھی نہ چھینتی۔

چاچی کا روز کا معمول تھا کہ وہ ناشتے سے فارغ ہو کر برقعہ اٹھاتی اور کسی نہ کسی کے ہاں جا بیٹھتی، پھر دو چار گھروں میں ضرور ہو کر آتی، جس سے لوگوں کو گھر بیٹھے ہی محلے کی ساری خبریں مل جایا کرتیں۔ صبح ہوئی تو شہناز اس ٹوہ میں لگ گئی کہ وہ کب برقعہ لے کر نکلتی ہے۔

بچے اپنے اپنے سکولوں کو جا چکے تھے اور اسلم بھی اپنی دکان پر چلا گیا تھا، چاچی نے حسب عادت برقعہ اٹھایا اور گھر سے نکل گئی، شہناز کو علم تھا کہ اب وہ ڈیڈھ دو گھنٹے سے پہلے نہیں آئے گی، اس نے دھلے ہوئے کپڑوں میں سے سرہانے کا گلاف لیا اور چاچی کے کمرے میں پہنچ گئی، اس نے جلدی سے سرہانے کا گلاف اتار ڈالا تھا، اس کا خیال تھا کہ جیسے ہی وہ گلاف اتارے گی اس میں سے کوئی نہ کوئی چیز ضرور نکلے گی، لیکن گلاف اترنے پر جب کوئی بھی چیز برآمد نہ ہوئی تو اسے سخت مایوسی ہوئی۔

اس نے گلاف تبدیل کر دیا تھا مگر اس کی الجھن ابھی ختم نہیں ہوئی تھی، اس کے دماغ میں اٹھنے والے سوال ابھی تک اپنی جگہ قائم تھے، چاچی اپنی عادت کے مطابق اتنی جلدی آنے والی نہیں تھی، اس لیے اس نے کمرے کی تلاشی لینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کمرے میں زیادہ سامان نہیں تھا، تھوڑی ہی دیر میں اس نے کمرے کے کونے کھدروں کی تلاشی لے لی تھی مگر کوئی بھی قابل اعتراض چیز اس کے ہاتھ نہیں لگی تھی۔

اچانک شہناز کی نظر اس طرف اٹھ گئی جہاں قرآن مجید رکھا تھا، کمرے میں وہی ایک جگہ باقی رہ گئی تھی جس کی اس نے تلاشی نہیں لی تھی، اگلے ہی لمحے اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ رقصاں تھی، قرآن مجید کے نیچے رکھے ہوئے کچھ تعویز اس کے ہاتھ لگ گئے تھے مگر ساتھ ہی وہ یہ سوچ کر پریشان ہو گئی تھی کہ اس نے وہ تعویز کیوں کروائے تھے، تعویزوں کے پاس ہی پڑی ہوئی سوئی اور اس میں پڑے ہوئے کالے دھاگے نے اسے مزید الجھا دیا تھا، اس نے تعویزوں کو وہیں پڑا رہنے دیا اور کمرے سے نکل آئی۔

چاچی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ گھر کا کوئی فرد کبھی اس کے کمرے کی تلاشی لے گا، ورنہ وہ تعویز کسی ایسی محفوظ جگہ پر چھپاتی جہاں سے ڈھونڈنے پر بھی کسی کے ہاتھ نہ لگتے، یہ جانے بغیر کہ وہ تعویز کس مقصد کے لیے کروائے گئے تھے، شہناز کے دل میں ساس کے خلاف نفرت اور غصہ بھر گیا تھا، وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اسلم دکان سے رات کو واپس آئے گا، دوپہر سے ہی اس کا انتظار کرنے لگی تھی، اس نے خاوند کے آنے پر جو کچھ کرنا تھا اس کی ہر طرح سے منصوبہ بندی کر لی تھی، وہ بظاہر اپنے معمولات میں مشغول تھی مگر اس کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ رات کو اسلم کے دکان سے واپس آتے ہی گھر میں ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔

''تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے۔ بھلا ماں کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ تعویز کرواتی پھرے'' بیوی کی بات سن کر اسلم نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''تم ہمیشہ اپنی ماں کی ہی حمائت کرو گے، کیونکہ تمہاری نظر میں تو میں جھوٹی ہوں'' شہناز نے چیختے ہوئے کہا۔

''ذرا سی بات ہے اور تم اس طرح چلا رہی ہو جیسے آسمان سر پر گر پڑا ہو۔''

''تمہارے لیے یہ ذرا سی بات ہو گی مگر میرے تن بدن میں آگ لگی ہوئی ہے''

''بات کو خوامخواہ بڑھانے سے بہتر ہے کہ ماں کے پاس چل کر بات کر لی جائے'' اسلم نے شہناز کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''چلو اور چل کر اپنی نظروں سے بھی دیکھ لو۔ پھر شائد تمہیں میری بات کا یقین آ جائے'' شہناز نے تلخ لہجے میں بات کی۔

چاچی عشاء کی نماز کے بعد اپنی چارپائی پر بیٹھی تسبیح کر رہی تھی، اسلم اور شہناز وہاں آئے تو انہیں اچانک اپنے کمرے میں دیکھ کر ایک پل کے

لیے وہ تھوڑا سا گھبرا گئی تھی، کیونکہ اس کمرے میں ان کا آنا کم ہی ہوتا تھا، ایک روز قبل بھی وہ دونوں وہاں آئے تھے اور آج پھر وہ ایک ساتھ اس کے کمرے میں آئے تھے، اس لیے کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور تھی جبکہ دوپہر کو اپنے کمرے میں آتے ہی اس نے دیکھ لیا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں سرہانے کا گلاف بھی تبدیل کر دیا گیا تھا۔

''آجاؤ پتر آجاؤ۔'' چاچی نے ان دونوں کو دیکھ کر چارپائی پر جگہ بناتے ہوئے کہا۔

''اماں! تم نے قرآن مجید کے نیچے کوئی تعویز رکھے ہوئے ہیں؟'' کمرے میں داخل ہوتے ہی اسلم نے بلا تمہید بات کی۔

تعویزوں کا سنتے ہی چاچی کی رنگت پیلی پڑ گئی تھی لیکن اگلے ہی لمحے وہ یہ سن کر سنبھل گئی تھی کہ تعویز قرآن مجید کے نیچے رکھے ہیں، اور حیران ہو کر بولی ''کون سے تعویز؟''

''اماں، شہناز کا کہنا ہے کہ تم نے قرآن مجید کے نیچے تعویز چھپا رکھے ہیں اور تعویزوں کے ساتھ ایک سوئی بھی رکھی ہے جس میں کالے رنگ کا دھاگہ ڈالا ہوا ہے۔'' اسلم نے تفصیل سے بات کی۔

بیٹے کی بات سن کر چاچی مکمل اعتماد کے ساتھ چارپائی سے اٹھی اور قرآن مجید کے نیچے سے کاغذ کے دو ٹکڑے اور سوئی دھاگہ اٹھا لائی اور انہیں دکھاتے ہوئے بولی ''کہیں تم ان کی بات تو نہیں کر رہے؟''

شہناز نے ساس کے ہاتھ میں تہہ کیے ہوئے کاغذ کے دو ٹکڑے اور سوئی میں کالے رنگ کا پڑا ہوا دھاگہ دیکھ کر فاتحانہ انداز میں خاوند کی طرف دیکھا تھا، اس کے اس طرح دیکھنے پر کسی شکست خوردہ شخص کی مانند اسلم کی گردن جھک گئی تھی۔

''میں تو حیران ہوں تم لوگوں کی سوچ پر۔'' ماں کی آواز بیٹے کے کانوں سے ٹکرائی تو اس نے گردن اٹھا کر دیکھا، ماں کہہ رہی تھی ''انہیں کھول کر دیکھو اور پڑھ کر بتاؤ۔ کیا یہ تعویز ہیں؟'' چاچی نے تہہ کیے ہوئے کاغذ کے ٹکڑے اسلم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا اور پھر خود ہی بولی ''ان میں سے ایک پر لکھا ہوا ہے کہ جمعہ کی نماز کے بعد یہ آیات پڑھنے سے گھر میں کبھی تنگدستی نہیں آتی اور دوسرے پر لکھا ہے کہ یہ آیات فجر کی نماز کے بعد سورج نکلنے سے پہلے پڑھی جائیں تو گھر والوں پر آنے والی آفات ٹل جاتی ہیں۔''

ماں کی بات سن کر تصدیق کے لیے اسلم کاغذ کے ان ٹکڑوں پر لکھی ہوئی تحریر پڑھنے لگا، ابھی وہ پڑھ ہی رہا تھا کہ چاچی ایک قمیض نکال لائی اور بولی ''اور یہ ہے وہ قمیض جو ادھڑ گئی تھی جسے میں نے اس سوئی دھاگے سے سیا تھا۔ اگر اس میں بھی کوئی شک ہو تو کالے رنگ کے دھاگے سے کی ہوئی سلائی دیکھ کر اپنی تسلی کر لو۔''

کچھ دیر پہلے تک شہناز کا پلڑا بھاری تھا اور اسلم ڈرا سہما نظریں نیچی کیے گردن جھکائے کھڑا تھا مگر اب اصل حالات سے آگاہی کے بعد وہ شیر بن گیا تھا اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے دونوں کاغذ شہناز کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا ''لو۔ انہیں پڑھ کر تم بھی اپنا شک دور کر لو''

اب شرمندہ ہونے کی باری شہناز کی تھی، وہ حقیقت جان چکی تھی، پھر بھی اپنی تسلی کے لیے وہ کاغذ پڑھنے لگی جنہیں تعویز سمجھ کر اس نے بلا تحقیق آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ اسلم اور شہناز کچھ دیر تک وہیں گم سم کھڑے رہے پھر خاموشی سے وہاں سے نکل گئے اور چاچی کی جان میں جان آئی۔

''کیا ملا تمہیں اس سارے ڈرامے سے؟ میں کہہ بھی رہا تھا کہ اماں کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ تعویز کرائے۔ لیکن تم نے میری ایک نہیں سنی اور بغیر سوچے سمجھے چیخنے چلانے لگی''

''میری جگہ اگر تم بھی ہوتے تو ایسا ہی کرتے''

''میں تمہاری طرح بیوقوف نہیں ہوں۔ مجھے تو یہ سوچ کر بھی شرمندگی ہو رہی ہے کہ اماں کیا سوچتی ہوگی''

''اچھا اب اس بات کو یہیں ختم کرو اور بھول جاؤ کہ کوئی بات ہوئی تھی''

''میں تو بھول جاؤں گا۔ مگر تم یہ نہ بھول جانا کہ میں نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا'' اسلم نے جان بوجھ کر اس انداز میں بات کی تھی کہ شہناز ہنس پڑی اور جلدی سے اس کے لیے کھانا لانے چلی گئی۔

☆☆☆☆☆

پہلے بچے کے بعد دوسرے بچے کی موت کا بھی کرم دین نے کوئی خاص اثر نہیں لیا تھا، اسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے سینے میں دل کی جگہ کوئی پتھر رکھا ہوا تھا جبکہ عائشہ بری طرح نڈھال تھی، وہ گھر کے ضروری کام نمٹاتی اور دونوں بچوں کو اپنے دائیں بائیں لٹا کر خاموشی

سے چارپائی پر پڑی آنسو بہائے جاتی۔
کرم دین کتاب میں سے کچھ اور وظائف پڑھنا چاہتا تھا مگر وہ وقتی طور پر رک گیا تھا، لیکن جب اسے حالات معمول پر آتے دکھائی دینے لگے، صبر کے سبھی پیمانے لبریز ہو گئے اور مزید انتظار اس کے بس میں نہ رہا تو اس نے پھر سے ادھورے وظائف مکمل کرنے کا پروگرام بنالیا۔
''میں جانتا ہوں، ایک ماں کے لیے اولاد کی موت کا صدمہ برداشت کرنا کس قدر مشکل ہے، لیکن اس دنیا میں رہنے کے لیے بہت سے دکھ برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ تم بھی خود کو سنبھالو۔ بچے خدا کی دی ہوئی نعمت تھی، اس نے واپس لے لی۔ اس میں کسی کا تو کوئی قصور نہیں۔'' موقعہ پاتے ہی کرم دین نے بات شروع کی۔
''میں جانتی ہوں۔ یہ سب تمہارے اعمال کی سزا ہے جو میرے بچوں کو بھگتنا پڑی''
''تم تو خوامخواہ جزباتی ہو رہی ہو۔ جس طرح وہ تمہارے بچے تھے، اسی طرح وہ میرے بھی تھے، جتنا تمہیں دکھ ہے اتنا ہی مجھے بھی دکھ ہے''
''تمہیں دکھ کیوں ہونے لگا۔ تمہیں تو دولت چاہیئے۔ تمہاری طرف سے تو چاہے ہم سارے ہی مر جائیں''
''تم نے کبھی میری طرح غربت دیکھی ہوتی تو آج اس طرح کی بات نہ کرتی''
''غربت دور کرنے کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے۔ تمہاری طرح ڈھکوسلوں سے غربت کبھی دور نہیں ہوتی''
''تم کیا جانو دولت میں کتنی طاقت ہے''
''نہیں چاہیئے مجھے ایسی دولت، جس کے لیے مجھے اپنے بچوں کی قربانی دینا پڑے''
''لیکن یہ یاد رکھنا۔ دولت سے بڑھ کر دنیا میں کچھ بھی نہیں''
''اور تم بھی یاد رکھنا۔ میری دولت میرے بچے ہیں۔ اگر مجھ سے یہی چھن گئے تو مجھ سے زیادہ غریب کون ہوگا''
''میں تمہیں دولت دینا چاہتا ہوں اور تمہیں بچوں کی پڑی ہے۔''
''کرم دین۔ ایک ماں کا امتحان مت لو۔ ایسا نہ ہو کسی روز میں تمہارے سامنے آ کھڑی ہوں''
''تو پھر ٹھیک ہے۔ تم اپنے بچوں کو اٹھاؤ اور یہاں سے چلتی بنو، کیونکہ مجھے نہ تم چاہیئے اور نہ تمہارے بچے۔ مجھے دولت چاہیئے۔ صرف دولت۔ سمجھی''
عائشہ کی کوشش تھی کہ کسی طرح وہ کرم دین کو سمجھا کر راہ راست پر لے آئے مگر وہ اسی کو بچوں سمیت گھر سے نکل جانے کا حکم سنا رہا تھا، یہی وہ لمحہ تھا، جب دونوں کے درمیان دیوار کھڑی ہو گئی اور وہ بندھن جو پچھلے کئی سالوں سے جڑا ہوا تھا اس میں دراڑ پڑ گئی۔
''سوچ لو کرم دین۔ ایسا نہ ہو پھر تمہیں اپنے فیصلے پر پچھتانا پڑے''
''پچھتایا ہمیشہ غلط فیصلوں پر جاتا ہے اور میرے خیال میں، میں کوئی غلط فیصلہ نہیں کر رہا''
''ٹھیک ہے۔ اگر تم دولت کی خاطر ہمیں ٹھوکر مارنا ہی چاہتے ہو تو میں ذرا بھی دیر نہیں کروں گی'' عائشہ نے بھرائی ہوئی آواز میں حوصلے سے بات کی، پھر رات بھر وہ پاس پاس لیٹے رہے مگر ان دونوں کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی۔
عائشہ رات بھر جاگتی رہی، سو کرم دین بھی نہیں سکا تھا مگر وہ اس امید پر جاگ رہا تھا کہ کسی بھی لمحے عائشہ اپنی غلطی پر پچھتاتے ہوئے اس سے معافی مانگ لے گی جبکہ عائشہ صبح ہونے کے انتظار میں رات بھر سو نہ سکی تھی۔
رات کو دیر تک جاگتے رہنے کی وجہ سے جب کرم دین کی آنکھ لگی تو اسے کچھ ہوش نہ رہی، صبح جب کرم دین کی آنکھ کھلی تو کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا، باہر کے دروازے کی کنڈی کھلی تھی اور عائشہ بچوں کو ساتھ لیے گھر چھوڑ کر جا چکی تھی۔ گھر سے نکلتے وقت عائشہ نے سوچا تھا کہ اپنے والدین کے پاس جانے کی بجائے وہ کہیں اور جا بسے لیکن پھر اپنے خاندان کی بدنامی کے ڈر سے اس نے اپنے والدین کے پاس جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

☆☆☆☆☆

عائشہ کا گھر اسی شہر میں تھا، وہ چاہتی تو فون کر کے اپنے باپ اور بھائیوں کو بلا سکتی تھی مگر اس نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا تھا، اسے ڈر تھا کہ وہ آئیں گے اور سمجھا بجھا کر پھر سے اسے کرم دین کے ساتھ رہنے کا مشورہ دیں گے، جو اسے کسی بھی حال میں قبول نہیں تھا، اسی لیے اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ بچوں کو لیے خود اپنے گھر پہنچ جائے گی، اس نے یہ بھی سوچ لیا تھا کہ وہ اس وقت گھر پہنچے گی جب اس کے بھائی اور باپ اپنے

اپنے کام پر جا چکے ہوں گے تا کہ جب تک وہ گھر واپس آئیں تب تک وہ اپنی ماں کو تمام حالات بتا کر اس بات کے لیے راضی کر لے کہ وہ کسی طرح اس کے بھائیوں اور باپ کو یہ بات اچھی طرح بتا دے کہ وہ کن حالات میں گھر سے نکل کر آئی ہے اور اس کا واپسی کا بھی کوئی ارادہ نہیں۔

وہ گھر پہنچی تو گھنٹی بجانے پر اس کی ماں نے دروازہ کھولا تھا، اس کی تجربہ کار نگاہوں نے عائشہ کو بچوں کے ساتھ اکیلا آنے اور اس کا اترا ہوا چہرہ اور اڑی ہوئی رنگت دیکھ کر فوراً اندازہ لگا لیا تھا کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے، اس کے اس خیال پر عائشہ کے آنسوؤں نے مہر ثبت کر دی تھی۔

''اکیلی آئی ہو؟ وہ بھی صبح صبح۔ کرم دین ساتھ نہیں آیا؟'' اپنی تسلی کے لیے غفوراں نے سوال کیا۔

''میں وہ گھر چھوڑ آئی ہوں ماں''

''ہائے..... ہائے..... ہائے..... یہ تم کیا کہہ رہی ہو'' غفوراں نے اپنے دونوں ہاتھ مسلتے ہوئے کہا۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں ماں۔ اسی لیے تو بچوں کو لے کر اکیلی یہاں آئی ہوں''

''کوئی ایسی بات تھی تو ہمیں فون کر دیتی۔ تمہارا باپ آ جاتا یا تمہارے بھائی وہاں آ کر کرم دین کو سمجھا دیتے۔ یوں گھر چھوڑ کر تو نہ آتی'' غفوراں نے روتے ہوئے کہا۔

''ماں تم اندر تو چلو۔ میں تمہیں سکون سے بیٹھ کر پوری بات بتاتی ہوں''

''اب کیا سنوں میں۔ تم نے جو کرنا تھا وہ تو کر آئی''

''ماں ایک بار میری بات سن لو۔ پھر تم جو کہو گی میں وہی کروں گی'' عائشہ نے گڑگڑا کر التجا کی۔

دونوں بچے بھی اس کے پاس ہی سہمے کھڑے تھے، عائشہ کی بھابھیاں اور بہن بھی وہیں آ کھڑی ہوئی تھیں، کچھ دیر تک سبھی افراد گردنیں جھکائے افسردہ کھڑے رہے پھر اچانک غفوراں دھاڑیں مار کر رونے لگی اور عائشہ کو اپنے سینے سے چمٹا لیا، ماں کو روتے دیکھ کر عائشہ بھی رونے لگی تھی، پاس کھڑی گھر کی دوسری خواتین بھی رو رہی تھیں، دونوں بچے بھی اپنی ماں کو روتا دیکھ کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ کر بلک پڑے تھے۔

کچھ دیر اسی کیفیت میں گزر گئی، ہر آنکھ میں آنسو تھے اور وہ سبھی عائشہ کو گھر سے نکالے جانے پر تڑپ رہے تھے۔ ''چلیں آپی اندر چل کر بیٹھیں۔ خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا'' عائشہ کی چھوٹی بہن، آمنہ نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اندر لے جاتے ہوئے کہا۔

عائشہ کے قدم اٹھے تو جیسے سب کے مردہ جسموں میں جان آ گئی اور وہ بھی آہستہ آہستہ عائشہ اور آمنہ کے پیچھے پیچھے چلنے لگے، کچھ ہی دیر میں عائشہ یوں دکھائی دینے لگی تھی جیسے اس کے جسم سے سارا خون نچوڑ لیا گیا تھا، آمنہ نے اسے کمرے میں بچھی چارپائی پر لٹا دیا اور خود بھی اس کے پاس ہی چارپائی پر بیٹھی اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر تسلی دینے لگی، عائشہ کی ماں، بھابھیاں اور دونوں بچے اس کے پاس ہی افسردہ چہرے لیے ہمدردی جتا رہے تھے، ان سب کی ہمدردیاں پا کر ایک بار پھر عائشہ کا دل بھر آیا اور وہ آنسو بہانے لگی۔

''بھابھی۔ آپی کے لیے پانی لے کر آؤ'' آمنہ نے اپنی بھابھی کو پانی لانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''بس کر میری بچی۔ اتنا نہ رو۔ دیکھ بچے بھی جب سے آئے ہیں سہمے کھڑے ہیں۔ تم پریشان کیوں ہوتی ہو۔ ابھی ہم زندہ ہیں۔ لیکن تم مجھے کچھ بتاؤ تو سہی کہ ہوا کیا ہے، پھر دیکھنا میں ابھی تمہارے باپ اور بھائیوں کو فون کرتی ہوں۔ وہ خود ہی معاملے کو سنبھال لیں گے۔''

''میں بتاتی ہوں ماں۔ لیکن ابھی تم بھائیوں کو فون نہ کرو۔ وہ پریشان ہو کر ابھی دوڑے چلے آئیں گے''

''انہیں بتانا تو پڑے گا ناں۔''

''شام کو گھر آئیں گے تو آرام سے بیٹھ کر بات کر لیں گے۔'' عائشہ نے اپنی ماں کو سمجھایا اور پھر وہ تمام حالات بتانے لگی، جن کی وجہ سے اسے گھر چھوڑ کر وہاں آنا پڑا تھا۔

عائشہ نے اپنے گھر والوں کی پریشانی سے ڈرتے ہوئے اب تک جو باتیں ان سے چھپائی ہوئی تھیں، جب اس نے وہ تمام باتیں انہیں بتائیں تو انہوں نے حیران ہو کر اپنی انگلیاں منہ میں ڈال لیں اور ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، جیسے جیسے وہ کرم دین کے کرتوتوں سے پردہ اٹھاتی جا رہی تھی ان کی حیرانی بڑھتی جا رہی تھی۔

''واہ بیٹی واہ تم کرم دین کے ظلم اور زیادتیاں سہتی رہی اور ہمیں خبر تک نہ ہونے دی'' غفوراں نے بیٹی کی بات سن کر افسردہ لہجے میں بات کی۔

''جہاں تک ہو سکا۔ میں نے آپ لوگوں کو پریشانی سے بچانے کی کوشش کی اور کرم دین کو سمجھاتی رہی، لیکن جب حالات میرے بس سے باہر ہو گئے تو میں یہاں چلی آئی۔''

''اچھا۔اب تم آرام سے لیٹ جاؤ۔ میں تمہارے لیے ناشتہ بھجواتی ہوں، بچے بھی بھوکے ہوں گے، ان کو بھی کچھ کھانے کو دے دوں۔ بس اب تم نے اپنے دماغ پر زیادہ زور نہیں دینا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا''

''اچھا ماں۔'' عائشہ نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

اس کی بات سن کر غفوراں بچوں کو ساتھ لیے وہاں سے نکل گئی، اس کے جاتے ہی عائشہ کی دونوں بھابھیاں بھی کمرے سے چلی گئی تھیں، آمنہ وہیں چارپائی پر خاموشی سے بیٹھی عائشہ کے بالوں میں ہاتھ پھیرتی رہی، آمنہ کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے اور کمرے میں خاموشی کی وجہ سے عائشہ کی آنکھیں بند ہونے لگی تھیں، وہ رات بھر کی جاگی ہوئی تھی اس لیے جلد ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔ آمنہ کو جب اس بات کی تسلی ہوگئی کہ وہ سوگئی ہے تو اس نے اپنی گود میں رکھا ہوا عائشہ کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ سے اس کے سینے پر رکھ دیا اور خود اس قدر احتیاط سے چارپائی سے اٹھی کہ عائشہ کو اس کے اٹھنے کا احساس تک نہ ہو سکے اور وہ کچھ دیر سکون سے سو لے۔

آمنہ وہاں سے چلی گئی تھی، اس نے چارپائی سے اٹھتے وقت بہت احتیاط کی تھی مگر پھر بھی عائشہ کو محسوس ہو گیا تھا، لیکن اس نے جان بوجھ کر آنکھیں بند رکھی تھیں، آمنہ کے جانے کے بعد عائشہ آنکھیں بند کیے لیٹی تھی مگر اس کا ذہن کرم دین کے ساتھ گزارے ہوئے سالوں کا جائزہ لینے لگا تھا، وہ سوچنے لگی کہ اس نے ہر دکھ سکھ، مشکل وقت اور تنگ دستی میں کس طرح کرم دین کا ساتھ نبھایا تھا مگر اس شخص نے اس پر کسی بھی ذریعے سے دولت کمانے کو ترجیح دی تھی، سوچتے ہوئے وقت کا پہیہ الٹا چلنے لگا تھا۔

دروازہ کھلا، پھر کھل کر بند ہوا اور کرم دین اپنی سائیکل کے ساتھ منہ لٹکائے اندر داخل ہوا، کرم دین نے سائیکل ایک طرف کھڑی کی اور بوجھل قدموں کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتا ہوا صحن میں بچھی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گیا، وہ جان گئی تھی کہ پچھلے دنوں کی طرح آج بھی کرم دین کو کوئی کام نہیں ملا تھا اور وہ خالی ہاتھ لوٹ آیا تھا، اپنے مجازی خدا کی جانب دیکھ کر وہ تڑپ اٹھی اور تیزی سے کرم دین کے پاس پہنچ گئی۔

''کیا بات ہے کرم دین! بہت افسردہ دکھائی دے رہے ہو''

''اپنی زندگی میں دکھوں، تکلیفوں اور مصیبتوں کے سوا ہے ہی کیا''

''لگتا ہے آج پھر کوئی کام نہیں ملا''

عائشہ نے سوال کیا تو کرم دین نے ہاں میں گردن ہلا دی مگر زبان سے کوئی لفظ نہ نکالا۔

''اس میں پریشانی والی کیا بات ہے۔ آج کام نہیں ملا تو کل مل جائے گا'' عائشہ نے کرم دین کو تسلی دیتے ہوئے کہا اور پھر بولی ''اور خدا نخواستہ ایک دو دن کام نہیں ملے گا تو کیا ہم بھوکے مر جائیں گے''

''میں جانتا ہوں، گھر میں پکانے کے لیے کچھ بھی نہیں۔ پھر اس طرح دن کیسے گزریں گے''

''تم فکر نہ کرو۔ اللہ کا دیا ہوا اس گھر میں بہت کچھ ہے، بس تم منہ ہاتھ دھو کر آؤ، میں تمہارے لیے کھانا لاتی ہوں''

عائشہ کی بات سن کر کرم دین کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کیونکہ بے روزگاری کی وجہ سے گھر کی جو حالت ہو چکی تھی وہ اس سے پوشیدہ نہیں تھی اس لیے وہ بے یقینی کے عالم میں چارپائی سے اٹھا اور ہاتھ منہ دھونے لگا۔

کرم دین گھر آنے سے پہلے یہ سوچ کر آیا تھا کہ آج کی رات یقیناً بھوکے رہ کر ہی گزارنی پڑے گی مگر عائشہ کی بات اس کے لیے حیران کر دینے والی تھی، اس لیے اس نے بے یقینی کے عالم میں ہی منہ ہاتھ دھویا اور واپس آ گیا، وہ اب تک یہی سمجھ رہا تھا کہ شائد عائشہ اس کی بے بسی کا مزاق اڑا رہی ہے لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ چارپائی پر چھابی میں روٹی اور پلیٹ میں سالن پڑا تھا، پاس ہی پانی کا جگ اور گلاس بھی رکھا تھا، اس نے دوپہر کو بھی کچھ نہیں کھایا تھا، اسے سخت بھوک لگ رہی تھی، کھانا دیکھ کر اس کی بھوک اور بھی چمک اٹھی تھی، اس نے کسی ایسے شخص کی طرح کھانا پیٹ میں ڈالا جسے اس بات کی فکر ہو کہ اس نے جلدی سے نہ کھایا تو کھانا اس سے چھین لیا جائے گا، کھانا کھانے کے بعد اس نے اوپر تلے تین چار گلاس پانی کے بھی پیٹ میں انڈیل لیے تھے۔

کرم دین کے کھانا کھانے کے دوران عائشہ جان بوجھ کر اس کے پاس نہیں آئی تھی کہ کہیں وہ کھانے کے متعلق کوئی ایسا سوال نہ کر بیٹھے جس کا جواب اس کے پاس نہ ہو اور کھانا کھاتے ہوئے اس کے ہاتھ رک جائیں، کرم دین کے کھانا کھانے کے بعد عائشہ وہاں آئی اور خالی برتن اٹھا کر لے گئی، وہ جب تک واپس آئی کرم دین سو چکا تھا اور اس کے خراٹوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ کوئی بات کیے بغیر اس اطمینان کے ساتھ اپنی چارپائی پر لیٹ گئی تھی کہ اگر وہ بھوکی سو رہی ہے تو کم از کم اس کا شوہر تو کھانا کھا کر سویا ہے۔

ان کے سر پر اس قدر ادھار چڑھ چکا تھا کہ کوئی بھی دکاندار انہیں ادھار سودا دینے کے لیے تیار نہیں تھا، فیکٹری سے ملازمت چھوٹ جانے کے بعد کرم دین کئی دن سے بے کار پھر رہا تھا، اسے نہ کوئی ڈھنگ کا کام مل رہا تھا اور نہ ہی کوئی مزدوری وغیرہ مل رہی تھی، کچھ دن تو جیسے تیسے جوڑ توڑ کر کے گزر گئے تھے مگر اب بات فاقوں تک پہنچ گئی تھی، عائشہ کو معلوم تھا کہ اگر اسے کہیں محنت مزدوری کا کام مل بھی گیا تو جو تھوڑے بہت پیسے ملیں گے وہ تو شام کو ہی ملیں گے، اس وقت وہ تھکا ہارا گھر لوٹے گا، اسے بھوک بھی لگی ہوگی اور کھانا پکانے میں خاصی دیر لگ جاتی، اس لیے اس نے ہمسایوں کے ہاں بچوں کو بھیج کر تھوڑا سا سالن منگوا لیا تھا، ایک اور گھر سے وہ خود ادھار کے طور پر تھوڑا سا آٹا لے آئی تھی، اس آٹے کی روٹی پکا کر کچھ اس نے بچوں کو کھلا دی تھی اور باقی کی روٹی اس نے کرم دین کے لیے رکھ دی تھی، کرم دین کھانا کھا کر چارپائی پر لیٹا سکون کی نیند سویا خراٹے لے رہا تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ اس نے ایک بار جھوٹے منہ سے بھی اتنا نہیں پوچھا تھا کہ اس نے بھی کھانا کھایا ہے کہ نہیں۔

سوچوں کا دھارا نہ جانے اسے کس طرف بہالے جا رہا تھا، وہ جس واقعہ کے متعلق سوچ رہی تھی، وہ سالوں پہلے کا تھا مگر آج بھی سوچ کر اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں، بظاہر یہ چھوٹا سا واقعہ تھا مگر اس کے لیے انتہائی تکلیف دہ تھا، قریب تھا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی مگر اس نے کسی کے قدموں کی آواز سنی تھی، کوئی اسی طرف آ رہا تھا، اس لیے اس نے آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو پی لیا اور جلدی سے انہیں دوپٹے کے پلو سے صاف کر کے پھر سے آنکھیں یوں بند کر لیں جیسے وہ سو رہی تھی۔

''آپی۔'' آمنہ ٹرے میں ناشتہ رکھے کمرے میں آئی تو عائشہ کو سوتے دیکھ کر آہستہ سے آواز دی۔

غفوراں جب سے کمرے سے گئی تھی، مسلسل روئے جا رہی تھی اس لیے اس نے ناشتہ دے کر عائشہ کے پاس آمنہ کو بھیجا تھا، کیونکہ وہ جانتی تھی کہ وہ اس کا سامنا نہیں کر پائے گی، آمنہ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھی، دونوں بہنوں کا آپس میں پیار بھی بہت تھا، اور آمنہ بھی اپنی بہن کے پاس بیٹھ کر باتوں سے اس کا دل بہلانا چاہتی تھی۔

آمنہ کی آواز پر عائشہ نے آنکھیں کھول دیں اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے ''ہوں'' کہا۔

''آپی ناشتہ کر لو۔'' آمنہ نے ٹرے ہاتھوں میں لیے کھڑے کھڑے بات کی۔

''میرا دل نہیں چاہ رہا۔''

''آپی تھوڑا سا ہی کھا لیں۔''

''میں نے کہا ناں مجھے بھوک نہیں۔''

''چلیں۔ آج میں اپنی آپی کو خود اپنے ہاتھوں سے کھلاتی ہوں۔'' ٹرے ایک طرف رکھتے ہوئے آمنہ نے عائشہ کو اٹھاتے ہوئے کہا۔

''مجھے..... بھوک..... نہیں ہے..... سمجھی تم۔'' عائشہ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔

عائشہ جس انداز میں بولی تھی، آمنہ کو اس کا دکھ پہنچا تھا مگر اس نے اپنے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات ظاہر نہ ہونے دیے اور پیار سے بولی۔

''جب میں اپنی آپی کو اپنے پیارے پیارے ہاتھوں سے کھلاؤں گی تو پھر دیکھنا بھوک نہیں بھی ہوگی تو کھانے کا کتنا مزہ آئے گا''

آمنہ کی بات سن کر عائشہ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے مگر وہ جانتی تھی کہ وہ جس حالت سے گزر رہی ہے ایسے میں ایک نوالہ بھی اس کے حلق سے نیچے نہیں اتر پائے گا۔

''جب میں نے ایک بار کہہ دیا۔ میں نے کچھ نہیں کھانا۔ تو پھر کیوں ضد کیوں کیے جا رہی ہو۔ خدا کے لیے جاؤ یہاں سے اور مجھے اکیلا چھوڑ دو۔'' عائشہ چیخی۔

آمنہ کا خیال تھا کہ وہ اپنی آپی کو منا لے گی، اس کے لیے اس نے کوشش بھی کی تھی مگر عائشہ نے اپنی ضد نہ چھوڑی اور اسے بری طرح ڈانٹ دیا، بہن کی بات سن کر آمنہ کی آنکھوں میں بھی آنسو تیرنے لگے تھے، اس نے اس خیال سے کہ کہیں اس کے آنسو اس کی بہن کو اور کمزور نہ کر دیں، ٹرے اٹھائی اور جلدی سے وہاں سے نکل گئی۔

آمنہ کے جانے کے بعد عائشہ خوب پھوٹ پھوٹ کر روئی، وہ دیر تک آنسو بہاتی رہی مگر اس کے پاس کمرے میں کوئی نہ آیا، آمنہ نے اپنی ماں کو جو حالت باہر جا کر بتائی تھی وہ جان کر نہ غفوراں خود آئی اور نہ ہی اس نے کسی اور کو کمرے میں جانے کی اجازت دی، اس نے دونوں بچوں کو بھی اپنے پاس بٹھائے رکھا کہ کہیں انہیں دیکھ کر عائشہ مزید پریشان نہ ہو جائے، دیر تک روتے رہنے سے عائشہ کے سر کا بوجھ قدرے ہلکا ہو گیا تھا پھر آہستہ آہستہ خود ہی اس کی آنکھیں بوجھل ہوتی چلی گئیں اور وہ سو گئی۔

☆☆☆☆☆

عائشہ اور بچوں کو گھر میں نہ پا کر ایک پل کے لیے کرم دین کو ہلکا سا جھٹکا لگا تھا مگر پھر اگلے ہی لمحے بیوی اور بچوں کو غیر اہم جان کر اس نے اپنے ذہن سے سب کچھ جھٹک دیا، کرم دین کو اس بات کا مکمل یقین تھا کہ عائشہ بچوں کو لے کر اپنے والدین کے سوا کہیں اور نہیں گئی ہوگی، وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ والدین کے علاوہ کہیں اور بھی گئی ہوگی پھر بھی اسے اس کی کیا پرواہ، اسے یہ سوچ کر ہی اطمینان ہو رہا تھا کہ کم از کم اب اس کی بے وقت کی نصیحتوں اور روک ٹوک سے جان چھوٹی رہے گی۔

بیوی بچوں کے جانے پر کرم دین خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا، وہ خود کو اس پنچھی کی طرح سمجھ رہا تھا جسے مدت کے بعد رہائی ملی ہو، اس کے استری کیے ہوئے کپڑے الماری میں رکھے تھے، اس نے نہانے کے بعد وہ کپڑے پہنے، خوشبو لگائی اور اچھی طرح تیار ہو کر اپنے حجرے میں چلا گیا، وہاں اس نے بہت سی اگر بتیاں جلا دیں، اگر بتیوں کے دھوئیں سے کمرے میں تیز خوشبو پھیل گئی تھی، پھر اس نے قوالیوں کی کیسٹ لگا دی اور دیوار سے ٹیک لگا کر اپنی آنکھیں بند کیے ہلکا ہلکا سر دھننے لگا۔

کچھ دیر اسی سرور کی سی کیفیت میں گزر گئی، اس کی آنکھیں بند تھیں اور اسے اپنے اردگرد کی کوئی ہوش نہیں تھی، کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی تھی، دستک سن کر کرم دین نے آنکھیں کھول دیں، اسی لمحے ایک ماڈرن خاتون کمرے میں داخل ہوئی، اگر بتیوں سے نکلنے والے دھوئیں کی وجہ سے کمرے کی فضا بوجھل تھی، جیسے ہی وہ خاتون کمرے میں داخل ہوئی، خوشبو کا ایک جھونکا بھی کمرے میں داخل ہوا جو کرم دین کے جسم و جان کو معطر کر گیا، کرم دین کو اسے پہچاننے میں ذرا سی بھی دیر نہیں لگی تھی، اسے اچھی طرح یاد تھا کہ وہ وہی عورت تھی جو کچھ روز پہلے ہی اپنی بہو کو طلاق دلوانے کے لیے اس سے تعویز لے کر گئی تھی۔

وہ ماڈرن خاتون کرم دین کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گئی تھی، ساتھ ہی ایک اور عورت جو اپنی شکل وصورت اور پہناوے سے ملازمہ دکھائی دیتی تھی، ہاتھوں میں مٹھائی کا ڈبہ اور اس کے اوپر رکھا ہوا ایک مردانہ سوٹ لیے اندر داخل ہوئی، ملازمہ نے مٹھائی کا ڈبہ اور سوٹ کرم دین کے سامنے رکھ دیا اور خود اپنی مالکن سے تھوڑا سا ہٹ کر بیٹھ گئی۔

''سائیں جی! یہ مٹھائی اور کپڑوں کا جوڑا آپ کی نذر ہے۔'' خاتون نے دونوں چیزیں اٹھا کر کرم دین کے آگے رکھتے ہوئے کہا اور پھر اپنے پرس میں سے ہزار ہزار کے پانچ نئے نوٹ نکال کر کرم دین کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''اور یہ وہ رقم ہے جس کا میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا''

مٹھائی اور سوٹ دیکھ کر کرم دین کو کوئی زیادہ خوشی نہیں ہوئی تھی لیکن جب عورت نے ہزار ہزار کے نئے نوٹ اس کی ہتھیلی پر رکھے تو کرم دین کے ہونٹوں پر ہلکی ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''میں نے تو آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ آپ سائیں کرم دین کے پاس چل کر آئی ہیں، اور یہاں جو بھی آتا ہے جھولیاں بھر کر لے جاتا ہے اور اپنے دل کی سبھی مرادیں پوری کر لیتا ہے'' مٹھائی کا ڈبہ، سوٹ اور ان پر پانچ ہزار روپے رکھ کر کرم دین نے ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

''سچ کہا سائیں جی آپ نے۔ واقعی اس ڈائن سے جس طرح آپ نے میری اور میرے بیٹے کی جان چھڑائی ہے، وہ آپ کا ہی کام تھا، بس اب میرا ایک کام اور کر دیجیے، پھر جس قدر کہیں گے میں آپ کی خدمت کر دوں گی''

''سائیں کرم دین تو بیٹھا ہی لوگوں کی خدمت کے لیے ہے۔ آپ بتائیں مسئلہ کیا ہے''

''بس سائیں جی۔ کچھ ایسا کر دیجیے جہاں میں بیٹے کی شادی کرنا چاہوں۔ وہ انکار نہ کرے''

''اس طرح کا کام تو اور بھی بہت سے لوگ کر دیں گے۔ لیکن مزہ تو اس بات میں ہے کہ جہاں آپ اپنے بیٹے کی شادی کرنا چاہتی ہیں، اس کے لیے وہ خود آپ سے کہے''

''کیا ایسا ممکن ہے سائیں جی؟''

''سائیں کرم دین اور دوسرے عاملوں میں یہی تو فرق ہے''

کرم دین کی بات سن کر عورت نے اپنا پرس کھولا اور ایک ہزار روپے کا کڑکڑاتا ہوا نوٹ کرم دین کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی ''سائیں جی فی الحال آپ یہ رکھ لیجیے''

ہزار کا نوٹ دیکھ کر کرم دین کا دل چاہا کہ وہ جلدی سے وہ نوٹ عورت کے ہاتھوں سے جھپٹ لے لیکن وہ جان چکا تھا کہ وہ موٹی آسامی ہے

اوراس سے مزید رقم نکلوانا کوئی زیادہ مشکل نہیں، اس لیے اس نے خود کو کنٹرول کیا اور حیران کن لہجے میں بولا۔ ''اتنے بڑے کام کے اتنے سے پیسے۔ بی بی کہیں آپ میرے ساتھ مزاق تو نہیں کر رہیں''

''سائیں جی ابھی آپ یہ تو رکھیں، کام ہونے پر اور بھی دوں گی''

''بی بی اگر یہ کام کروانا ہے تو ایڈوانس کے طور پر آپ کو دس ہزار تو دینے ہی ہوں گے''

کرم دین کی بات سن کر وہ عورت کچھ سوچ میں پڑ گئی اور پھر کوئی بات کیے بغیر پرس میں سے گن کر نو ہزار روپے نکال کر پہلے سے پکڑے ہوئے نوٹ کے ساتھ ملاتے ہوئے کرم دین کو پکڑا دیے اور بولی۔ ''لیں سائیں جی، پورے دس ہزار ہیں لیکن اب میرے کام میں دیر نہیں ہونی چاہیے''

''بی بی آپ بے فکر ہو کر گھر جائیں اور سائیں کرم دین کیا کر کے دکھاتا ہے اس کا انتظار کریں'' کرم دین نے رقم پکڑ کر گنے بغیر پہلے والے نوٹوں پر رکھتے ہوئے کہا۔

''اچھا سائیں جی۔ اب ہمیں اجازت دیں'' عورت نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

اسے اٹھتا دیکھ کر پاس بیٹھی ہوئی ملازمہ بول پڑی ''باجی..... وہ.....''

ملازمہ کی بات سن کر جیسے اچانک اسے کچھ یاد آ گیا اور وہ اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گئی اور کرم دین کی طرف دیکھتے ہوئے بولی ''اور ہاں' سائیں جی اس بے چاری کو بھی کوئی تعویز دے دیں۔ اس کا گھر والا اسے بات بات پر مارتا پیٹتا ہے''

کرم دین نے ملازمہ سے کوئی بھی سوال کیے بغیر کاغذ قلم اٹھایا اور تعویز لکھنے لگا، تعویز بنانے میں کرم دین کو چند منٹ لگے، اس نے کاغذ قلم ایک طرف رکھا اور ملازمہ کی طرف تعویز بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''یہ دو تعویز ہیں، ان میں سے ایک اپنے بازو پر باندھ لینا اور دوسرا کسی طرح پانی میں گھول کر اپنے گھر والے کو پلا دینا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا''

ملازمہ نے تعویز پکڑ کر اپنے بائیں ہاتھ میں سنبھال لیے اور ایک سو کا نوٹ، جو اس نے مضبوطی سے اپنی مٹھی میں تھام رکھا تھا اور ہاتھوں میں آنے والے پسینے سے گیلا ہو چکا تھا، کرم دین کی طرف بڑھا دیا، کرم دین نے سو کا نوٹ لے کر کوئی بات کیے بغیر پہلے والے نوٹوں کے ساتھ رکھ دیا، ساتھ ہی دونوں خواتین اٹھ گئیں اور خدا حافظ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئیں۔

وہ دونوں کمرے سے نکلیں تو کرم دین نے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنے کان ان کے قدموں کی آواز پر لگا دیے، آہستہ آہستہ قدموں کی آواز دور ہوتی چلی گئی اور پھر دروازہ بند ہونے کی آواز اس کے کانوں میں پڑی، دروازہ بند ہونے کی آواز سن کر اسے اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ دونوں ہی باہر چلی گئی ہیں، کرم دین کو جب اس بات کی تسلی ہو گئی کہ وہ دونوں گھر سے نکل گئی ہیں تو اس نے نوٹ اٹھا کر گنے اور پھر احتیاط سے اپنی قمیض کی جیب میں ڈال لیے، رقم جیب میں ڈال کر اس نے جیب کو اچھی طرح تھپتھپایا، پھر مٹھائی کا ڈبہ کھول کر اس میں سے اپنی پسند کی مٹھائی کھائی اور ڈبہ اسی طرح بند کر ایک طرف رکھ دیا۔

نوٹوں کو جیب میں ڈالنے اور مٹھائی کھانے سے فارغ ہو کر کرم دین نے وہی قوالیوں والی کیسٹ لگا لی جو وہ ان عورتوں کے آنے سے پہلے سن رہا تھا، قوالی سنتے ہوئے وہ پہلے بھی ہلکا ہلکا سر دھن رہا تھا مگر جیب میں رکھے ہوئے ہزار ہزار کے نوٹوں نے اس پر عجیب سا خمار چڑھا دیا تھا اور وہ نیم مدہوشی کے عالم میں جھوم رہا تھا۔

چاچی خبری دیر تک باہر گلی میں کھڑی دروازہ پیٹتی رہی مگر جب کسی نے بھی آ کر دروازہ نہ کھولا تو اس نے دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا اور دروازہ کھل گیا، اسے اپنی بیوقوفی پر غصہ بھی آ رہا تھا کہ وہ پاگلوں کی طرح دروازہ پیٹتی رہی جبکہ دروازہ تو پہلے سے کھلا تھا، اندر آتے ہی چاچی نے اپنا برقعہ اتار کر ہاتھ میں پکڑ لیا اور گھر میں ادھر ادھر عائشہ کو ڈھونڈنے لگی، وہ حیران تھی کہ وہ سب کہاں چلے گئے تھے، وہاں سے ناکامی کے بعد وہ اس کمرے کی طرف آ گئی جو کرم دین نے اپنے لیے مخصوص کر رکھا تھا اور جہاں سے قوالیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی، دروازہ بند تھا، جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا، کرم دین نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور سمٹ کر بیٹھ گیا۔

''آ جا..... چاچی آ جا۔''

''میں نے گھر میں ہر جگہ دیکھ لیا عائشہ کہیں دکھائی نہیں دے رہی۔ کہیں گئی ہے کیا؟'' چاچی نے کرم دین کے سامنے بیٹھتے ہوئے دریافت کیا۔

''وہ تو بچوں کے ساتھ اپنے مائیکے گئی ہے۔تم اپنی سناؤ۔اب تمہاری بہو اور بیٹا تو تمہارے ساتھ ٹھیک ہیں ناں؟''
''میں جھوٹ کیوں بولوں۔ سچی بات ہے، وہ دونوں ہی اب میری بہت خدمت کرتے ہیں۔''
''دیکھ لو چاچی پھر۔تم کتنی پریشان تھی۔''
''مجھے وہ سب کچھ یاد ہے جو تم نے میرے لیے کیا۔اسی لیے تو اٹھتے بیٹھتے تمہارے لیے میرے دل سے دعائیں نکلتی ہیں''
''اچھا چلو چھوڑو ان باتوں کو۔لو مٹھائی کھاؤ'' کرم دین نے مٹھائی کا ڈبہ چاچی کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔
''عائشہ کب تک آجائے گی؟'' چاچی خیری نے مٹھائی کھاتے ہوئے سوال کیا۔
''وہ مرضی کی مالک ہے چاچی! دیکھیں کتنے دن بعد آتی ہے''
''چلو اچھا۔اپنے ماں باپ کے پاس گئی ہے کچھ دن رہ لے گی۔'' بات کرتے کرتے چاچی نے مٹھائی کے شیرے سے بھری انگلیاں اپنی زبان سے چاٹیں اور کھڑی ہوگئی۔
''بس چاچی جارہی ہو؟''
''عائشہ کو دیکھے کئی دن ہوگئے تھے۔اسے ملنے کو بہت دل چاہ رہا تھا اس لیے چلی آئی تھی۔اب وہی نہیں ہے تو بیٹھ کر کیا کروں؟''
''چاچی اگر جارہی ہو تو میرا ایک چھوٹا سا کام کردو گی؟''
''ہاں..... ہاں..... کیوں نہیں۔بتاؤ کیا کام ہے؟''
''بس جاتے جاتے مبارک کو دیکھ لینا، اگر وہ گھر میں ہو تو اسے کہنا کرم دین نے بلوایا ہے۔''
''تم بے فکر رہو۔میں کہہ دوں گی'' چاچی نے اتنا کہا اور برقعہ لیتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔
محلے میں اور بھی بہت سے لوگ تھے جن کے پاس کرم دین کا اٹھنا بیٹھنا تھا مگر ان میں سے زیادہ تر لوگ کرم دین کے نئے روپ سے خوش نہیں تھے، مبارک محلے کا وہ واحد فرد تھا جسے اس نے پہلے ہی دن سے بہت متاثر کیا تھا اور وہ کرم دین کا گرویدہ ہوگیا تھا، کرم دین کے پاس آنے والوں کی زیادہ تعداد محلے سے باہر کے لوگوں کی تھی، ایسا کم کم ہی ہوتا تھا کہ کوئی میاں جی کے ہوتے ہوئے اس کے پاس آیا ہو، کیونکہ کرم دین کا ماضی ان سے بھولا ہوا نہیں تھا۔
چاچی نے مبارک کو کرم دین کا پیغام دے دیا تھا، پیغام ملتے ہی مبارک نے اپنے دوست، صابر کو بھی ساتھ لے لیا اور کرم دین کے ہاں پہنچ گیا، وہ دونوں بار بار دروازے پر دستک دے رہے تھے مگر قوالیوں کی کیسٹ لگی ہونے کی وجہ سے ان کے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز کرم دین تک نہیں پہنچ رہی تھی۔وہ دونوں واپس جانے والے تھے کہ اسی لمحے کرم دین نے کیسٹ تبدیل کرنے کے لیے ٹیپ ریکارڈر بند کی تو دروازہ پیٹے جانے کا شور اس کے کانوں میں پڑا، وہ یہ سوچ کر کہ جانے کوئی کب سے دروازے پر دستک دے رہا تھا، جلدی سے کمرے سے باہر نکل آیا اور دروازہ کھول دیا۔
''لگتا ہے کافی دیر سے دروازے پر دستک دے رہے ہو؟'' کرم دین نے مبارک اور صابر کو دروازے پر کھڑے دیکھ کر کہا۔
''ہم تو بہت دیر سے دروازہ کھٹکھٹا رہے ہیں لیکن کوئی کھول ہی نہیں رہا تھا بلکہ اب تو ہم تھک ہار کر واپس جانے والے تھے۔'' مبارک نے کرم دین سے شکوہ کیا۔
''بس یار میں نے سنا ہی نہیں۔مگر جب میرے کانوں میں دروازہ کھٹکنے کی آواز پڑی تو میں دوڑتا ہوا آگیا'' کرم دین نے اپنی صفائی پیش کی پھر خود ہی بولا ''تم باہر کیوں کھڑے ہو؟ اندر آجاؤ۔''
بات کرتے ہی کرم دین اپنے کمرے کی طرف چل پڑا اور وہ دونوں بھی اس کے پیچھے پیچھے ہولیے ''تمہارا پیغام ملا تھا۔خیر سے بلایا تھا؟'' کمرے میں بیٹھتے ہی مبارک نے سوال کیا۔
''تم سے ملے کافی دن ہوگئے تھے۔اس لیے پیغام بھجوادیا''
''جب چاچی نے تمہارا پیغام دیا۔میں تو ڈر ہی گیا تھا۔''
''ارے نہیں یار۔ایسی پریشانی والی کوئی بات نہیں۔'' کرم دین نے مبارک کو تسلی دی اور مٹھائی کا ڈبہ کھول کر ان دونوں کے سامنے رکھتے ہوئے بولا ''پریشانی ختم کرو اور یہ کھاؤ''

''یہ کیا ہے؟'' مبارک نے مٹھائی کا ایک ٹکڑا اٹھا کر منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔
''ہے تو مٹھائی۔ مگر تم اسے سائیں کرم دین کا بھنڈارہ سمجھ کر کھا جاؤ۔''
''بڑی موجیں منا رہے ہو۔ لگتا ہے کام خوب چل نکلا ہے۔''
''میں نے یہ سب پانے کے لیے محنت بھی تو بہت کی ہے۔ اب اگر محلے والے میرے پاس نہیں آتے تو کیا ہوا۔ اور تھوڑی دنیا ہے۔''
''محلے والوں پر بھی اپنا کچھ اثر ڈالو۔ پھر وہ بھی آنے لگیں گے''
''مجھے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم بھی یہیں ہو اور میں بھی یہیں ہوں۔ خود ہی دیکھ لینا۔ یہی لوگ ہوں گے جو میرے پیچھے پیچھے پھریں گے۔'' کرم دین نے بات کی۔
مبارک، کرم دین کی بات کا جواب دیے بغیر مٹھائی کھاتا رہا، پھر مٹھائی حلق سے اتارتے ہوئے بولا'' ویسے مٹھائی کے ساتھ چائے بھی ہوتی تو مزا آجاتا۔'' مبارک نے بات کی اور پھر صابر سے اپنی بات کی تصدیق کروانے کے لیے بولا'' کیوں بھئی صابر؟ کیا خیال ہے؟''
صابر نے ابھی تک کوئی بات نہیں کی تھی، جب مبارک نے اس سے اپنی بات کی تصدیق چاہی تو وہ فوراً اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بولا ''بات تو تمہاری صحیح ہے، مٹھائی ہو اور ساتھ چائے نہ ہو تو کچھ مزا نہیں آتا''
''تم مٹھائی کھاؤ۔ میں چائے کا بندوبست کرتا ہوں'' کرم دین نے بات کی اور ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا۔
''تم کہاں جا رہے ہو؟'' کرم دین کو اٹھتا دیکھ کر مبارک نے دریافت کیا پھر خود ہی بولا'' ہمیں گھر کی بنی ہوئی چائے نہیں چاہیے۔''
''تو بازار سے منگوا دیتا ہوں۔''
''نہیں چائے وہاں سے آنی چاہیے جہاں سے اس روز سگریٹ کی ڈبی آئی تھی۔'' مبارک نے کرم دین کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔
مبارک کی بات سن کر کرم دین چھت کو دیکھتے ہوئے منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا، کرم دین کے منہ سے جو الفاظ ادا ہو رہے تھے، ان دونوں کو ہی اس کی کوئی سمجھ نہیں آ رہی تھی، اس لیے وہ خاموشی سے بیٹھے کرم دین کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہے تھے، پھر کرم دین نے بڑبڑانا بند کر دیا اور پہلے کی طرح ان دونوں سے باتیں کرنے لگا، اس وقت ان دونوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے جب کچھ ہی دیر بعد ان تینوں کے سامنے چائے کے کپ رکھ دیے گئے تھے، جن میں سے باقاعدہ بھانپ اٹھ رہی تھی، مبارک اس قسم کا مظاہرہ پہلے بھی دیکھ چکا تھا، اس لیے اس کی حیرت صابر کی نسبت بہت کم تھی جبکہ صابر دیر تک بے یقینی کی حالت میں ادھر ادھر دیکھتا رہا اور چائے پیتے ہوئے بھی اس کے ذہن میں مسلسل یہی سوال اٹھتا رہا کہ اس نے کمرے میں کسی کو آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا پھر گرم گرم چائے کے کپ ان کے سامنے کون رکھ گیا تھا۔

☆☆☆☆☆

غفوراں نے عائشہ کی زبانی تمام حالات سنے تو وہ کمرے سے نکل کر اکیلی بیٹھی دیر تک یہ سوچتی رہی کہ وہ اس بارے میں اپنے خاوند اور بیٹوں کو بھی اطلاع کر دے یا پھر شام تک ان کے آنے کا انتظار کرے، وہ دیر تک خود سے لڑتی رہی کہ اگر ابھی اطلاع دی تو وہ نہ جانے کیا سوچ بیٹھیں، لیکن پھر اسے خیال آتا کہ اگر اس نے ابھی اطلاع نہ دی اور شام تک ان کے آنے کا انتظار کیا تو کہیں وہ اس بات سے خفا نہ ہو جائیں کہ انہیں اسی وقت کیوں نہیں بتایا۔
دیر تک غفوراں اسی کشمکش میں رہی کہ اسے کیا کرنا چاہیے مگر اس سے فیصلہ نہیں ہو پا رہا تھا، آخر کار دل نے اپنا فیصلہ سنا دیا اور اس نے اپنے خاوند اور بیٹوں کو دبے لفظوں میں اطلاع کر دی، غفوراں کے فون کرنے کے تھوڑی ہی دیر بعد وہ تینوں گھر آ گئے۔
عائشہ کا باپ اور بھائی اس سے ملنا چاہتے تھے مگر اس وقت وہ سو رہی تھی، اس لیے وہ بھی دوسرے کمرے میں بیٹھ گئے، تمام حالات جان کر عائشہ کا باپ گردن جھکا کر کسی سوچ میں پڑ گیا تھا مگر اس کا بڑا بھائی اکرم غصے سے چیخا'' کرم دین کی اتنی جرات کہ وہ ہماری بہن کے ساتھ کوئی زیادتی کرے۔ ہم اس کی ٹانگیں نہ توڑ دیں گے۔''
''وہ کیا سمجھتا ہے ہم نے چوڑیاں پہن رکھی ہیں۔ جو اپنی بہن کے ساتھ ہونے والی زیادتی پر خاموشی سے بیٹھے رہیں گے۔'' اکرم کے بعد اکبر بھی دھاڑا۔
''اس طرح کے معاملات جوش سے نہیں ہوش سے حل ہوتے ہیں۔'' مشتاق نے اپنے دونوں بیٹوں کو سمجھایا۔
''تم کچھ بھی کہو ابا۔ میں نے کرم دین کی ٹانگیں ضرور توڑنی ہیں۔ ذرا اس کی جرات تو دیکھو دو ٹکے کا آدمی ہو کر ہماری بہن کو دھتکار رہا ہے۔''

''پہلے عائشہ سے بات کرلیں۔ پھر سوچیں گے کیا کرنا ہے'' مشتاق نے تحمل سے بات کی، پھر آمنہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا'' آمنہ تم جا کر دیکھو وہ اٹھ گئی ہے یا ابھی تک سو رہی ہے؟''

باپ کی بات سن کر آمنہ فوراً عائشہ کے متعلق جاننے کے لیے کمرے سے نکل گئی، آمنہ کا خیال تھا کہ وہ رات بھر جاگتی رہی ہے اس لیے ابھی تک سو رہی ہوگی لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ وہ جب سے آئی تھی سو نہیں پائی تھی، آمنہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی کمرے میں آئی تھی پھر بھی عائشہ نے اس کے قدموں کی آہٹ سن لی تھی، آمنہ جب کمرے میں داخل ہوئی تو عائشہ کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ اسے دیکھ کر اٹھ بیٹھی تھی۔

''لیٹی رہو آپی۔'' آمنہ نے عائشہ کو اٹھتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

''میں کوئی مریض ہوں کیا؟''

''اللہ نہ کرے میری آپی کو کبھی کوئی بیماری آئے۔ میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ تم تھکی ہوئی ہو لیٹی رہو''

''بچے کہاں ہیں؟''

''تم فکر نہ کرو۔ وہ بچوں کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔ ابا اور بھائی آئے ہوئے ہیں۔ وہ تمہارے پاس آنا چاہ رہے تھے اس لیے مجھے دیکھنے بھیجا ہے کہ تم سو رہی ہو یا جاگ رہی ہو''

''انہیں اس طرح فون پر اطلاع دینے کی کیا ضرورت تھی۔ شام کو وہ گھر آتے تو سکون سے بیٹھ کر بھی بات کی جاسکتی تھی''

''میں نے تو نہیں بلایا ناں آپی! اماں نے خود ہی اطلاع دی ہے، اس میں میرا کیا قصور ہے؟''

''اچھا چلو چھوڑو ان باتوں کو۔ میں وہیں چلتی ہوں۔ جہاں سب بیٹھے ہیں'' عائشہ نے یہ کہتے ہوئے چارپائی چھوڑ دی اور آمنہ کے ساتھ چل پڑی۔

آمنہ کے ساتھ عائشہ کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تو عائشہ کا باپ اور بھائی اپنی جگہ سے اٹھ گئے، باپ نے آگے بڑھ کر بیٹی کو گلے لگا لیا اور پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا، وہ باپ کے سینے سے لگی تو ان دونوں کے آنسو بہہ نکلے، عائشہ باپ کے سینے سے لگی رو رہی تھی، اس کا باپ بھی آنسو بہا رہا تھا، دونوں بھائیوں نے بھی آگے بڑھ کر باری باری اسے چپ کرایا اور اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا، تمام اہل خانہ اپنی اپنی جگہ آنسو بہا رہے تھے، عجیب سوگوار ماحول تھا، ہر آنکھ اشک بار تھی۔

''بس عائشہ بس۔'' بھائی نے بہن کو چپ کرانے کے لیے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''تم کیوں روتی ہو۔ ابھی ہم زندہ ہیں۔ روئے گا تو کرم دین، جب اس کے ہاتھ پاؤں توڑ کر ہم اسے اپاہج بنا دیں گے۔''

''لیکن یہاں آنے سے پہلے ہمیں کرم دین کے بارے میں بھی کوئی خبر تو دی ہوتی۔ پھر کم از کم تمہیں اس طرح گھر چھوڑنا نہ پڑتا۔''

''اب بھی کچھ نہیں بگڑا ابا۔ ابھی چلتے ہیں، خود ہی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا'' بھائی نے جزباتی ہو کر بات کی۔

''تم زیادہ بے صبرے نہ ہو۔ مجھے عائشہ سے بات کر لینے دو۔ اس کی بات سن کر ہی کچھ فیصلہ ہو سکتا ہے۔'' باپ نے بیٹے کو سمجھایا، پھر عائشہ کو چارپائی پر بٹھاتے ہوئے بولا۔ ''تم سکون سے مجھے ساری بات بتاؤ۔ تاکہ ہم کرم دین سے کوئی بات کر سکیں۔''

عائشہ تمام حالات و واقعات ماں کو سنا چکی تھی، اب باپ کے پوچھنے پر وہ تمام باتیں پھر سے دہرانے لگی، بات کرتے ہوئے کئی بار اس کی آنکھیں ڈبڈبائیں، کئی بار آنسو بہے مگر وہ سب کچھ بتاتی رہی، جب عائشہ بات مکمل کر چکی تو باپ نے ایک ٹھنڈی سانس چھوڑی اور بولا۔ ''تم اپنے گھر میں بیٹھی ہو۔ روتی کیوں ہو۔ میں اور تمہارے بھائی کرم دین کے پاس جاتے ہیں۔'' مشتاق نے بات کی اور بات کرتے ہی اٹھ کھڑا ہوا، باپ کو اٹھتا دیکھ کر دونوں بیٹے بھی اٹھ گئے تھے، پھر ایک ایک کر کے سبھی اپنی اپنی جگہ اٹھ کھڑے ہوئے، وہ تینوں نکل گئے تو عائشہ کی ماں اسے پیار کرتے ہوئے تسلی دینے لگی۔

☆☆☆☆☆

مبارک اور صابر مٹھائی کے ساتھ چائے سے لطف اندوز ہونے کے بعد وہاں سے چلے گئے تھے، کرم دین بہت خوش تھا، زندگی میں پہلی بار اس نے ایک ساتھ اتنی رقم دیکھی تھی، اس سے قبل بھی تھوڑے تھوڑے کر کے کچھ نہ کچھ رقم آنے لگی تھی مگر ایک ہی دن میں ہزاروں روپے اس کی جیب میں آجانا اس کے لیے بہت زیادہ خوشی کا باعث بنا تھا، جیب میں ڈالے ہوئے نوٹوں کو تھپتھپانے کے بعد اسے یقین ہونے لگا تھا کہ اب وہ دن زیادہ دور نہیں، جن کے لیے اس نے بہت کچھ سوچ رکھا تھا۔

کرم دین سکون سے چارپائی پر لیٹا خواب بن رہا تھا کہ دروازے پر لگی کنڈی کی کھٹ کھٹ نے اس کا سارا تسلسل توڑ کر رکھ دیا، وہ بے دلی سے اٹھا اور کنڈی کھول دی، وہاں عائشہ کا باپ اور بھائی کھڑے تھے، وہ انہیں دیکھ کر پریشان ہوئے بغیر نہ رہ سکا کیونکہ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ لوگ اتنی جلدی آجائیں گے، کرم دین ان کے چہروں کو دیکھ کر ہی جان گیا تھا کہ وہ بہت غصے میں ہیں۔

''آیئے آیئے۔ اندر آجایئے۔'' کرم دین نے اس ڈر سے کہ وہ کہیں وہیں کھڑے ہی اسے برا بھلا نہ کہنے لگیں، خود ایک طرف ہو کر انہیں گزرنے کا راستہ دیتے ہوئے کہا۔

''ہم یہاں بیٹھنے نہیں آئے کرم دین۔'' اکرم نے تلخ لہجے میں بات کی۔

''تم لوگ اندر تو آؤ۔ پھر ہی بات ہو سکے گی ناں۔'' کرم دین نے انتہائی دھیمے لہجے میں بات کی۔

کرم دین کی بات سن کر تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، اور پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں بات کرتے ہوئے کرم دین کی بات مان لینے کا پروگرام بنالیا، سب سے پہلے مشتاق نے گھر میں قدم رکھا تھا پھر اکرم اور اکبر بھی باپ کے پیچھے پیچھے ہو لیے تھے، جب وہ تینوں ہی اندر آ گئے تو کرم دین نے دروازہ بند کر دیا اور ان کے ساتھ ساتھ ہو لیا۔

''تم لوگ بیٹھو۔ میں چائے لے کر آتا ہوں'' کرم دین نے انہیں کمرے میں بٹھاتے ہوئے کہا۔

''تم چائے پانی کو چھوڑو اور ادھر ہمارے پاس آ کر بیٹھو۔ ہم نے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔'' مشتاق نے کرم دین کو باہر جانے سے روکتے ہوئے کہا۔

''چاچا باتیں بھی ہو جاتی ہیں۔ پہلے تھوڑی سی چائے تو پی لو۔ بس میں ابھی دو منٹ میں واپس آتا ہوں'' کرم دین نے بات کی اور کوئی جواب سنے بغیر تیزی سے وہاں سے نکل گیا۔

وہ تینوں ہی گھر سے کرم دین سے بات کرنے کے لیے وہاں سے آئے تھے مگر وہ ان سے بات کرنے کی بجائے چائے پانی میں پڑ گیا تھا، کرم دین نے چائے لے کر واپس آنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی، مگر وہ جب تک نہیں آیا تھا وہ تینوں وہاں غصے کی حالت میں بیٹھے رہے۔

کرم دین نے چائے دانی سے چائے کپوں میں ڈالی اور ٹرے میں رکھ کر ان تینوں کے سامنے رکھ دی، ان تینوں نے ہی تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد اپنا اپنا کپ پکڑ لیا تھا۔

''کیا تم یہ بتا سکتے ہو کہ تم نے عائشہ کو گھر سے کیوں نکالا'' مشتاق نے بات کا آغاز کیا۔

''کیا تم نے اسے لاوارث سمجھ رکھا ہے؟'' کرم دین کے جواب دینے سے پہلے اکرم نے ایک اور سوال کر ڈالا۔

''خدا گواہ ہے چاچا! وہ اپنی مرضی سے گھر چھوڑ کر گئی ہے۔ میں نے اسے گھر سے نہیں نکالا''

''تو کیا اس کا دماغ خراب ہے کہ وہ خود گھر چھوڑ کر چلی گئی۔'' اکبر چیخا۔

''میں بھلا یہ بات کیسے کہہ سکتا ہوں۔ لیکن یہ سچ ہے کہ میں نے اسے گھر سے نہیں نکالا، اور ویسے بھی اس نے ہمیشہ ہر دکھ سکھ میں میرا ساتھ دیا ہے، میں بھلا اسے گھر سے کیوں نکالنے لگا''

''وہ تو کہتی ہے کہ جو پچھلے دنوں اس کے دو بچے مرے، اس کے ذمہ دار بھی تم ہو۔ اور جو بچے زندہ ہیں، تمہاری وجہ سے ان کی زندگی بھی خطرے میں ہے۔'' مشتاق نے تفصیل بتائی۔

''ذرا خود ہی سوچو چاچا۔ کیا کبھی کوئی باپ اپنے بچوں کو اپنے ہی ہاتھوں سے مار سکتا ہے۔ ان معصوموں نے بھلا میرا کیا بگاڑا تھا، جو میں ان کی موت کا سبب بنتا۔''

''کیا یہ سچ نہیں کہ تم پیسہ کمانے کے چکر میں اپنے بچوں کو بھی داؤ پر لگانے کے لیے تیار ہو۔''

''ذرا تم ہی انصاف سے بتاؤ۔ انسان پیسہ کس کے لیے کماتا ہے۔''

''ظاہر ہے اپنے بیوی بچوں کے لیے۔'' مشتاق نے جھٹ سے جواب دیا۔

''خدا تمہارا بھلا کرے چاچا۔ بس یہی میں کر رہا ہوں۔ مگر وہ سمجھتی نہیں۔''

''مگر وہ ایسا کیوں کہتی ہے کہ اس گھر میں اس کے بچوں کو خطرہ ہے، اس لیے وہ یہاں نہیں رہے گی۔''

''چاچا تم ہی بتاؤ، کوئی باپ اپنے بچوں کا دشمن ہو سکتا ہے؟''

''لو یہ کیا بات ہوئی بھلا۔ باپ تو اپنے بچوں کے لیے سایہ ہوتا ہے۔''
''پھر تم خود ہی بتاؤ چاچا۔ میں بھلا اپنے بچوں کا دشمن کیسے ہوسکتا ہوں۔''
اس سے پہلے کہ مشتاق کوئی جواب دیتا، اکبر، جواب تک خاموشی سے بیٹھا ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سن کر غصے سے اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا بول پڑا۔ ''ابا۔ تم کون سی باتیں لے بیٹھے ہو۔ سیدھی طرح کہو کہ ہم سے ہماری بچی کے آنسو نہیں دیکھے جاتے''
''دیکھو اکبر۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میں نے عائشہ سے کوئی زیادتی کی ہے تو یہ بالکل غلط ہے''
''تو کیا وہ پاگل ہے جو بچوں کو لے کر روتی ہوئی ہمارے پاس پہنچی ہے؟''
''گھر میں میاں بیوی میں چھوٹی موٹی باتیں ہو جایا کرتی ہیں، لیکن اس کا یہ مقصد تو نہیں کہ گھر ہی چھوڑ دیا جائے۔ اگر عائشہ کو بھی مجھ سے کوئی شکایت تھی تو اسے تم لوگوں کے پاس جانے کی بجائے مجھ سے بات کرنی چاہیے تھی۔''
''کرم دین بس اتنا یاد رکھنا۔ اگر تم نے ہماری بہن کو اپنے گھر میں نہ بسایا یا کوئی دکھ دیا تو یہ تمہارے لیے اچھا نہیں ہوگا۔'' اکبر چیخا۔
''وہ میری بیوی ہے۔ اور میں بھلا اسے کوئی دکھ کیوں دینے لگا۔ یہ اسی کا گھر ہے وہ جب چاہے آئے اور آ کر خوشی خوشی رہے'' کرم دین نے دھیمے لہجے میں بات کی اور اپنی جگہ سے اٹھتا ہوا بولا ''تم لوگوں نے تو چائے بھی نہیں پی۔ اور پڑی پڑی ٹھنڈی بھی ہوگئی۔ میں ابھی دو منٹ میں گرم کر کے لاتا ہوں'' یہ کہتے ہوئے کرم دین نے ٹھنڈی چائے واپس چائے دانی میں ڈالی اور گرم کرنے کے لیے لے گیا۔
''کرم دین نے تو ابھی تک کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے یہ ظاہر ہو کہ اسے عائشہ سے کوئی ناراضگی ہے'' مشتاق نے کرم دین کے کمرے سے جانے کے بعد اپنی رائے کا اظہار کیا۔
''کہتے تو ابا تم ٹھیک ہو۔ مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے۔'' اکبر نے باپ کی ہاں میں ہاں ملائی، اکرم بھی ہاں میں ہاں ملانا چاہتا تھا، مگر وہ بات کرنے سے پہلے ہی رک گیا، کیونکہ کرم دین چائے گرم کر کے لے آیا تھا، چائے گرم کرنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے حجرے سے مٹھائی کا ڈبہ بھی اٹھا لایا تھا۔
کرم دین نے چائے کپوں میں ڈال کر ان تینوں کے ہاتھوں میں تھما دی اور مٹھائی کا ڈبہ کھول کر ان کے سامنے رکھ دیا اور بولا ''لیں گرما گرم چائے پئیں اور مٹھائی کھائیں اور اگر میری طرف سے تم میں سے کسی کے بھی دل میں کوئی میل ہے تو وہ نکال دیں''
کرم دین کی بات سن کر وہ تینوں ہی خاموشی سے چائے پینے لگے مگر ان میں سے کسی نے بھی مٹھائی نہیں کھائی تھی، مشتاق نے سب سے پہلے اپنی چائے ختم کی اور کپ ایک طرف رکھتا ہوا بولا ''اب وہ گئی ہے تو کچھ دن رہ لے پھر میں اسے چھوڑ جاؤں گا''
''وہ تمہاری بیٹی ہے چاچا۔ تم اسے جتنے دن چاہو رکھ لو، جب تمہاری خوشی ہوگی لے آنا اور اگر مجھے کہو گے تو میں لینے آ جاؤں گا۔'' کرم دین نے بات کی۔
''تم بھی لینے آ جاؤ گے تو کوئی حرج نہیں، لیکن تم بے فکر رہو میں اسے خود چھوڑ جاؤں گا۔ بیٹیوں والے جھکے ہوئے اچھے لگتے ہیں۔''
''یہ بات نہ کرو چاچا۔ میرے دل میں تمہارے لیے بہت عزت ہے۔ عائشہ تمہاری بیٹی ہے تو میں بھی تمہارا بیٹا ہوں۔''
''اللہ تمہیں خوش رکھے۔ لو اب ہم چلتے ہیں۔'' مشتاق نے بات کی اور ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا۔
اسے اٹھتے دیکھا تو کرم دین اور عائشہ کے دونوں بھائی بھی اٹھ گئے۔
''چاچا کھانا کھا کر جاتے۔''
''بس پتر۔ گھر والے ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اب ہمیں چلنا چاہئے۔''
''اچھا چاچا۔ رب راکھا۔''
وہ تینوں کرم دین سے ہاتھ ملاتے ہوئے چل پڑے، کرم دین ان کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا انہیں دروازے تک چھوڑنے گیا تھا، انہیں رخصت کرنے کے بعد وہ واپس کمرے میں آیا اور وہاں پڑے ہوئے چائے کے برتن اور مٹھائی کا ڈبہ سمیٹ کر چارپائی پر لیٹ گیا۔

☆☆☆☆☆

کرم دین سے ملاقات کے بعد وہ تینوں گھر پہنچے تو تمام اہل خانہ ان کے انتظار میں بیٹھے تھے، جس وقت سے وہ تینوں گھر سے گئے تھے، اس وقت سے ان پر عجیب سی کیفیت طاری تھی، انہیں کسی پل چین نہیں آیا تھا اور تب سے ہی ان کی نظریں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔

وہ تینوں گھر داخل ہوئے تو ان کے چہروں سے کسی بھی قسم کی ناگواری یا غصے کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دے رہی تھی، وہ چارپائیوں پر آ کر بیٹھے تو گھر کی خواتین شہد کی مکھیوں کی طرح فوراً ان کے اردگرد جمع ہو گئیں، عائشہ نے بھی انہیں اندر آتے دیکھ لیا تھا لیکن وہ اپنی جگہ پر بیٹھی رہی تھی۔

''کیا کہتا ہے کرم دین؟'' عائشہ کی ماں نے بے چینی کے عالم میں دریافت کیا۔

''سب خیر ہے۔ کوئی فکر کی بات نہیں۔ عائشہ کو بھی یہیں بلا لو۔ پھر بات کر لیتے ہیں.....'' مشتاق نے سکون سے جواب دیا۔

''جاؤ۔ اسے بھی یہیں بلا لاؤ۔'' عائشہ کی ماں نے آمنہ کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ماں کا اشارہ پاتے ہی وہ جلدی سے عائشہ کو بلانے چلی گئی، اب وہاں مکمل خاموشی تھی اور سبھی عائشہ کے منتظر تھے، تھوڑی ہی دیر میں آمنہ، عائشہ کو لے کر آ گئی۔

''آؤ۔ ادھر میرے پاس آ کر بیٹھ جاؤ۔'' مشتاق نے عائشہ کو اپنے پاس چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

باپ کی بات سن کر عائشہ خاموشی سے اس کے قریب جا بیٹھی ''تم۔ چار دن یہاں سکون سے رہو۔ پھر میں تمہیں خود ہی چھوڑ آؤں گا.....'' مشتاق نے بیٹی کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

عائشہ نے باپ کی بات سن کر گردن جھکا دی، پھر ہمت کر کے آہستہ سے بولی۔ ''مگر..... میں..... وہاں نہیں جانا چاہتی۔''

''پگلی نہ ہو تو۔ اس طرح بھی اپنا گھر چھوڑا جاتا ہے کبھی۔'' باپ نے بیٹی کو سمجھایا۔

''جس گھر میں میرے بچے محفوظ نہ ہوں۔ اس گھر کو چھوڑ دینا ہی اچھا ہے۔''

''تم ایسا کیوں سوچتی ہو؟ تمہارے بچے اس کے بھی تو بچے ہیں اور کوئی بھی باپ اپنے بچوں کا دشمن نہیں ہو سکتا۔ اور پھر کرم دین اتنا بھی بیوقوف یا کم عقل نہیں۔ ہم تینوں نے ہی اس سے تفصیل سے بات کی ہے۔ تمہیں یقیناً کرم دین کے بارے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ تم پریشان نہ ہو۔ کچھ دن یہاں رہ لو، تب تک تمہارا غصہ بھی ٹھنڈا ہو جائے گا۔''

''جب تم فیصلہ کر ہی آئے ہو تو پھر مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ مجھے بے شک کل ہی چھوڑ آنا۔ وہاں جیسے بھی حالات ہوں گے میں خود ہی بھگت لوں گی۔'' عائشہ نے تلخ لہجے میں بات کی، مگر اس کے لہجے کی تلخی کو کسی نے کوئی اہمیت نہ دی اور سبھی نے خاموشی اختیار کر لی۔

عائشہ کے دونوں بھائی جو یہ سمجھ رہے تھے کہ انہوں نے بہت بڑا کام سرانجام دے لیا ہے، تھک ہار کر کچھ دیر آرام کے لیے وہاں سے اٹھ کر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تھے، ان دونوں کے جاتے ہی ان کی بیویاں بھی ان کے پیچھے پیچھے ہی وہاں سے نکل گئی تھیں، عائشہ کی ماں اور باپ نے بھی اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور وہاں سے چلے گئے۔

اب میدان خالی تھا، دیکھتے ہی دیکھتے چند ہی لمحوں میں عائشہ کی چھوٹی بہن بڑی بن گئی تھی اور اسے سمجھانے لگی ''آپی۔ میں نہیں کہتی کہ جو کچھ ہو رہا ہے اس میں کون غلط ہے اور کون صحیح، لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں، جب بیٹی بیاہ کر چلی جائے تو اس کے دکھ سکھ اسی گھر سے جڑ جاتے ہیں جہاں وہ اپنے خاوند کے ساتھ رہتی ہے۔ یقیناً تمہیں کوئی نہ کوئی دکھ تو پہنچا ہو گا جو تم آنسو بہاتی ہوئی اپنی بچوں کو لیے یہاں آئی ہو۔ پھر بھی میں یہ کہوں گی کہ اپنے مسائل کو خود سلجھانا سیکھو۔ سبھی ماں باپ اپنی بیٹیوں کو ان کے گھروں میں بستا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں، تم خدانخواستہ جب بھی اس طرح کسی وجہ سے جھگڑ کر یہاں آؤ گی، یہ جیسے تیسے کبھی تمہیں اور کبھی بھائی کرم دین کو سمجھا بجھا کر تمہیں واپس وہیں چھوڑ آئیں گے۔ اس لیے بہتر ہے کہ جب بھی کبھی کوئی مسئلہ پیش آئے، اسے دوسروں تک پہنچانے کی بجائے، عقل مندی سے کام لیتے ہوئے خود اس کا کوئی حل نکال لیا جائے۔''

بہن نے چھوٹی ہو کر بڑی بڑی باتیں کر ڈالی تھیں، عائشہ انہیں خاموشی سے گردن جھکائے سنتی رہی پھر ایک لمبی سانس چھوڑتے ہوئے بولی ''باتیں کرنا بہت آسان ہے۔ پھر بھی تمہاری نصیحتوں کا شکریہ۔ میں کوشش کروں گی۔ آئندہ ایسا کچھ نہ ہو۔ جیسا اب ہوا۔''

''تھینک یو۔ آپی۔'' کہتے ہوئے آمنہ نے عائشہ کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

☆☆☆☆☆

عائشہ کچھ روز اپنے والدین کے ہاں رہی پھر اس کا باپ خود اسے اس کے سسرال چھوڑ گیا، ان دنوں میں کچھ بھی نہیں بدلا تھا مگر عائشہ نے خود کو بدلنے کا فیصلہ کر لیا تھا، مشتاق اسے چھوڑ کر صبح ہی واپس چلا گیا تھا، جانے سے پہلے اس نے ان دونوں کو بہت سی نصیحتیں کی تھیں اور کرم دین کو

عائشہ اور بچوں کا خیال رکھنے کا کہا تھا، کرم دین نے بھی کسی سعادت مند بچے کی طرح سسر کی تمام باتیں تحمل سے سنی تھیں اور اسے ہر طرح سے مطمعن کر کے بھیجا تھا، پھر اس کے جانے کے بعد وہ عائشہ اور بچوں سے کوئی بات کیے بغیر اپنے حجرے میں جا بیٹھا تھا، صبح سے شام پھر شام سے رات ہوگئی تھی مگر کرم دین اپنے حجرے سے نکل کر باہر آیا تھا اور نہ ہی عائشہ اس کے پاس گئی تھی، اس دوران اس نے کرم دین کے لیے دونوں وقت کا کھانا بچوں کے ہاتھ اس کے حجرے میں ہی بھجوا دیا تھا۔

سونے کا وقت ہوگیا تھا مگر کرم دین اپنے حجرے سے باہر نہیں آیا تھا، عائشہ نے بچوں کو سلا کر کرم دین کے لیے بھی چارپائی بچھا دی اور ایک چارپائی اپنے لیے بچھا کر لیٹ گئی تھی، اس کے ذہن میں اس بات کا ذرہ برابر بھی خیال نہیں تھا کہ کرم دین اس کے پاس آ کر اپنی زیادتیوں پر شرمندہ ہوتے ہوئے اسے منانے کی کوشش کرے گا اور نہ ہی اسے کرم دین کا انتظار تھا۔

نیند اس کی آنکھوں سے بہت دور تھی، اسے اس بات کی بھی پرواہ نہیں تھی کہ اسے نیند کیوں نہیں آ رہی تھی، وہ خاموشی سے اپنی چارپائی پر لیٹی آنے والے وقت کے بارے میں منصوبہ بندی کر رہی تھی، اسی دوران کرم دین آیا اور خاموشی سے اپنی چارپائی پر لیٹ گیا، اس نے سونے سے پہلے عائشہ سے کوئی بات نہیں کی تھی، پھر کچھ ہی دیر بعد کرم دین کے خراٹوں کی آواز کمرے میں گونجنے لگی تھی۔

کرم دین کو کمرے میں آئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی، عائشہ کروٹ لیے اس طرح لیٹی تھی کہ اس کی پیٹھ کرم دین کی طرف تھی، نیند سے اس کی آنکھیں بوجھل ہونے لگی تھیں، اسی لمحے اس نے اپنی کمر پر ہلکی سی گدگدی محسوس کی مگر وہ جان بوجھ کر خاموشی سے لیٹی رہی، وہ سوچنے لگی کہ دن بھر کرم دین نے اس سے کوئی بات نہیں کی تھی مگر اب اسے منانے کے لیے اس کے پاس بیٹھا اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر رہا تھا، پھر ایسا ہی کچھ اسے اپنے چہرے پر محسوس ہونے لگا مگر وہ خاموشی سے اپنی آنکھیں بند کیے لیٹی رہی تا کہ کرم دین کو احساس ہو کہ وہ اس سے ناراض ہے۔

اگلے ہی لمحے جب کرم دین کے خراٹوں کی آواز اس کے کانوں میں پڑی تو وہ یہ سوچ کر کانپنے لگی کہ اگر کرم دین اپنی چارپائی پر پڑا سو رہا تھا تو وہ کیا تھا جس کے سانسوں کی آواز وہ اپنے چہرے پر محسوس کر رہی تھی، یہ خیال آتے ہی اس نے فوراً آنکھیں کھول دیں، کمرے میں جلنے والے زیرو کے بلب کی روشنی میں اس کے چہرے پر رینگنے والا اژدھا اپنا پورا منہ کھولے اسے کاٹنے کے لیے تیار تھا، اژدھا کی آنکھوں سے عجیب سی روشنی نکل رہی تھی، اس کا منہ اس کے چہرے پر تھا جبکہ دھڑ اس کے بازوؤں اور کمر پہ تھا، عائشہ نے پوری طاقت سے اپنے بازو کو اوپر اٹھا کر زور سے جھٹک دیا، جس سے اژدھا دور جا گرا، اژدھا دیکھ کر وہ جلدی سے اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گئی تھی، بلب کی روشنی میں اژدھا صاف دکھائی دے رہا تھا، عائشہ نے اپنی زندگی میں کبھی اتنا بڑا اور خوفناک اژدھا نہیں دیکھا تھا، اژدھا دیکھ کر وہ اس قدر دہشت زدہ ہوگئی تھی کہ خود پر قابو پانے کی کوشش کے باوجود اس کے حلق سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔

اژدھا زمین پر بل کھاتا ہوا تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا، چیخنے کی آواز سن کر کرم دین ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا، عائشہ اپنی چارپائی پر بیٹھی تھی، اس کی نظریں دروازے پر لگی ہوئی تھیں اور وہ بری طرح کانپ رہی تھی۔

''کیا بات ہے؟'' کرم دین نے عائشہ کے قریب ہوتے ہوئے پوچھا۔

عائشہ کی سانس پھولی ہوئی تھی اور خوف کی وجہ سے اس کے منہ سے لفظ ادا نہیں ہو پا رہے تھے اس لیے وہ کرم دین کے سوال کا جواب نہیں دے پا رہی تھی، وہ انگلی کے اشارے سے کرم دین کی توجہ اس طرف کرواتے ہوئے جہاں اژدھا تھا، بمشکل اتنا کہہ پائی تھی

''س.....س.....سانپ.....''

کمرے میں جلے زیرو کے بلب کی روشنی ناکافی سمجھ کر کرم دین نے ٹیوب لائٹ جلا دی تھی تا کہ با آسانی کمرے کا جائزہ لیا جا سکے اور فوراً اس طرف نظر دوڑائی تھی جس طرف عائشہ نے اشارہ کیا تھا مگر اسے وہاں کچھ بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔

عائشہ کی سمجھ میں یہ بات تو آ رہی تھی کہ اژدھا دن میں کسی وقت کمرے میں آ کر بیٹھ گیا ہوگا لیکن اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ اس نے اپنی آنکھوں سے اژدھا کو دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تھا، دروازے میں کہیں بھی اتنی جگہ نہیں تھی جہاں سے وہ اژدھا گزر کر باہر جا سکتا، پھر وہ کہاں سے نکل گیا تھا۔

''وہاں تو کچھ بھی نہیں۔'' کرم دین نے کمرے کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد بات کی۔

جب تک وہ کمرے کے اندر اور باہر کا جائزہ لیتا رہا، عائشہ کی نگاہیں اسی پر لگی رہیں، اس کے واپس آنے تک عائشہ کی سانسیں بحال ہونے لگی تھیں اور وہ ڈر اور خوف کی کیفیت سے باہر نکل آئی تھی۔

وہ ہمیشہ سے کرم دین کا ہر زخم سہتی آئی تھی مگر اب حالات بدل گئے تھے، وہ دو بچوں کی موت کا دکھ دیکھ چکی تھی، اس میں مزید کوئی نیا دکھ سہنے کی ہمت نہیں تھی، کرم دین کمرے میں واپس آیا تو عائشہ اسے قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے بولی۔ ''لگتا ہے جب تک تمہاری وجہ سے میں اور میرے دونوں بچے بھی قبر میں نہیں جا سوئیں گے تمہیں سکون نہیں آئے گا۔''

''تم ہر بات کو میرے ساتھ کیوں جوڑ دیتی ہو؟''

''اس گھر میں جتنی بھی آفتیں آ رہی ہیں وہ سب تمہاری وجہ سے ہیں ورنہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ کبھی نہ ہوتا.....''

''اچھا چلو۔ ان باتوں کو جانے دو۔ خدا کا شکر ہے کہ تمہیں کسی بھی قسم کا کوئی نقصان نہیں پہنچا'' عائشہ کا غصہ دیکھ کر کرم دین نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے نرم لہجے میں بات کی۔

کرم دین کا ہاتھ لگتے ہی عائشہ کو مزید غصہ چڑھ گیا اور اس نے تیزی سے اس کے ہاتھوں کو بری طرح جھٹک دیا۔

''اس قدر خفا کیوں ہوتی ہو؟''

''مجھے تنگ مت کرو۔ میں اس وقت تم سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتی''

''لگتا ہے ابھی تک غصے میں ہو۔''

''میں نے کہا ناں۔ میں تم سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتی۔ پھر خوامخواہ بات کو کیوں بڑھا رہے ہو؟'' عائشہ نے تیز لہجے میں بات کی اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

کرم دین کچھ دیر تک عائشہ کے پاس کھڑا گردن جھکائے سوچتا رہا پھر ایک لمبی سانس چھوڑی اور خاموشی سے اپنے بستر پر جا لیٹا۔

ان کی شادی کے بعد اب تک یہی ہوتا آیا تھا کہ جب بھی کسی معاملے میں ان میں کوئی اختلاف ہوا یا گرمی سردی ہوئی، انہوں نے وقتی طور پر منہ پھلایا اور پھر کچھ ہی دیر بعد ناراضگی ختم ہو گئی، یہ اور بات ہے کہ بات کرنے میں ہمیشہ عائشہ نے پہل کی تھی، ان کی شادی شدہ زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ ناراضگی اس قدر طول پکڑ گئی تھی۔

کرم دین کا خیال تھا کہ ہمیشہ کی طرح آج بھی عائشہ ہی منانے میں پہل کرے گی، لیکن جب وہ اس کے منانے پر بھی نہ مانی تو وہ خاموشی سے اپنے بستر پر جا لیٹا، وہ رات دونوں پر ہی بھاری گزری تھی اور وہ رات بھر سو نہ سکے تھے۔

دن بھر کرم دین اپنے حجرے میں گھسا رہا اور عائشہ گھر کے کاموں میں مصروف رہی، دن میں ایک بار بھی وہ عائشہ اور بچوں کے پاس نہیں آیا تھا، کرم دین نے ایک روز قبل ہی کچھ سبزیاں، گوشت اور دالیں لا کر رکھ دی تھیں، اس لیے اسے کسی چیز کے لیے بھی کرم دین سے کہنا نہیں پڑا تھا، دن کا زیادہ تر حصہ اس نے یہ سوچتے ہوئے گزار دیا تھا کہ اس نے رات کو جو اژدھا دیکھا تھا وہ شائد اس کا وہم ہو لیکن پھر وہ خود ہی سوچنے لگتی کہ یہ وہم نہیں تھا کیونکہ اس نے خود اژدھا کو اپنے جسم پر دیکھ کر جھٹکے کے ساتھ دور پھینکا تھا اور پھر اسے جاتے ہوئے بھی دیکھا تھا، یہاں تک بات اس کی سمجھ میں آتی تھی مگر اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ اگر واقعی وہ اژدھا تھا تو وہ دروازے سے کیسے نکل گیا جبکہ وہاں ایسی کوئی جگہ نہیں تھی جہاں سے اتنا موٹا اژدھا گزر جاتا، اپنی تسلی کے لیے اس نے صبح اٹھ کر دروازے سے باہر کا بھی بغور جائزہ لیا تھا مگر کہیں سے بھی ایسا محسوس نہیں ہوتا تھا کہ کوئی سانپ وہاں سے رینگتا ہوا گزرا ہو گا۔

رات ہوئی تو کرم دین کو پھر سے عائشہ کی اہمیت اور موجودگی کا احساس ہوا اور وہ ایک بار پھر منت سماجت کرنے لگا، عائشہ پہلے سے جانتی تھی کہ وہ اپنی چکنی چپڑی باتوں سے اسے بہلانے کی کوشش کرے گا، وہ مسلسل انکار کرتی رہی اور کرم دین مسلسل اصرار کرتا رہا، جب فرار کی کوئی صورت دکھائی نہ دی تو اس نے مجبوراً کرم دین کی جھولی میں خیرات ڈال دی۔

اگلی صبح کرم دین اٹھا تو بہت اچھے موڈ میں تھا، ناشتے سے فارغ ہو کر اس نے عائشہ کو اپنے پاس بٹھا لیا اور جیب سے بہت سی رقم نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ اپنے پاس رکھ لو۔''

''یہ کس کے پیسے ہیں؟'' عائشہ نے اپنی ہتھیلی پر رکھے ہوئے بہت سے نوٹ دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ سب تمہارے ہیں۔ انہیں جیسے چاہو خرچ کرو۔''

''میں جانتی ہوں۔ تم نے لوگوں سے جھوٹ سچ بول کر یہ نوٹ اکٹھے کیے ہیں، اسی کمائی کی وجہ سے میں روٹھ کر گئی تھی اور آج تم وہی پیسے مجھے دے رہے ہو''

''تم پھر جزباتی ہو رہی ہو۔ اس سے پہلے کہ کوئی بدمزگی پیدا ہو، میں انہیں اپنے پاس ہی رکھ لیتا ہوں۔'' کرم دین نے عائشہ کی ہتھیلی سے نوٹ اٹھا کر جیب میں ڈالتے ہوئے کہا اور اپنے حجرے کی طرف چل پڑا۔

☆☆☆☆☆

دوپہر کا وقت تھا، دونوں بچے اپنے اپنے سکولوں میں گئے ہوئے تھے اور کرم دین حسب معمول اپنے حجرے میں تھا، اچانک عائشہ کے کان میں سرگوشی ہوئی، اس نے جلدی سے ادھر ادھر پلٹ کر دیکھا، کمرے میں اس کے سوا کوئی بھی نہیں تھا، اس نے اسے وہم جان کر کوئی پرواہ نہ کی، مگر تھوڑے سے وقفے کے بعد وہی آواز پھر سے اس کے کانوں میں پڑی، اب کی بار اسے آواز صاف سنائی دے رہی تھی کوئی اسے کہہ رہا تھا ''ہم تمہیں اٹھا کر لے جائیں گے''، اس آواز نے اسے پریشان کر ڈالا تھا، اس بار اس نے واضع الفاظ سنے تھے مگر وہ اب بھی اسے اپنا وہم ہی سمجھی تھی، پھر وہ آواز دن میں بار بار اس کے کانوں میں ٹکراتی رہی، وہ انتہائی خوف زدہ تھی مگر اس نے کرم دین سے اس بات کا ذکر نہیں کیا تھا، کیونکہ وہ جانتی تھی کہ وہ سنی ان سنی کر ڈالے گا۔

وقت کے ساتھ ساتھ کرم دین کی شہرت بستی سے نکل کر دور دور تک پھیلنے لگی تھی، اس لیے اب وہ شام کو اٹھتا تو اس کی جیبیں نیاز مندوں اور ضرورت مندوں سے ملنے والے نوٹوں سے بھری ہوتی تھیں، ایسا کم ہی ہوتا تھا کہ وہ کسی روز خالی ہاتھ اٹھا ہو، وہ کچھ نہ کچھ لے کر ہی حجرے سے نکلتا تھا مگر اس روز اس کے چہرے پر اداسی چھائی تھی، وہ اترا ہوا چہرہ لیے بجھے دل کے ساتھ حجرے سے نکلا تھا، رات ہو چکی تھی، باہر ہر طرف اندھیرا پھیل چکا تھا وہ حجرے سے نکل کر صحن سے گزرتا ہوا کمرے کی طرف جا رہا تھا، اسی لمحے دروازے پر ہونے والی دستک اس کے کانوں میں پڑی تھی اور اس کے قدم وہیں رک گئے تھے۔

''کھوکھر صاحب آئے ہیں'' دروازہ کھولنے پر باہر کھڑے شخص نے بلا تمہید اطلاع دی۔

اس شخص کی بات سن کر کرم دین کی نظر اوپر اٹھی تو اس نے دیکھا، علاقے کی جانی پہچانی شخصیت اور ایم. پی. اے، عمران کھوکھر گاڑی سے نکل کر اس کی طرف بڑھ رہے تھے، انہیں اپنی طرف آتے دیکھ کر کرم دین تیزی سے ان کے قریب پہنچ گیا اور سلام کے لیے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

''کھوکھر صاحب آپ نے یہاں آنے کی تکلیف کیوں کی۔ مجھے بلا لیا ہوتا۔ میں خود حاضر ہو جاتا'' کرم دین نے بات کی۔

''ہمیشہ ضرورت مند کو ہی چل کر جانا پڑتا ہے اور اس وقت ضرورت میری تھی اس لیے میں خود چل کر آیا ہوں۔ اس سے پہلے کہ یہاں محلے داروں کا رش لگ جائے، میرا خیال ہے گاڑی میں بیٹھ کر بات کر لیتے ہیں'' کھوکھر صاحب نے بات کی اور پھر کرم دین کا جواب سنے بغیر گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔

کرم دین جان چکا تھا کہ یقیناً کوئی نہ کوئی ضرورت ہی عمران کھوکھر کو اس کے دروازے پر کھینچ لائی تھی، گاڑی کا دروازہ کھلنے پر وہ خاموشی سے پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا، کھوکھر صاحب بھی دروازہ بند کر کے دوسرے دروازے سے اس کے برابر آ بیٹھے تھے، ان کا اشارہ پا کر ان کے ساتھ آنے والا شخص باہر ہی کھڑا رہا تھا، اب گاڑی میں ان دونوں کے سوا کوئی دوسرا شخص نہیں تھا، گاڑی کے شیشے چڑھے ہوئے تھے، جس کی وجہ سے ان کے درمیان ہونے والی گفتگو کو کوئی تیسرا شخص نہیں سن سکتا تھا۔

''حکم کریں کھوکھر صاحب'' کرم دین نے کھوکھر صاحب کے گاڑی میں بیٹھتے ہی بات کی۔

''میں نے تمہاری بڑی شہرت سنی ہے، اس لیے خود چل کر یہاں آیا ہوں۔ یہ تو تم نے بھی سنا یا اخباروں میں پڑھا ہی ہوگا کہ اس بار ہونے والے الیکشن کے لیے پارٹی نے میری بجائے کسی اور کو ٹکٹ دے دیا ہے، میں نے پارٹی کا فیصلہ سمجھ کر خاموشی سے گردن تو جھکا دی ہے، لیکن میں چاہتا ہوں، تم کچھ ایسا کرو کہ وہ الیکشن میں اس بری طرح ہارے کہ میری پارٹی کو بھی احساس ہو جائے کہ انہوں نے مجھے ٹکٹ نہ دے کر غلط فیصلہ کیا تھا''

''آپ خود چل کر یہاں آئے ہیں اور بے فکر ہو کر جائیں۔ جیسا آپ چاہتے ہیں ویسا ہی ہوگا'' کرم دین نے مکمل اعتماد کے ساتھ یقین دہانی کرائی۔

کرم دین کی بات سن کر کھوکھر صاحب نے جیب سے ایک لفافہ نکالا اور اس کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے بولے ''یہ رکھ لو۔ کام ہونے پر ایسا ہی ایک لفافہ اور پہنچ جائے گا''

''ٹھیک ہے۔'' کرم دین نے لفافہ مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا اور پھر خاموشی سے دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر نکل آیا، اس کے نکلتے ہی باہر کھڑا شخص تیزی سے ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا اور گاڑی چلا دی، ان کے جانے تک کرم دین وہیں کھڑا رہا تھا، وہ جانتا تھا کہ کھوکھر صاحب کی طرف سے دیے جانے والے لفافے میں نئے نئے نوٹ ہوں گے، اس لیے چاہتا تھا کہ وہ جلدی سے وہاں سے جائیں تاکہ ان کے جانے کے بعد وہ لفافہ کھول کر دیکھ سکے کہ اس میں کتنی رقم ہے۔

اندر آنے کے بعد وہ کمرے میں جانے کی بجائے واپس اپنے حجرے میں آ بیٹھا تھا، اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ لفافہ کھولا تھا مگر اس میں نئے نوٹوں کی بجائے ہزار ہزار کے پرانے نوٹ تھے، لیکن اسے اس سے کوئی غرض نہیں تھی، لفافے میں نئے نہ سہی پرانے سہی، تھے تو نوٹ ہی، وہ جلدی سے نوٹ گننے لگا، جیسے جیسے گنتی آگے بڑھتی جاتی تھی اس کی خوشی میں اضافہ ہوتا جاتا تھا، کھوکھر صاحب پورے پچاس ہزار روپے دے کر گئے تھے، اس نے نوٹ گن کر پھر سے لفافے میں ڈالتے ہوئے جیب میں رکھے اور اٹھ کھڑا ہوا۔

کرم دین نے ابھی تک رات کا کھانا نہیں کھایا تھا مگر ایک ساتھ ملنے والی بڑی رقم نے اس کی بھوک اڑا دی تھی، اس کی خواہش تھی کہ وہ جلدی سے یہ بات عائشہ کو بھی بتائے، لیکن وہ جانتا تھا کہ عائشہ اس بات سے خوش ہونے کی بجائے ناراضی کا اظہار کرے گی، اس لیے اس نے بدمزگی سے بچنے کے لیے عائشہ سے اس بات کا تذکرہ نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا، وہ کمرے میں داخل ہوا تو عائشہ چارپائی پر لیٹی اپنے دونوں ہاتھ گردن پر رکھے تڑپ رہی تھی، اس کی حالت دیکھ کر ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی اس کی گردن دبا رہا تھا اور وہ اس سے چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی، وہ تیزی سے آگے بڑھا اور اسے آواز دی، اس کی آواز سنتے ہی وہ یوں اٹھ بیٹھی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا مگر اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو ساری کہانی سنا رہے تھے۔

''وہ مجھے بھی مار ڈالیں گے کرم دین۔'' عائشہ نے روتے ہوئے کہا۔

''کون مار ڈالے گا تمہیں؟'' کرم دین نے حیران ہو کر پوچھا۔

''وہ.....وہ.....وہ پچھلے دو دن سے اٹھتے بیٹھتے میرے کانوں میں سرگوشیاں کرتے ہیں کہ اگر کرم دین نے اپنی حرکتیں نہ چھوڑیں تو وہ مجھے اٹھا کر لے جائیں گے۔ اب وہ میری گردن دبا کر اس بات پر زور دے رہے تھے کہ میں تم سے بات کیوں نہیں کرتی۔'' عائشہ نے گردن جھکائے روتے ہوئے بات کی۔

''ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ یہ سب تمہارا وہم ہے اور کچھ نہیں'' کرم دین نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

عائشہ جانتی تھی کہ ہمیشہ کی طرح وہ اسے تسلی دینے کے سوا کچھ نہیں کرے گا، اس لیے اس نے مزید کوئی بات نہ کی اور اپنے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے خاموشی سے اٹھی اور کھانا لا کر کرم دین کے سامنے رکھ دیا، کرم دین کا دل کھانا کھانے کو نہیں چاہ رہا تھا مگر اس کے باوجود وہ خاموشی سے کھانا کھانے لگا، کھانا رکھ کر عائشہ اپنی چارپائی پر جا لیٹی تھی، کرم دین نے بھی بے دلی سے کھانا کھایا اور برتن ایک طرف رکھ کر لیٹ گیا۔

اگلے روز عائشہ نے میاں جی کو اپنی کیفیت بتائی تو انہوں نے رات کو سونے سے پہلے آیت الکرسی پڑھ کر سونے کو کہا تھا اور ساتھ ہی ایک تعویز بھی دیا تھا، جسے ہر وقت گلے میں ڈالے رکھنے کی تاکید کی تھی۔

کرم دین اپنی ہی دنیا میں مگن تھا، اس نے عائشہ کی حالت خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لی تھی مگر پھر بھی بیگانوں کی طرح لاپرواہی سے کام لے رہا تھا، عائشہ نے نہ چاہتے ہوئے بھی ایک دو بار باتوں باتوں میں تمام حالات اس کے کانوں میں ڈال دیے تھے مگر اس نے اپنی عادت کے مطابق سنی ان سنی کر دی تھی اور دولت سمیٹنے کے چکر میں پڑا رہا۔

عائشہ نے خطرے کی بو سونگھ لی تھی، اس لیے انتہائی احتیاط سے کام لینے لگی تھی، وہ میاں جی کا دیا ہوا تعویز ہر وقت گلے میں ڈالے رکھتی اور رات کو آیت الکرسی پڑھ کر سوتی تھی، ایسا کرنے سے اسے حوصلہ ملا تھا، مگر اس کے اندر کا خوف اب بھی ہر پل اسے گھیرے میں لیے رکھتا تھا۔

وہ سو رہی تھی جب اسے احساس ہوا کہ اس نے نہانے سے قبل تعویز گلے سے اتار کر رکھا تھا مگر نہانے کے بعد دوبارہ گلے میں ڈالنا بھول گئی تھی، یہ خیال آتے ہی اس نے گلے کو ہاتھ لگا کر دیکھا، تعویز گلے میں موجود نہیں تھا، وہ اسی وقت اٹھ کر تعویز گلے میں ڈال لینا چاہتی تھی لیکن اس پر نیند اس قدر غالب آ گئی تھی کہ وہ اٹھ نہ سکی۔

کرم دین کی آنکھ کھلی تو عائشہ کی چارپائی خالی پا کر اسے انتہائی تشویش ہوئی، دونوں بچے اپنی اپنی چارپائیوں پر لیٹے تھے مگر عائشہ نہیں تھی، صبح ہو گئی تھی وہ اٹھ بیٹھا تھا اور یہ سوچ کر مطمئن تھا کہ وہ باتھ روم میں گئی ہوگی، لیکن جب کافی دیر تک وہ نہ آئی تو کرم دین کو پریشانی لگ گئی، اس نے

جلدی سے چارپائی چھوڑ دی اور باتھ روم میں جا کر دیکھا، باتھ روم کا دروازہ کھلا تھا اور عائشہ وہاں نہ تھی، اس کے بعد اس نے کچن کا رخ کیا، وہ وہاں بھی دکھائی نہ دی، پھر اس نے پریشانی کے عالم میں گھر کا کونہ کونہ چھان مارا مگر وہ کہیں دکھائی نہ دی، حیران کن بات یہ تھی کہ بیرونی دروازے کی کنڈی بھی اندر سے بند تھی، پھر عائشہ کہاں چلی گئی تھی۔

عائشہ کو گھر میں نہ پا کر کرم دین پریشانی کے عالم میں سر پکڑے چارپائی پر بیٹھا سوچ رہا تھا، بچے بھی اٹھ گئے تھے اور باپ سے اپنی ماں کے بارے میں دریافت کر رہے تھے، مگر جس بات سے وہ خود بے خبر تھا انہیں اس بارے میں کیا بتا سکتا تھا، جب کرم دین کو کوئی راہ دکھائی نہ دی تو اس نے ڈرتے ڈرتے اپنے سسرال میں فون کر کے عائشہ کے بارے میں دریافت کیا مگر عائشہ وہاں بھی نہ تھی، کرم دین کی بات نے انہیں بھی پریشان کر ڈالا تھا اور کچھ ہی دیر بعد وہ لوگ بھی وہاں آ پہنچے تھے۔

تھوڑی ہی دیر میں عائشہ کی گمشدگی کی خبر گھر سے نکل کر پورے محلے میں پھیل گئی تھی، باہمی مشورے کے بعد مساجد میں بھی اعلانات کروا دیے گئے تھے، عائشہ کی گمشدگی کی اطلاع پا کر تمام محلے دار کرم دین کے ہاں آ جمع ہوئے تھے، سب کے لیے عائشہ کی گمشدگی ایک معمہ بن کر رہ گئی تھی، جتنے منہ اتنی باتیں کے مصداق ہر کوئی اپنی اپنی رائے قائم کر رہا تھا اور طرح طرح کی باتیں ہونے لگی تھیں۔

جو شخص محلے کے گھروں میں موٹر سائیکل پر دودھ دینے آتا تھا، مختلف گھروں میں دودھ دیتے ہوئے اس کے کانوں میں بھی یہ بات پڑ گئی تھی اور وہ بھی کرم دین کے گھر کے باہر موجود لوگوں کے پاس آ کھڑا ہوا تھا، اس نے وہاں کھڑے لوگوں میں سے ایک دو جان پہچان والوں کے ساتھ آہستہ سے بات کی تھی اور بتایا تھا کہ اس نے صبح ادھر آتے ہوئے گراؤنڈ کے پاس دور سے ایک عورت کو بے سدھ پڑے دیکھا تھا، مگر وہ اس بات کا کوئی بھی نوٹس لیے اور رکے بغیر وہاں سے نکل آیا تھا۔

گوالے کی بات چند کانوں میں پڑی تھی مگر اگلے ہی لمحے یہ بات ہر کان میں پڑ چکی تھی اور اب کرم دین، اس کے سسرال والوں اور محلے داروں کا رخ اس طرف تھا، جس جگہ کی نشاندہی دودھ والے نے کی تھی، گوالے کی بات سچ ثابت ہوئی تھی، عائشہ گراؤنڈ میں بے جان پڑی تھی اور اس کے چہرے پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں، اسے چادر سے ڈھانپ دیا گیا اور پولیس کو اطلاع کر دی گئی۔

عائشہ کی لاش ملی تو کرم دین کے سسرال والوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا، اب کرم دین ان کے نشانے پر تھا اور تمام توپوں کے منہ اسی طرف تھے، تھوڑی ہی دیر میں لوگ وہ سب باتیں بھی جان گئے تھے جن پر اب تک پردہ پڑا ہوا تھا اور اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کرم دین پر تھو تھو کر رہے تھے، عائشہ کے گھر والے اس کی لاش کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے لیکن باہمی رضامندی سے بمشکل فیصلہ ہوا کہ عائشہ کی قبر بھی اس کے دونوں بچوں کے پاس ہی بنا دی جائے۔

تدفین کے بعد کرم دین کے سسرال والے عائشہ کے دونوں بچوں کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے بضد تھے، کرم دین نے انہیں ایسا کرنے سے روکنے کے لیے ہر طرح منت سماجت کی تھی لیکن ان لوگوں نے ایک نہیں سنی تھی، ان کا یہی کہنا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کی ان نشانیوں کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ کر نہیں جا سکتے، اس فیصلے میں تمام محلے دار بھی ان کے ساتھ تھے اور ان کا پلڑا بھاری تھا، اس لیے انہوں نے بچوں کو ساتھ لیا اور بلا تاخیر وہاں سے چلے گئے۔

☆☆☆☆☆

کرم دین کو ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے وہ اپنے گھر میں نہیں کسی قتل گاہ میں رہ رہا ہو، جہاں ہر طرف اس کے خاندان والوں کی لاشیں تھیں اور جگہ جگہ اس کے بیوی بچوں کے جسم کے اعضاء بکھرے پڑے تھے، گھر کا کوئی کونہ ایسا نہیں تھا جہاں کوئی نہ کوئی انسانی عضو موجود نہیں تھا، وہ جس کمرے میں جاتا کوئی نہ کوئی عضو اس کے پاؤں سے ٹکرا جاتا، یہاں تک کہ وہ کوئی چیز لینے کے لیے فرج بھی کھولتا تو اس میں بھی کسی نہ کسی بچے کا تن سے جدا کیا ہوا سر ملتا یا کسی خانے میں کسی بچے کا بازو لٹک رہا ہوتا، وہ ڈر کر پیچھے ہٹ جاتا مگر اگلے ہی لمحے وہاں کچھ بھی نہ ہوتا، نہ کوئی لاش، نہ تن سے جدا کیا ہوا سر اور نہ ہی کسی کے جسم کا کوئی حصہ۔

اس نے اپنے بیوی بچوں کو اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارا تھا مگر گھر میں انہی کی لاشیں اور بکھرے ہوئے اعضاء نے کرم دین کو خوف زدہ کر ڈالا تھا، جب خوف حد سے بڑھ جاتا تو وہ باہر کی طرف بھاگ کھڑا ہوتا، وہ ڈر اور خوف کے مارے دن بھر گھر سے باہر رہتا مگر رات کو گھر آنا اس کی مجبوری تھی، دن کی طرح اس کی رات بھی بے چینی کے عالم میں کروٹیں بدلتے ہوئے گزرتی تھی۔

اس کیفیت نے اسے ذہنی مریض بنا ڈالا تھا، وہ دن بھر ڈرا سہما گھر کے کسی کونے میں پڑا رہتا یا بلاوجہ محلے میں ہی ادھر ادھر گھومتا رہتا، ان حالا

ت کی وجہ سے اس کے پاس تعویز دھاگے کے لیے آنے والوں کی آمد و رفت بھی کم ہوتے ہوتے ختم ہو کر رہ گئی تھی، وہ انتہائی تکلیف دہ حالات سے گزر رہا تھا، ایسے میں اسے بابا سائیں کے پاس جانے کے سوا کوئی دوسری راہ دکھائی نہیں دیتی تھی لیکن وہ ان کے پاس جانے سے گریز کر رہا تھا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ بابا سائیں اس سے کتاب کے متعلق ضرور سوال کریں گے، مگر ان کے پاس جائے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں تھا، اس لیے اس نے بابا سائیں سے ملاقات کا فیصلہ کر لیا۔

وہ بابا سائیں کے آفس پہنچا تو وہاں تالا لگا ہوا تھا، تالے پر پڑی ہوئی مٹی دیکھ کر ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے کافی دنوں سے کھولا نہیں گیا تھا، کرم دین پریشانی کے عالم میں بابا سائیں کے پاس آیا تھا مگر دفتر کے دروازے پر لگے تالے نے اسے مزید پریشان کر دیا تھا، چند لمحوں میں اس کے ذہن میں بہت سے خیالات ابھرے، مگر اس نے ہر خیال کو ذہن سے جھٹک دیا تھا۔

اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ آیا ہو اور دفتر بند ملا ہو، کرم دین نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تاکہ وہ کسی ایسے شخص سے بات کرے، جس سے مکمل معلومات حاصل ہو سکیں، بابا سائیں کے دفتر کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت سے دفاتر اور دکانیں تھیں مگر کسی نے بھی اس پر توجہ نہیں دی تھی، اچانک ایک ریڑھی والے پر اس کی نظر پڑی جو پھل فروخت کر رہا تھا اور مسلسل اسی کی طرف دیکھے جا رہا تھا، وہ پھل فروش کرم دین کو کام کا آدمی لگا تھا، اس لیے وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے پاس جا کھڑا ہوا تھا۔

''جی باؤ جی! کیا چاہیے؟'' پھل فروش نے کرم دین کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''میں بابا سائیں کے پاس آیا تھا' مگر وہاں تالا لگا ہوا ہے'' کرم دین نے بابا سائیں کے دفتر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''لگتا ہے اس نے تمہیں بھی ہاتھ دکھا دیے ہیں۔'' پھل فروش نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بات کی۔

''کیا مطلب؟'' کرم دین نے حیران ہو کر دریافت کیا۔

''وہ فراڈ ہے فراڈ۔''

''تم ہوش میں تو ہو؟ جانتے ہو کس کے بارے میں بات کر رہے ہو؟''

''میں اسی بابا سائیں کی بات کر رہا ہوں۔ جسے تم ملنے آئے ہو، نہ جانے وہ کتنے غریبوں کو لوٹ کر کھا گیا اور بنا پھرتا ہے بابا سائیں!''

پھل فروش کے منہ سے بابا سائیں کے متعلق گستاخانہ الفاظ سن کر کرم دین کا دماغ گھوم گیا، اس نے اسے گلے سے پکڑ کر زمین پر گرا لیا اور اس کی چھاتی پر بیٹھا غصے سے بے قابو ہو کر اس کے چہرے پر گھونسے مارنے لگا، پھل فروش کرم دین کے مقابلے میں کافی کمزور تھا، کرم دین کے سامنے اس کا کوئی بس نہیں چل رہا تھا مگر وہ مسلسل گالیاں بک رہا تھا۔

انہیں گتھم گتھا دیکھ کر آس پاس کے دکان دار وہاں پہنچ گئے اور انہیں ایک دوسرے سے چھڑانے لگے، بہت سے راہ گیر بھی وہاں آ کھڑے ہوئے تھے جس کی وجہ سے کافی بھیڑ لگ گئی تھی، تین چار نوجوان اور ایک باریش شخص نے بمشکل انہیں ایک دوسرے سے الگ کیا۔

''کیا معاملہ ہے' تم دونوں کیوں لڑ رہے ہو؟'' باریش شخص نے پھل فروش سے سوال کیا۔

''بھلے کا زمانہ ہی نہیں رہا۔ یہ مجھ سے سامنے والے بابا سائیں کے بارے میں پوچھ رہا تھا، میں نے صاف صاف بتا دیا کہ وہ فراڈ ہے۔ بس اتنی سی بات پر یہ مجھ سے الجھ پڑا۔'' پھل فروش نے لڑائی کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا۔

''کیوں بھئی۔ ایسا ہی ہوا ہے؟'' باریش شخص نے کرم دین سے سوال کیا۔

''بات تو یہی ہوئی ہے جو یہ بتا رہا ہے۔ لیکن یہ ہوتا کون ہے میرے بابا سائیں کو فراڈ کہنے والا۔''

''تم میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں سکون سے بیٹھ کر ساری بات سمجھاتا ہوں۔'' باریش شخص کرم دین سے بات کرتے ہوئے بولا اور پھر وہاں کھڑے ہوئے لوگوں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا ''تم لوگ بھی اب جاؤ یہاں سے۔ لڑائی ختم ہو چکی ہے رش بھی ختم کرو۔''

بات کرتے ہی باریش شخص کرم دین کو لیے وہاں سے چل پڑا، کچھ اور لوگ بھی ان دونوں کے ساتھ ہو لیے تھے اور باقی کچھ دیر تک پھل فروش کے ساتھ ہمدردی جتانے کے بعد وہاں سے نکل گئے تھے، لوگوں کے جانے کے بعد پھل فروش نے اپنے کپڑے جھاڑے اور ریڑھی کے پاس رکھے ہوئے سٹول پر بیٹھ کر اپنے ہاتھوں سے چوٹوں کو سہلانے لگا۔

باریش شخص نے اپنے آفس میں بٹھا کر کرم دین کے سامنے بابا سائیں کے متعلق ایسے ایسے انکشافات کیے تھے کہ وہ آنکھیں جھپکنا ہی بھول گیا تھا، ان سب سے بڑھ کر یہ بات اور بھی حیران کر دینے والی تھی کہ پچھلے ڈیڈھ ماہ سے بابا سائیں جیل میں تھے۔

کرم دین اپنے غموں کا علاج اور مسائل کا حل ڈھونڈنے بابا سائیں کے پاس آیا تھا مگر وہ تو خود جیل میں سزا کاٹ رہے تھے، حالات جیسے بھی تھے بابا سائیں سے ملاقات کرنا انتہائی ضروری تھا، کرم دین فوراً سے پہلے بابا سائیں سے ملنا چاہتا تھا مگر پھل فروش سے گتھم گتھا ہونے کی وجہ سے اس کے کپڑوں کی حالت اس قدر خراب ہو چکی تھی کہ ان میں بابا سائیں سے ملاقات کے لیے جانا مناسب نہیں تھا، اس لیے وہ واپس گھر کی جانب چل پڑا۔

اگلے روز وہ صبح سویرے ہی بابا سائیں سے ملاقات کے لیے گھر سے نکل پڑا تھا، جیل سے باہر ملاقاتیوں کا کافی رش تھا مگر تھوڑی سی کوشش کے بعد اسے بابا سائیں سے ملاقات کا اجازت نامہ مل گیا تھا۔

''میں تو سمجھا تھا کہ تم کب کے بابا سائیں کو بھول چکے ہو گے۔'' سلام دعا کے بعد بابا سائیں نے کرم دین سے بات کی۔

''یہ کیسے ممکن ہے سرکار کہ کرم دین آپ کو بھول جائے۔ بس کچھ اپنی ذاتی الجھنوں کی وجہ سے آپ کے پاس حاضر نہیں ہو سکا۔ اب آیا تو پتہ چلا کہ آپ یہاں ہیں۔''

''ہم فقیروں کا کیا ہے کرم دین۔ یہاں ہوئے یا وہاں، ایک ہی بات ہے۔ وہاں بھی چاہنے والے بہت تھے اور یہاں بھی چاہنے والوں کی کوئی کمی نہیں۔ تم اپنی سناؤ کیسی گزر رہی ہے۔ اب تک تو تمہارا کام بھی خوب چل نکلا ہو گا''

''سچ تو یہ ہے سرکار کہ آپ نے جو کچھ مجھے دیا تھا، وہ میرے لیے بہت تھا مگر مجھے دولت سمیٹنے کی اس قدر جلدی تھی کہ نفع نقصان کی پرواہ کیے بغیر وہ کچھ بھی کرتا چلا گیا جس کی آپ کی طرف سے کوئی اجازت نہیں تھی''

''ایسا کیا کر لیا تم نے؟''

بابا سائیں کا سوال سن کر کرم دین نے شرمندگی سے گردن جھکا دی اور خاموش کھڑا رہا، بابا سائیں کچھ دیر اس کے بولنے کا انتظار کرتے رہے پھر بولے ''کیا بات ہے کرم دین۔ تم کچھ بولتے کیوں نہیں؟''

''مجھے معاف کر دیجئے بابا سائیں۔ مجھ سے بہت بڑی بھول ہو گئی۔ جس کی اتنی بڑی سزا پائی ہے کہ کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔'' کرم دین نے بات کی اور روتے ہوئے بابا سائیں کے قدموں میں گر گیا۔

''تم نے ایسا کیا کر لیا کرم دین۔ جس کے لیے اس قدر شرمندہ ہو رہے ہو۔'' بابا سائیں نے کرم دین کو اٹھاتے ہوئے کہا۔

''میں..... میں وہ..... وہ..... وہ کتاب۔''

''کتاب! کہیں تم، عملیات والی کتاب کی بات تو نہیں کر رہے؟''

''جی سرکار!''

''تو وہ کتاب تم لے گئے تھے؟'' بابا سائیں نے حیران ہو کر سوال کیا پھر خود ہی بولے ''کہیں تم نے۔ اس کتاب سے کوئی چلہ تو نہیں کاٹ لیا؟''

''جی سرکار!'' کرم دین نے شرمندگی سے گردن جھکاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

''میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ کتاب تم لے گئے ہو گے۔''

''نہ جانے کیوں مجھ سے غلطی ہو گئی سرکار۔''

''جیسا تم کہہ رہے ہو۔ اس کتاب میں دیے گئے طریقوں کے مطابق ویسا تو ہونا ہی تھا۔'' بابا سائیں بات کرتے ہوئے رکے پھر ایک لمبی سانس چھوڑتے ہوئے بولے ''مجھے تفصیل سے بتاؤ۔ تم نے کون کون سے عملیات کیے تھے؟''

بابا سائیں کی بات سن کر کرم دین کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر ہمت کر کے تمام تر تفصیلات بیان کرنے لگا، وہ بولتا رہا، بابا سائیں خاموشی سے سنتے رہے، جب وہ اپنی بات مکمل کر چکا تو بابا سائیں افسردہ لہجے میں بولے ''یہ تم نے کیا کیا کرم دین؟ سچ پوچھو تو تم نے خود پر ہی نہیں اپنے بیوی بچوں پر بھی بہت بڑا ظلم کیا ہے''

''مجھے بہت سزا مل چکی۔ اب کچھ کیجئے سرکار! نہیں تو میں زندگی بھر کبھی سکون سے سو نہیں پاؤں گا۔'' بات کرتے ہوئے کرم دین رو پڑا۔

''اب روتے کیوں ہو۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب آنے والی مزید مشکلات سے بچنے کا سوچو۔''

''اسی لیے تو آپ کے پاس آیا ہوں سرکار۔ مجھے کسی طرح اس عذاب سے بچا لیجئے''

کرم دین کی بات سن کر بابا سائیں کسی گہری سوچ میں پڑ گئے پھر بولے ''تم مجھے کچھ وقت دو۔ میں اس بارے میں کچھ سوچتا ہوں۔''

''جتنا چاہیں وقت لے لیں سرکار۔ مگر مجھے کسی طرح اس عذاب سے نجات دلا دیں۔''

''میں نے کہا ناں۔ میں کچھ نہ کچھ کرتا ہوں۔ تم میرے پاس ایک ہفتے بعد آنا۔ امید ہے تب تک میں اس مشکل کا کوئی نہ کوئی حل ڈھونڈ ہی لوں گا''

''تو پھر اب میں جاؤں سرکار؟''

''ہاں ہاں اب تم جاؤ۔ بس اب اور زیادہ پریشان نہیں ہونا۔''

بابا سائیں کی بات سن کر کرم دین نے ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر چومے اور پھر باری باری انہیں اپنی آنکھوں پر لگا کر پھر سے چوما اور وہاں سے نکل پڑا۔

☆☆☆☆☆

بابا سائیں کو جیل میں دیکھ کر کرم دین کو دلی دکھ ہوا تھا، وہ اپنی پریشانی کی وجہ سے ان سے یہ بھی دریافت نہیں کر پایا تھا کہ انہیں کس جرم میں وہاں بند کیا گیا تھا، لیکن اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ چاہے اسے کتنی ہی دولت خرچ کرنی پڑے وہ کسی بھی طرح انہیں قید سے رہائی ضرور دلائے گا، ویسے بھی اب تک اس نے جو کچھ کما کر جمع کیا تھا وہ انہیں کی وجہ سے تھا ورنہ اس سے پہلے تو وہ دو وقت کی روٹی بھی بمشکل پوری کر پاتا تھا۔

اسے اس بات کی تسلی تھی کہ اس نے اپنی الماری میں جو دولت جمع کر رکھی تھی، وہ اس سے شہر کے بڑے سے بڑے وکیل کو بھاری فیس دے کر مقدمہ جیت لے گا اور بابا سائیں کو رہائی دلوانے میں کامیاب ہو جائے گا، اس خیال کے آتے ہی اس نے اپنی اس جیب کو تھپتھپایا جس میں الماری کی چابیاں تھیں، جہاں اس کی دولت بہت سے تالوں کے پیچھے محفوظ تھی، اس نے یہ سوچ کر الماری کو کئی تالے لگا رکھے تھے کہ اگر کبھی کوئی چور، ڈاکو آ جائے تو با آسانی اس کی دولت چرا نہ سکے۔

کچھ دن بعد جب معقول رقم اس کے پاس اکٹھی ہو جاتی، وہ اسے گن کر الماری میں رکھ دیتا اور تسلی سے سارے تالے بند کر کے چابی اپنی جیب میں ڈال لیتا تھا، پچھلے کچھ عرصے سے اس کے پاس تعویز دھاگے کے لیے کوئی بھی نہیں آیا تھا، الماری میں رکھی ہوئی دولت کے علاوہ اس کے پاس جو رقم تھی وہ اسی میں سے خرچ کر رہا تھا، ایک عرصے سے الماری میں پڑی ہوئی رقم میں کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا، اس لیے وہ کھولی بھی نہیں گئی تھی۔

بابا سائیں نے ایک ہفتے کے بعد آنے کا کہا تھا اور یہ سات دن اسے سات صدیاں لگ رہے تھے، مگر جیسے تیسے ایک ایک کر کے دن کٹتے گئے اور آخر کار وہ دن بھی آ پہنچا جب اسے بابا سائیں کے پاس جانا تھا، وہ صبح جلدی ہی اٹھ گیا تھا، وہ دل ہی دل میں یہ سوچ کر خوش ہو رہا تھا کہ آج بابا سائیں سے مل کر اس کی ساری کی ساری پریشانیاں دور ہو جائیں گی، اس نے نہا دھو کر کپڑے پہنے اور خوشبو لگائی۔

کرم دین کا خیال تھا کہ وہ بازار سے ناشتہ کرنے کے بعد گھر واپس آئے گا تو اسے دیر ہو جائے گی، اس لیے اس نے پروگرام طے کر لیا تھا کہ وہ جاتے ہوئے راستے میں ہی ناشتہ کر لے گا اور پھر وہیں سے بابا سائیں سے ملاقات کے لیے نکل پڑے گا۔

اس نے پچھلے سات دنوں میں اس بات کی مکمل منصوبہ بندی کر لی تھی کہ وہ بابا سائیں سے تفصیلی بات کر کے اسی روز ان کے لیے کوئی اچھا وکیل کر لے گا جو ایک دو پیشیوں میں ہی انہیں باعزت بری کروا دے گا، وہ اپنے ساتھ کچھ رقم لے جانا چاہتا تھا تاکہ اس میں سے کچھ رقم بابا سائیں کو دے سکے اور پھر واپسی پر وکیل کی فیس بھی ادا کی جا سکے۔

کرم دین نے جیب سے چابیاں نکال لیں اور الماری کھولنے لگا، اب سب تالے کھل چکے تھے اور نوٹوں کی گڈیاں اس کے سامنے تھیں، وہ سوچنے لگا ''عائشہ بیوقوف اور پاگل تھی، تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود گنوار تھی، اسے دولت کی طاقت کا اندازہ ہی نہیں تھا، وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ دولت تو دولت ہوتی ہے، خواہ کسی بھی ذریعے سے کمائی جائے، مگر اسے دولت سے بڑھ کر اپنے بچے پیارے تھے'' وہ اور بھی بہت کچھ سوچتا، لیکن بچوں کے متعلق آنے والی سوچ نے اسے پریشان کر ڈالا تھا، پھر جیسے ہی خیالوں سے نکل کر اس کی نظر رنگ برنگے نوٹوں کی گڈیوں پر پڑی تو اسے سب کچھ بھول گیا اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ نوٹوں کی گڈیوں کی طرف بڑھا دیے، مگر اگلے ہی لمحے اس کا سر چکرا کر رہ گیا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا، اس نے گرتے گرتے الماری کو پکڑ لیا تھا، اس لیے گرنے سے بچ گیا، بظاہر نظر آنے والی دولت، مٹی کا ڈھیر بنی پڑی تھی، اس نے باقی گڈیوں کو بھی اٹھا کر دیکھا انہیں بھی دیمک چاٹ گئی تھی، وہ جس گڈی کو ہاتھ میں لیتا وہ مٹی بن کر اس کے ہاتھوں سے نکل کر زمین پر جا گرتی تھی۔

کرم دین کو جس دولت کا بہت گھمنڈ تھا وہ دیکھتے ہی دیکھتے مٹی کی شکل میں فرش پر پڑی دکھائی دینے لگی تھی، جس میں مختلف رنگوں کے نوٹوں کے کچھ ٹکڑے بھی دکھائی دے رہے تھے، قریب تھا کہ فرش پر پڑی اس ڈھیری کو دیکھ کر وہ بھی فرش پر ہی ڈھیر ہو جاتا، اس نے خود کو قریب بچھی ہوئی چارپائی پر گرا دیا اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔

جب کرم دین نے اپنے ہاتھوں سے اپنے بچوں کو قبروں میں اتارا تھا اور پھول جیسے بچوں پر مٹی ڈالی تھی، تب بھی اسے کوئی دکھ نہیں ہوا تھا، اس نے جس دولت کو پانے کی خاطر اپنے بیوی بچوں کی قربانی دی تھی، اسے مٹی کا ڈھیر بنے دیکھ کر وہ تڑپ اٹھا تھا، درد کی شدت اسے سکون سے بیٹھنے نہیں دے رہی تھی، بیوی بچوں کو دفن کرتے ہوئے اس کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہیں نکلا تھا، کیونکہ جس چیز سے اسے پیار تھا وہ تو اس کی الماری میں تالوں کے پہرے میں محفوظ پڑی تھی اور اس کی چابیاں اس کی جیب میں تھیں، پھر وہ کیوں روتا، مگر آج اسے اپنے آنسوؤں پر قابو نہیں رہا تھا اور مسلسل روئے جا رہا تھا۔

گو کہ اس پہ بہت مشکل اور بھاری وقت گزر رہا تھا مگر اسے یہ اطمینان تھا کہ اس کی تجوری میں بہت سی دولت جمع ہے، وہ جب چاہے گا اپنے لیے خوشیاں خرید لے گا، لیکن شائد اسے کسی نے یہ نہیں بتایا تھا کہ اگر خوشیاں صرف دولت سے خریدی جا سکتیں تو کسی بھی دولت مند کو کبھی کوئی دکھ، کوئی صدمہ نہ پہنچتا۔ وقت نے ایک بار پھر اسے بہت پیچھے دھکیل دیا تھا مگر اب بھی اس کے لیے بابا سائیں کا سہارا باقی تھا، اس نے خود کو سمیٹا اور بابا سائیں کے ہاں سے چرائی ہوئی عملیات کی کتاب کپڑے میں لپیٹ کر ان سے ملاقات کے لیے چل پڑا۔

☆☆☆☆☆

کرم دین نے جیسے ہی بابا سائیں کو دیکھا تو خود پر قابو نہ پا سکا اور ان سے لپٹ کر بے اختیار رونے لگا۔

''رونے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا کرم دین۔ اپنے دل کو مضبوط کرو، ابھی تو تمہیں بہت سے کٹھن مراحل سے گزرنا ہے، تم اگر ابھی سے ہمت ہار گئے تو آنے والے حالات کا مقابلہ کیسے کر پاؤ گے''

''میں حالات سے لڑتے لڑتے تھک گیا ہوں سرکار! اب حالات سے مقابلہ کرنے کی مجھ میں ہمت باقی نہیں رہی۔ مجھے صرف آپ کا ہی سہارا ہے، اب آپ ہی میری مدد کر سکتے ہیں۔'' کرم دین نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے پچھلے کئی دنوں سے تمہارے معاملے پر بہت غور کیا ہے اور میری نظر میں اس کا صرف ایک ہی حل ہے۔''

''آپ جو بھی کہیں گے میں کرنے کو تیار ہوں سرکار۔''

''کام بہت مشکل ہے۔''

''سرکار آپ ایک بار حکم تو کریں۔''

''تو سنو کرم دین۔ تمہاری تمام تر مشکلات کا حل اس میں ہے کہ تم کوئی ایسا شخص تلاش کرو جو یہ علم سیکھنا چاہتا ہو۔ جب تم یہ علم کسی اور کو منتقل کر دو گے تو تمہارے سر سے یہ بوجھ اتر جائے گا، ورنہ عمر بھر پچھتاوے کی آگ میں جلتے رہو گے۔ لیکن ایک بات کا خاص خیال رکھنا، تم جس شخص کو بھی اس کام کے لیے تیار کرو، وہ اپنے وظیفے کے لیے آبادی سے دور کسی کھلی جگہ کا انتخاب کرے، ورنہ وہاں کے لوگوں پر کوئی بھی آفت آ سکتی ہے''

''میں سمجھ گیا سرکار۔ جیسا آپ نے کہا ہے ویسا ہی ہوگا۔'' کرم دین نے بات کی اور پھر کپڑے میں لپٹی ہوئی کتاب بابا سائیں کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا ''اور یہ کتاب بھی رکھ لیجیے سرکار، جس کی وجہ سے میں اس حال کو پہنچا ہوں۔''

''قصور اس کتاب کا نہیں، قصور تمہاری سوچ کا ہے۔ جس پر تم قابو نہیں پا سکے اور سب کچھ سمیٹنے کی ہوس میں اندھے ہو کر اپنا سب کچھ گنوا بیٹھے''

''مجھے اپنی غلطی کا احساس ہے سرکار۔ کوشش کروں گا آئندہ ایسا نہ ہو۔''

''تمہارا مجھ پر بہت بڑا احسان ہے کرم دین۔ اسی لیے تمہیں مشکلات سے نکلنے کی راہ دکھا رہا ہوں۔ ورنہ جو غلطی تم نے کی ہے وہ قابل معافی نہیں۔ کرم دین میں جیسا بھی ہوں وہ میرا ذاتی فعل ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں نے تمہارے لیے اچھا ہی سوچا تھا۔ مگر تم کسی اور ہی راہ پر چل نکلے''

''سرکار!۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ مجھ سے واقعی بہت بڑی بھول ہو گئی۔ اب جیسا آپ کہیں گے ویسا ہی ہوگا۔'' کرم دین نے روتے

ہوئے بابا سائیں کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔
''اب روتے کیوں ہو؟ جیسا میں نے کہا ہے ویسا کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا''
''اچھا سرکار اب مجھے اجازت دیں۔'' کرم دین نے رخصت ہونے کے لیے بابا سائیں کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔
بابا سائیں نے کرم دین سے ہاتھ ملایا اور پھر اس کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے جانے کی اجازت دے دی۔
بابا سائیں سے ملاقات نے کرم دین کو ایک نیا حوصلہ دیا تھا، وہ گھر پہنچا تو بہت مطمئن تھا، اس کی حالت اس مریض کی سی تھی جو اپنی بیماری کے علاج کے لیے کسی سپیشلسٹ سے نسخہ لکھوا کر لایا ہو اور اسے اس بات کی تسلی ہو کہ اب اس کی بیماری ختم ہو جائے گی۔

☆☆☆☆☆

کرم دین کے لیے سب سے بڑا مسئلہ کسی ایسے شخص کی تلاش تھی جو بخوشی وہ سارا علم سیکھنے کے لیے تیار ہو جاتا، جس کے بوجھ تلے وہ بری طرح دبا ہوا تھا، وہ حسب عادت سر پہ بازو رکھے چارپائی پر پڑا دیر تک سوچتا رہا مگر اس کے دوستوں اور ملنے ملانے والوں میں سے کوئی بھی ایسا شخص ذہن میں نہیں آ رہا تھا جس سے اس سلسلے میں بات کی جا سکتی، اچانک اس کے ذہن میں ایک ایسا نام ابھرا، جس کے بارے میں اسے مکمل یقین تھا کہ وہ اس کام کے لیے بخوشی تیار ہو جائے گا۔
مبارک کا خیال آتے ہی اس کے بدن میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی اور وہ اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنے کی منصوبہ بندی کرنے لگا، ایک وقت تھا جب وہ عملیات کا علم جاننے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار تھا مگر اب وہ اسے بوجھ لگنے لگا تھا جسے وہ کسی اور کے کندھوں پر ڈال دینا چاہتا تھا۔
اس نے مبارک کو اپنے جال میں پھنسانے کے لیے مکمل منصوبہ بندی کر لی تھی، کرم دین کا پیغام ملنے کے کچھ ہی دیر بعد مبارک اس کے ہاں پہنچ گیا تھا، کرم دین اسے یوں گلے لگا کر ملا تھا جیسے بچھڑنے کے بعد اس سے پہلی بار ملاقات ہوئی ہو، وہ اسے اپنے مخصوص کمرے میں لے گیا اور بلا مقصد ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔
مبارک اس سے پہلے بھی کئی بار کرم دین کے ہاں آ چکا تھا، آج کرم دین نے پیغام بھجوا کر خصوصی طور پر اسے بلوایا تھا مگر ابھی تک کرم دین کی کسی بات سے اسے یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ اسے کس مقصد کے لیے بلوایا گیا تھا۔
''کوئی کام تھا کرم دین؟'' مبارک نے سوال کیا۔
''کیا کسی کام کے علاوہ میں تمہیں نہیں بلوا سکتا۔'' مبارک کے سوال کا جواب دینے کی بجائے کرم دین نے الٹا اس سے سوال کر دیا۔
''کیوں نہیں۔ تم جب چاہو مجھے بلوا سکتے ہو۔ میں تو اس لیے پوچھ رہا تھا کہ شائد کوئی کام ہو۔''
''کام کیا ہونا ہے۔ بس ایسے ہی تم سے ملنے کو دل چاہ رہا تھا اسی لیے پیغام بھجوا دیا۔ اب تم یہ بتاؤ تمہاری کیا خدمت کی جائے؟''
''کسی قسم کے تکلف کی ضرورت نہیں۔ بس گپ شپ لگاتے ہیں۔''
''میں نے کون سا کوئی تکلف کرنا ہے..... بس ذرا سا ایک اشارہ کرنا ہے اور سب کچھ حاضر۔''
''یہ بات ہے تو پھر جو چاہے منگوا لو۔''
''لاؤ بھئی میرے دوست کے لیے اچھی قسم کی کچھ کھانے پینے کی چیزیں لاؤ۔'' کرم دین چھت کی طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑایا
مبارک، کرم دین کی ایسی کیفیت پہلے بھی دیکھ چکا تھا اس لیے اسے زیادہ حیرانی نہ ہوئی لیکن وہ اس بات کا انتظار کرنے لگا کہ کرم دین کے موکل کیا لے کر آتے ہیں، وہ ابھی اسی سوچ میں تھا کہ کرم دین کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی، وہ چھت کی طرف دیکھتے ہوئے گردن ہلاتے ہوئے کہہ رہا تھا ''ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔'' اس کے انداز سے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی کی بات کا جواب دے رہا ہو۔
''آؤ دوسرے کمرے میں چلتے ہیں۔'' کرم دین نے اٹھتے ہوئے مبارک سے کہا۔
کرم دین کی بات سن کر کوئی بھی سوال کیے بغیر مبارک بھی اٹھ گیا تھا، کرم دین چلا تو وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا، وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے جس کمرے میں داخل ہوئے تھے، وہاں میز پر طرح طرح کے انتہائی اعلیٰ قسم کے تازہ پھل پڑے تھے جن کی خوشبو سے کمرہ مہک رہا تھا۔
وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے کرسیوں پر خاموش بیٹھے تھے۔ ''جو دل چاہے جی بھر کے کھاؤ.....'' کرم دین نے خاموشی توڑتے ہوئے

کہا۔

''یہ سب کیسے ہو جاتا ہے ؟'' مبارک نے پھلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حیران ہو کر دریافت کیا۔

''آسان سی بات ہے۔ میرے پاس موکل ہیں، میں جب بھی ان سے جو چاہتا ہوں منگوا لیتا ہوں۔ وہ میرے حکم کے غلام ہیں اور میرا اشارہ پاتے ہی جیسا میں چاہتا ہوں کر دیتے ہیں۔ اس کے لیے مجھے کہیں جانا پڑتا ہے اور نہ ہی جیب سے کوئی رقم خرچ کرنا پڑتی ہے''

''بڑی حیرانی کی بات ہے۔'' مبارک نے سیب کا ایک ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''اس میں حیران ہونے والی تو کوئی بات نہیں۔ تم چاہو تو یہ سب تم بھی حاصل کر سکتے ہو۔''

''نہ بھئی نہ مجھے تو جنوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔''

''ڈر کس بات کا؟ جن تو تمہارے غلام ہوں گے۔ تم ان سے جو کام لینا چاہو لے سکو گے''

''پھر بھی ڈر تو لگتا ہے ناں۔''

''میں ہوں ناں۔ میرے ہوتے ہوئے تمہیں کسی قسم کا فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

''نہ بابا نہ میں نے نہیں سیکھنا یہ کام.....'' مبارک نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔

مبارک کی باتیں کرم دین کی مایوسی بڑھا رہی تھیں، اسے مبارک کے روپ میں روشنی کی جو کرن دکھائی دے رہی تھی وہ ختم ہوتی نظر آنے لگی تھی۔ ''اگر تمہارا دل نہیں مانتا تو تمہاری خوشی۔ یہ کوئی زبردستی تھوڑی ہے۔ میں تو اپنا دوست سمجھ کر تمہیں یہ علم سکھانا چاہتا ہوں۔ ورنہ تو کسی کی منت سماجت پر بھی میں یہ علم کسی کو نہ سکھاؤں'' مبارک کو اپنے مقصد کے لیے تیار کرنے کے لیے کرم دین نے بھرپور وار کیا۔

''کہتے تو تم ٹھیک ہو۔ مگر۔ پھر بھی۔''

''اچھا تم اپنے ذہن پر اتنا زور مت ڈالو'' کرم دین نے بات کی اور پھر پھلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ تمہارے سامنے جو کچھ پڑا ہے، یہ کھانے کے لیے ہے دیکھنے کے لیے نہیں۔ کم از کم اس کے ساتھ تو انصاف کرو''

''اس کی تم فکر نہ کرو۔ اس کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا جائے گا'' مبارک نے ہنستے ہوئے بات کی اور پھل کھانے لگا۔

کرم دین کو موکلوں کے ذریعے کئی مواقع پر مختلف اشیاء منگواتے ہوئے دیکھ کر مبارک کے دل میں بھی اس خواہش نے انگڑائی لی تھی ''کاش اس کے قبضے میں بھی کوئی جن ہوتا، جس سے وہ بھی جو چاہتا آرام سے گھر بیٹھا منگوا لیا کرتا اور اس کے دوسرے کام بھی چٹکیوں میں ہو جایا کرتے''، مگر وہ چاہتے ہوئے بھی کبھی کرم دین سے اپنی اس خواہش کا اظہار نہیں کر پایا تھا لیکن آج قدرت نے اسے خود یہ موقع فراہم کیا تھا، جسے وہ ٹھکرا آیا تھا۔

مبارک چارپائی پر لیٹا مختلف پہلوؤں پر غور کرتے ہوئے بار بار پہلو بدل رہا تھا، اس سے فیصلہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ اس نے کرم دین کی آفر قبول نہ کر کے صحیح کیا تھا یا غلط، اس کا دل اس حق میں تھا کہ کرم دین سے عملیات سیکھ لیے جائیں مگر دماغ اس بات سے ڈر رہا تھا کہ اس معاملے میں کئی مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑ سکتا ہے، رات بھر دل اور دماغ کی جنگ جاری رہی کبھی دل کا پلڑہ بھاری ہو جاتا اور کبھی دماغ دل پر غالب آ جاتا، اسی کشمکش میں رات بیت گئی مگر کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔

رات بھر جاگتے رہنے کے بعد صبح کے وقت بمشکل مبارک کی آنکھ لگی تھی مگر وہ زیادہ دیر سو نہ سکا اور اس کی ماں نے اسے کام پر جانے کے لیے جگا دیا، چھٹی کا دن ہوتا تو وہ کسی بھی قیمت پر چارپائی چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہوتا مگر اسے کام پر جانا تھا اس لیے مجبوراً اٹھنا پڑا، کیونکہ اگر وہ نہ جاتا تو اس کی ایک دن کی تنخواہ کٹ جاتی، اسے پڑھنے لکھنے کا کوئی شوق نہیں تھا، اسی لیے انٹر میں بار بار فیل ہونے کے بعد اس کے والدین نے مجبوراً اسے قریب ہی فرنیچر بنانے والی فیکٹری میں کام پر لگوا دیا تھا۔

ماں کے اٹھانے پر وہ بمشکل اٹھا اور ناشتے کے بعد سائیکل پر سوار ہو کر فیکٹری کے لیے گھر سے نکل پڑا، فیکٹری پہنچ کر وہ روز کی طرح اس مشین پر جا کھڑا ہوا تھا جہاں بطور ہیلپر اس کی ڈیوٹی تھی، وہ جسمانی طور پر مشین کے پاس کھڑا کام کر رہا تھا مگر اس کا ذہن کرم دین کی باتوں میں الجھا ہوا تھا، جس کی وجہ سے وہ کام پر پوری توجہ نہیں دے پا رہا تھا، ایسا بہت کم ہوا تھا کہ اسے کبھی کسی کام کی وجہ سے ڈانٹ پڑی ہو لیکن اس روز وہ ایک ہی دن میں کئی بار اپنے انچارج کی جھاڑیں سن چکا تھا، یہی وہ لمحے تھے جب اس نے کرم دین سے وہ عملیات سیکھنے کا ارادہ کر لیا جنہیں سیکھنے سے وہ جنات کو اپنے قابو میں کر کے ان کے ذریعے جو کام چاہتا کروا سکتا تھا، وہ سوچنے لگا کہ اس طرح محنت مزدوری سے بھی جان چھوٹ

جائے گی اور با آسانی جتنی چاہے دولت بھی سمیٹ لے گا، اس خیال کے آتے ہی وہ بے صبری سے شام ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

کرم دین، مبارک کی طرف سے پوری طرح مایوس نہیں ہوا تھا، اس کا خیال تھا کہ وہ تھوڑی سی کوشش اور کرے گا تو اسے قائل کرنے میں ضرور کامیاب ہو جائے گا، پھر بھی اس کے دل میں اس خوف نے جگہ بنالی تھی کہ اگر وہ کسی بھی طرح تیار نہ ہوا تو کیا ہوگا، وہ اس سوچ میں پڑ گیا کہ ایسے میں اسے کیا کرنا چاہیے، دن اسی سوچ میں گزر گیا مگر مبارک نہ آیا، رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا، امید، مایوسی میں بدل رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی، کرم دین نے بے دلی سے دروازہ کھولا تھا، مگر مسکرائے بغیر رہ نہ سکا کیونکہ وہاں اس کے سامنے مبارک کھڑا تھا، کرم دین یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کس لیے وہاں آیا تھا مگر اس کے باوجود اسے دیکھ کر کرم دین کے بیمار جسم میں نئی طاقت آ گئی تھی۔

مبارک کو کمرے میں بٹھا کر کرم دین وہ تمام پھل پلیٹوں میں ڈال کر لے آیا جو پچھلے روز بچ گئے تھے، کرم دین جلدی سے جان لینا چاہتا تھا کہ اس نے عملیات کے متعلق اس کی تجویز کے بارے میں کیا سوچا ہے مگر وہ چاہتا تھا کہ اس بارے میں بات کا آغاز وہ خود کرے تو زیادہ بہتر ہوگا۔

''تم نے بہت اچھا کیا جو آ گئے۔ ورنہ میں بھی گھر میں اکیلا بیٹھا بور ہوتا رہتا ہوں۔ اب تم آ گئے ہو تو کم از کم کچھ وقت تو اچھا گزرے گا'' کرم دین نے بات کا آغاز کیا۔

''اصل میں آج سارا دن میں تمہاری بات پر غور کرتا رہا۔''

''میری۔ کون سی بات؟'' کرم دین نے جان بوجھ کر انجان بنتے ہوئے کہا۔

''وہی جو کل تم۔ جنات کے بارے میں ذکر کر رہے تھے۔''

''مگر وہ بات تو کل ہی ختم ہو گئی تھی۔'' مبارک کی بات سن کر کرم دین کے دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے مگر اس نے اپنے دل کی کیفیت چھپاتے ہوئے کہا۔

''ہاں میں نے کہا تو ایسا ہی تھا۔ مگر بعد میں سوچا کہ تمہاری بات ماننے میں کوئی حرج نہیں۔ اصل میں دل تو چاہتا ہے لیکن۔ ڈر بھی لگتا ہے۔''

''اگر ڈرو گے۔ تو کچھ بھی نہیں کر پاؤ گے۔ پہلے اپنے اندر کے سارے خوف، سارے ڈر ختم کرو پھر اس کام کا آغاز کرو۔ اور ویسے بھی جب میں تمہارے ساتھ ہوں تو تمہیں فکر کی کیا ضرورت ہے''

''پھر بھی ڈر تو لگتا ہے ناں۔''

''تم ایک دو دن اچھی طرح سوچ لو۔ بس اتنا یاد رکھنا۔ اگر اپنے دل سے ڈر نکال دو گے تو عیش کرو گے ورنہ ساری زندگی مر مر کے گزرے گی.....'' کرم دین نے ایک اور تیر پھینکا۔

بات سن کر مبارک سوچ میں پڑ گیا تھا، کرم دین نے بھی جان بوجھ کر مزید کوئی بات نہ کی اور اسے اچھی طرح سوچنے کا موقع دیا۔

''مجھے کرنا کیا ہوگا ؟'' مبارک نے کچھ دیر سوچنے کے بعد دریافت کیا۔

''لگتا ہے اب تم اس کام کے لیے پوری طرح تیار ہو۔''

''جب کسی کام کے لیے ارادہ کر ہی لیا تو پھر اتنا کیا سوچنا۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ تم بس یہ بتا دو کہ اس کام کی ابتدا کب سے کی جائے۔''

''نیک کام میں دیر تو نہیں ہونی چاہئے، لیکن پھر بھی ہمیں چاند کی پہلی جمعرات تک انتظار کرنا ہوگا تاکہ جیسے جیسے چاند روشن ہوتا جائے وظیفہ پڑھنے میں آسانی رہے اور پھر اگلے ماہ چاند کی چودھویں تاریخ تک یہ کام مکمل بھی ہو جائے۔ ابھی تمہارے پاس دو دن ہیں، تم اپنی تیاری کر لو، میں تمہیں تمام تفصیلات بتا دیتا ہوں'' کرم دین نے بات کی اور پھر مبارک کو دیگر معلومات فراہم کرنے لگا۔

☆☆☆☆☆

کرم دین سے تمام معلومات حاصل کرنے کے بعد مبارک چپ چاپ اپنی چارپائی پر آ کر لیٹ گیا تھا، وظیفہ دائرے میں بیٹھ کر پڑھا جانا تھا اور کرم دین کے کہنے کے مطابق جس دائرے میں بیٹھ کر وظیفہ پڑھا جانا تھا اس میں کوئی بھی دوسری مخلوق کسی بھی صورت میں داخل نہیں ہو سکتی تھی، اس لیے کسی پریشانی کی ضرورت نہیں تھی۔ مبارک نے خود کو اس عمل کے لیے پوری طرح تیار کر لیا تھا مگر گھر والوں کو بتائے بغیر کئی روز تک راتوں کو گھر سے غائب رہنا کسی بھی طرح ممکن نہیں تھا۔

مبارک کو علم تھا کہ اس کا باپ کسی بھی صورت میں اس کام کے لیے راضی نہیں ہوگا، تاہم اسے اس بات کا یقین تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنی ماں کو اس مقصد کے لیے ضرور منا لے گا۔

''اماں! ایک بات کروں؟'' موقعہ ملتے ہی مبارک نے بات شروع کی۔
''لگتا ہے کوئی خاص بات ہے، جس کے لیے تم باقاعدہ اجازت لے رہے ہو۔''
''بات تو بڑی خاص ہے، لیکن پہلے یہ وعدہ کرو کہ تم یہ بات ابا سے نہیں کرو گی۔''
''بات سنے بغیر میں یہ وعدہ کیسے کر سکتی ہوں ؟''
''اماں بات جو بھی ہے بس ابا کو نہیں بتانی۔''
''اچھا نہیں بتاؤں گی۔''
''وعدہ؟''
''ہاں بابا کہہ تو دیا نہیں بتاؤں گی اب کیا لکھ کر دوں؟''
''میں جن قبضے میں کرنے کے لیے کرم دین سے وظیفہ سیکھنے لگا ہوں۔'' مبارک نے ماں کو رازداری سے بتایا۔
''تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟'' ماں نے بیٹے کو ڈانٹا۔
''اماں ذرا سوچو تو سہی۔ چند وظیفے پڑھ لینے سے اگر جن قبضے میں آ جائے تو بھلا اور کیا چاہیے۔''
''کیوں مرنے والے کام کرتے ہو؟''
''اماں فکر کی کوئی بات نہیں، کرم دین میرے ساتھ ہے۔''
''کرم دین کا نام سن کر تو ساری بستی کے لوگ تھوتھو کرتے پھرتے ہیں اور تم اسی سے تعلق جوڑنے کی باتیں کر رہے ہو۔''
''اماں ہمیں اس سے کیا لینا دینا۔ تم ذرا سوچو تو سہی جب لاکھوں روپے یوں چٹکیوں میں ہمیں جن لا کر دے گا تو ہم کتنے امیر ہو جائیں گے۔'' مبارک نے چٹکی بجاتے ہوئے ماں کو سمجھایا تو لاکھوں کی بات سن کر اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی پھر بھی اپنی تسلی کے لیے بولی۔
''لاکھوں روپے ہمیں جن لا دے گا؟''
''ہاں اماں ہاں۔ بس تم میرا ساتھ دو اور میرے آنے پر رات کو چپکے سے دروازہ کھول دیا کرنا۔ ویسے بھی تھوڑے دنوں کی تو بات ہے۔ ایک بار جن میرے قبضے میں آ جائے، پھر دیکھنا میں اس سے کیا کیا کام لیتا ہوں۔''
''خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔'' اماں نے بات کی پھر اپنا منہ اس کے کان کے قریب لاتے ہوئے آہستہ سے بولی ''بس اب اس بات کا خیال رکھنا، اپنے ابا کو اس بارے میں خبر نہ ہونے دینا، وہ کبھی بھی اس کام کے لیے راضی نہیں ہو گا''
ماں کو منانے کا کام با آسانی ہو گیا تھا، اب اسے دو دن بعد آنے والی چاند کی پہلی جمعرات کا انتظار تھا، جن کو قابو کرنے کے لیے جو وظیفہ پڑھا جانا تھا، اس کا آغاز عشاء کی نماز کے بعد ہونا تھا، جمعرات کو سارا دن مبارک اندھیرا پھیلنے کا انتظار کرتا رہا تا کہ وہ کرم دین سے مزید معلومات حاصل کر کے چلہ کاٹنا شروع کر دے۔
کرم دین سے ضروری ہدایات لینے کے بعد مبارک مسجد میں گیا اور عشاء کی نماز ادا کی، اس نے اپنی تسلی کے لیے دن میں ہی اس جگہ کا اچھی طرح جائزہ لے لیا تھا، جہاں بیٹھ کر اسے چلہ کاٹنا تھا، نماز کے بعد اس نے سیدھا وہیں کا رخ کیا تھا، وہ انتہائی ڈرپوک تھا مگر چلے کے بعد ملنے والی دولت اور عیاشیوں کا سوچ کر اس کے سارے ڈر ختم ہو گئے تھے۔
مقررہ جگہ پر پہنچ کر سب سے پہلے اس نے انتہائی احتیاط سے ادھر ادھر کا جائزہ لیا پھر کرم دین کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق گول دائرہ لگا کر اس کے اندر جائے نماز بچھائی اور اس پر بیٹھ گیا، مبارک کے لیے یہ انتہائی مشکل مرحلہ تھا، گو کہ کرم دین کے کہنے کے مطابق دائرے میں بیٹھ کر کسی بھی چیز سے نقصان پہنچنے کا کوئی امکان نہیں تھا مگر اس کے باوجود اسے خوف محسوس ہو رہا تھا، وہ اپنے اندر کے اس خوف پر قابو پانے کے لیے لمبی لمبی سانسیں لینے لگا، اس عمل نے اس کا اعتماد بحال کرنے میں بھرپور مدد دی تھی، پھر اس نے خدا کو یاد کیا اور وظیفہ پڑھنے کا آغاز کر دیا، جیسے جیسے وہ کرم دین کی بتائی ہوئی آیات کا ورد کرتا گیا اس کا اعتماد بحال ہوتا چلا گیا۔
پچھلی رات خیریت سے گزری تھی جس کی وجہ سے مبارک قدرے پرسکون تھا، اس نے ایک بار پھر دائرہ کھینچا اور اس کے اندر بیٹھا کرم دین کے بتائے ہوئے الفاظ پڑھ کر تسبیح کے دانے گرانے لگا۔
پھر ایک ایک کر کے دن گزرنے لگے، یوں دس دن گزر چکے تھے، وہ پہلے روز کی طرح ہر روز عشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد مقررہ جگہ پر جا

بیٹھتا اور وہیں دائرے میں بیٹھا تسبیح کرتا رہتا، تسبیح کی مقررہ تعداد پوری کرنے میں اسے تین سے چار گھنٹے لگتے تھے، پھر جیسے ہی وہ اس عمل سے فارغ ہوتا گھر لوٹ آتا، جہاں فاطمہ اس کی راہ دیکھ رہی ہوتی، عیش و آرام اور دولت کے حصول کی خاطر فاطمہ نے اکلوتے بیٹے کو چلہ کاٹنے کی اجازت تو دے ڈالی تھی مگر جب تک وہ واپس گھر نہ پہنچ جاتا اس کی جان سولی پر لٹکی رہتی، اس کے واپس آنے تک فاطمہ کے دل سے مبارک کے بخیریت گھر لوٹ آنے کے لیے دعائیں نکلتی رہتی تھیں، ایسے میں اس کی آنکھ کس طرح لگ سکتی تھی، جب مبارک بخیریت گھر پہنچ کر اپنی چارپائی پر لیٹ جاتا، تب کہیں اسے سکون کی نیند آتی۔

مبارک کو چالیس دن کا چلہ کاٹنا تھا، ایک حصہ بخیریت گزر چکا تھا جبکہ ابھی تین حصے باقی تھے، وہ روز کی طرح دائرے میں بیٹھا تسبیح کر رہا تھا کہ اس کے کانوں میں مکھیوں کے بھنبھنانے کی ہلکی ہلکی سی آواز پڑی، مگر مبارک نے اسے اپنا وہم جان کر کوئی توجہ نہ دی پھر، آہستہ آہستہ یہ آواز تیز ہونے لگی، مکھیوں کے بھنبھنانے کی آواز نے مبارک کو ہلکا سا پریشان ضرور کیا تھا مگر اس نے کوئی خاص اہمیت نہیں دی تھی اور اپنی تسبیح میں لگا رہا تھا، کچھ دیر تک یہ آوازیں اس کے کانوں میں پڑتی رہیں پھر آہستہ آہستہ ختم ہو گئیں، اس نے بلا خوف اس دن کا وظیفہ مکمل کیا اور گھر واپس آ گیا۔

گو کہ مکھیوں کے بھنبھنانے کی آوازوں نے اسے کوئی زیادہ پریشان نہیں کیا تھا مگر ان آوازوں کے متعلق کرم دین سے بات کرنا بہت ضروری تھا، اس لیے اگلے روز مبارک نے کرم دین کو رات کو آنے والی آوازوں کے بارے میں بتا دیا۔

''بس اتنی سی بات سے ڈر گئے؟'' مبارک کی بات سن کر کرم دین نے دریافت کیا۔

''میں ڈرنے والا نہیں۔ اور نہ ہی رات کو کانوں میں پڑنے والی مکھیوں کی آوازوں سے مجھے کوئی ڈر ہی محسوس ہوا تھا۔ میں تو بس تمہیں بتا رہا تھا کہ رات کو چلے کے دوران مجھے کچھ اس طرح کی آوازیں آتی رہیں۔'' مبارک نے اپنی پوزیشن واضح کرنے کی کوشش کی۔

''اب یہ ذہن میں رکھنا۔ جیسے جیسے دن گزرتے جائیں گے، تمہیں ڈرانے اور خوف زدہ کرنے کے لیے بہت کچھ ہوگا، تاکہ تم اس کام سے باز آ جاؤ۔ لیکن تم یہ بات یاد رکھنا۔ جب تک تم اس دائرے میں بیٹھے رہو گے، تمہیں کسی قسم کا کوئی بھی نقصان نہیں ہوگا۔''

''میں جانتا ہوں۔ اور مجھے پورا یقین ہے کہ میں اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوں گا''

''بس یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لو، جب تک تم کسی خوف کو اپنے دل میں جگہ کرنے نہیں دو گے، تب تک سب اچھا ہے۔ ورنہ۔ تم خود سمجھ دار ہو'' کرم دین نے مبارک کو مزید سمجھایا۔

اگرچہ اس طرح کی باتیں پہلے سے مبارک کے علم میں تھیں پھر بھی کرم دین کے منہ سے وہی باتیں دوبارہ سن کر اس نے خود کو اور بھی مضبوط کر لیا تھا اور کسی بھی خطرے سے نہ ڈرنے کا پکا ارادہ کر لیا تھا۔

☆☆☆☆☆

کرم دین کی باتوں نے مبارک کو نیا حوصلہ دیا تھا، اس نے اپنے دل میں یہ بات اچھی طرح بٹھا لی تھی کہ جب تک وہ دائرے میں رہے گا، کوئی بھی طاقت اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی، وہ روز کی طرح دائرہ کھینچ کر بیٹھ گیا اور چلہ کاٹنے لگا، ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ پچھلی رات کی طرح مکھیوں کی بھنبھناہٹ اس کے کانوں میں پڑنے لگی، جو کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی مگر اب مبارک کو ان آوازوں کی ذرہ بھر بھی پرواہ نہ تھی اور اس کی تمام تر توجہ تسبیح کے دانے گرانے میں تھی۔

دانے پہ دانہ گر رہا تھا، بظاہر وہ پرسکون تھا مگر تیز ہوتی ہوئی مکھیوں کی بھنبھناہٹ نما آوازیں آہستہ آہستہ قریب ہوتی جا رہی تھیں، پھر اسے یوں محسوس ہونے لگا کہ جسے وہ بھنبھناہٹ سمجھ رہا تھا، وہ دراصل بہت سے لوگوں کی آپس میں باتیں کرنے کی آوازیں تھیں، یہ محسوس ہونا تھا کہ مبارک کے دل میں خطرے کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔

تسبیح کے دانے اب بھی گر رہے تھے مگر ان کے گرنے کی رفتار کم ہوتی جا رہی تھی، اس کے کان مسلسل اسی طرف لگے ہوئے تھے، اب وہ آوازیں مزید واضح ہونے لگی تھیں اور ایسا محسوس ہونے لگا تھا، جیسے بہت سے لوگ دائرے کے اردگرد کھڑے آپس میں باتیں کر رہے ہوں، آوازیں اس کے کانوں میں پڑ رہی تھیں مگر وہاں کوئی کھڑا دکھائی نہیں دے رہا تھا، کئی لوگ ایک ساتھ بول رہے تھے اس لیے کوئی بھی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

گیارہ دن گزر چکے تھے اب تک مبارک کو کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا، کرم دین نے اس بات کی تسلی کروا دی تھی کہ دائرے میں بیٹھے ہوئے اسے کوئی بھی طاقت نقصان نہیں پہنچا سکتی، اس لیے اسے کچھ حد تک تسلی تھی مگر کانوں میں پڑنے والی آوازیں اسے پریشان کر رہی تھیں،

تسبیح کے دانے گرنا بند ہو گئے تھے اور اس کی آنکھیں تیزی سے اردگرد کا جائزہ لے رہی تھیں، کچھ دیر تک یہی کیفیت رہی پھر آہستہ آہستہ وہ آوازیں دور ہوتے ہوتے ختم ہو گئیں، آوازوں کے ختم ہونے پر مبارک نے سکھ کا سانس لیا اور جلدی سے اس روز کا وظیفہ مکمل کر کے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گھر جا پہنچا۔

مبارک جان چکا تھا کہ اب دن بدن اس کے لیے مشکلات بڑھتی جائیں گی، کوئی اور کام ہوتا تو وہ فوراً سے پہلے اس کام سے توبہ کر لیتا، مگر اس کام سے اسے عیش و آرام کی زندگی ملنے والی تھی اس لیے وہ تمام خطرات کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھا، یوں بھی اس کا چلہ ختم ہونے میں کچھ ہی دن باقی تھے، اب اسے اپنا مشن مکمل کرنے کے لیے اپنی آنکھیں اور دماغ کھلا رکھنا تھا۔

☆☆☆☆☆

پچھلی کئی راتوں سے اس کا معمول تھا کہ عشاء کی نماز کے بعد سیدھا مقررہ جگہ پر جانا اور وہاں دائرہ کھینچ کر اس میں بیٹھ کر بے دھڑک چلہ کاٹنے میں لگ جانا، آج بھی وہی وقت تھا، وہی جگہ تھی جہاں بیٹھ کر وہی کلمات پڑھنے تھے جو وہ ہر روز پڑھا کرتا تھا لیکن آج کہیں نہ کہیں انجانے خوف نے اس کے دل میں جگہ بنالی تھی، اس نے خود کو حوصلہ دیا اور دل مضبوط کر کے دائرے میں بیٹھ گیا۔

''یہ آج پھر آ گیا؟'' ایک آواز مبارک کے کانوں سے ٹکرائی۔

''اس کا کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ ورنہ یہ باز نہیں آئے گا'' ایک اور آواز مبارک کے کانوں میں پڑی، پھر بہت سی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

''اسے جنگلی جانوروں کے حوالے کر دیتے ہیں وہ خود ہی اس کا کام تمام کر دیں گے۔''

''جنگلی جانوروں کو رہنے دو۔ اس کے لیے شکاری کتے ہی کافی ہیں''

''میرے خیال میں تو یہ میرا ایک تھپڑ بھی برداشت نہیں کر پائے گا۔ اس کی گردن ٹوٹ جائے گی اور چہرہ دوسری طرف مڑ جائے گا۔''

آوازیں اس قدر خوفناک تھیں کہ اسے اپنے کانوں کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے اس نے جلدی سے اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے اور آنکھیں بند کر لیں، وہ تسبیح کرنا بھول گیا تھا اور زبان سے کلمات جاری تھے۔ ''یا اللہ معاف کر دے۔ یا اللہ معاف کر دے۔ یا اللہ معاف کر دے۔''

کچھ دیر اسی کیفیت میں گزر گئی، کچھ دیر بعد جب اسے محسوس ہوا کہ خطرہ ٹل چکا ہے تو اس نے اپنے کانوں سے ہاتھ اٹھا لیے، اس کا خیال درست ثابت ہوا تھا، اب کوئی آواز نہیں آ رہی تھی، کانوں سے ہاتھ اٹھانے سے اس بات کی تسلی ہو گئی تھی کہ اب کوئی آواز اس کے کانوں میں نہیں پڑ رہی تھی مگر اس کی آنکھیں ابھی تک بند تھیں، اس نے اپنی ایک آنکھ تھوڑی سی کھول کر دیکھا تو اس کی جان میں جان آئی، وہاں دائرے کے آس پاس نہ ہی کوئی موجود تھا اور نہ ہی کسی قسم کی کوئی آواز ہی آ رہی تھی۔

مبارک نے چاروں طرف گردن گھما کر اردگرد کا جائزہ لیا اور جب اسے اس بات کا اچھی طرح یقین ہو گیا کہ اب خطرے کی کوئی بات نہیں تو اس نے سکھ کا سانس لیا اور گھر جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا، مگر اچانک اسے خیال آیا کہ اس نے ابھی تک اس روز کا وظیفہ تو پڑھا ہی نہیں، وہ فوراً سے پہلے گھر جانا چاہتا تھا مگر یہ خیال آتے ہی وہ پھر سے مصلیٰ بچھا کر وہیں بیٹھ گیا اور تسبیح کے دانے گرانے لگا۔

اس روز اسے وظیفہ مکمل کرنے میں پچھلے دنوں کی نسبت زیادہ وقت لگا تھا، کیونکہ وظیفے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے اردگرد بھی نگاہ رکھے ہوئے تھا، خدا خدا کر کے اس کا وظیفہ پورا ہوا اور اس نے گھر کی راہ لی، گھر جاتے ہوئے بھی وہ دہشت زدہ تھا اور بار بار مڑ کر پیچھے دیکھتے ہوئے چل رہا تھا۔

وہ چارپائی پر آ کر لیٹ گیا تھا مگر اس کے اندر کا خوف ابھی بھی اسے گھیرے ہوئے تھا، اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے آوازیں آنا تو بند ہو گئی تھیں مگر ان کی گونج ابھی تک اس کے کانوں میں باقی تھی، وہ بار بار کروٹیں بدلنے لگا تاکہ کسی طرح آوازوں کی گونج سے پیچھا چھوٹ جائے لیکن ایسا ہو نہیں پا رہا تھا، عجیب سی بے چینی تھی جس نے اسے جکڑ رکھا تھا، پھر اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہوتی چلی گئیں اور وہ سو گیا۔

صبح آنکھ کھلی تو وہ قدرے پرسکون تھا، چارپائی چھوڑنے کے بعد وہ اپنے کاموں میں لگ گیا تھا مگر دن بھر اٹھتے بیٹھتے اس کے اندر جوڑ توڑ ہوتی رہی، وہ اس قدر خوف زدہ تھا کہ اس میں دوبارہ اس جگہ جا کر چلہ کاٹنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی، اسے اس بات کا بھی احساس تھا کہ جس مقصد کے لیے اس نے اس قدر محنت کی اور راتوں کو جاگا اسے ادھورا چھوڑ دینا عقل مندی نہیں تھی، ان سب سے بڑھ کر اس کے لیے یہ بات زیادہ تکلیف دہ تھی کہ جن خوشیوں کو پانے کے لیے اس نے بہت سی راتوں کی نیند قربان کی تھی، اس کام کو ادھورا کیسے چھوڑ دیا جائے۔

مال و دولت اور عیش و آرام کی زندگی پانے کا خیال اسے چین سے بیٹھنے نہیں دے رہا تھا، وہ انتہائی دہشت زدہ تھا مگر اس کے باوجود اس نے

اپنی تمام ہمتیں جمع کیں اور مقررہ جگہ پر دائرے میں بیٹھا تسبیح گھمانے لگا۔

''آج نہیں بچے گا یہ۔ آج تو اس کا کام تمام کرنا ہی پڑے گا۔'' مبارک کے کانوں میں ایک عجیب سی آواز پڑی اور وہ بری طرح کانپنے لگا۔

عجیب وغریب شکلوں والے بہت سے لوگوں کو دائرے کے اردگرد گھیرا ڈالے کھڑے دیکھ کر اس کی حالت غیر ہو رہی تھی، تسبیح اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گئی تھی، دائرے کے اردگرد کھڑی مخلوق اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہی تھی۔

اب تک مبارک صرف آوازیں ہی سنتا آیا تھا مگر آج ان لوگوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا تھا، وہ اپنی آنکھیں بند کر لینا چاہتا تھا تاکہ اسے ان کی شکلیں دکھائی نہ دیں مگر اسے ڈر تھا کہ جیسے ہی وہ آنکھیں بند کرے گا، وہ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے، پھر کچھ دیر بعد ان میں کھسر پھسر ہونے لگی، ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی کے آنے کے لیے راستہ بنا رہے تھے۔

اس کی سوچ صحیح ثابت ہوئی تھی، کسی کے آنے کے لیے راستہ بنا دیا گیا تھا، اب وہ سب ایک طرف کو ہٹ کر کھڑے ہو گئے تھے، ایسا دکھائی دے رہا تھا جیسے وہ سب اس کی بے بسی کا تماشہ دیکھنے آئے ہوں۔

چاند کی روشنی میں اس نے دور سے کچھ ہیولے اپنی طرف بڑھتے ہوئے محسوس کیے، جو تیزی سے اس کے قریب ہوتے جا رہے تھے، اب وہ دائرے کے پاس کھڑی مخلوق کو بھول کر اسی طرف دیکھ رہا تھا، پھر جیسے ہی کچھ شکلیں واضح ہونے لگیں تو یہ دیکھ کر اس کے جسم میں کپکپی طاری ہو گئی کہ کچھ شیر اور چیتے تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہے تھے، اندھیرے میں ان کی خوفناک آنکھیں چمک رہی تھیں، اب وہ اس کے بالکل قریب پہنچ گئے تھے، شیر اور چیتوں کی شکل میں اسے اپنی موت دکھائی دینے لگی تھی، اس کے جسم میں اتنی بھی طاقت نہیں رہی تھی کہ وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو پاتا، اس کے دماغ نے بھی کام کرنا چھوڑ دیا تھا، اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان حالات میں کیا کرے، اس سے پہلے کہ وہ سنبھل پاتا ان سب شیر اور چیتوں نے ایک ساتھ اس پر چھلانگ لگا دی۔

اس لمحے اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ دائرے میں بیٹھا ہے اور کرم دین نے اسے یقین دلایا تھا کہ دائرے میں بیٹھے ہوئے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا، بس اسے یہی دکھائی دے رہا تھا کہ شیر اور چیتے اس پر حملہ آور ہو رہے ہیں اور تھوڑی ہی دیر میں وہ اسے چیر پھاڑ کر کھا جائیں گے، اسے یقین تھا کہ وہ ان سے بچ نہیں پائے گا پھر بھی اس نے اپنی جان بچانے کے لیے اپنی تمام قوتیں یکجا کیں اور دوڑ لگا دی، اس وقت اس کے پاؤں میں جوتا بھی نہیں تھا مگر وہ ننگے پاؤں ہی دوڑتا چلا جا رہا تھا۔

وہ دوڑ رہا تھا کہ ٹھوکر کھا کر گر پڑا، گرنے سے اس کی ٹانگوں اور سینے پر چوٹیں آئی تھیں مگر جان بچانا زیادہ ضروری تھا، اس لیے اس نے چوٹوں کی کوئی پرواہ نہ کی اور پھر سے پوری قوت سے دوڑ لگا دی۔

وہ گرتا پڑتا گھر پہنچ گیا تھا، اس کی سانس بری طرح اکھڑی ہوئی تھی، گرنے سے جو چوٹیں آئی تھیں ان سے خون بہہ رہا تھا، پاؤں میں جوتے نہ ہونے کی وجہ سے پاؤں بھی بری طرح زخمی ہو گئے تھے، ماں نے بیٹے کے اندر آنے پر روز کی طرح دروازے کی کنڈی لگا دی تھی۔

''اماں مجھے بچا لو..... اماں وہ مجھے مار ڈالیں گے..... مجھے بچا لو'' مبارک نے ماں کے پیچھے چھپتے ہوئے کہا۔

''کیا ہو گیا مبارک۔ کون مار ڈالے گا تمہیں؟'' ماں نے بیٹے کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''اماں..... وہ..... وہ..... وہ دیکھو۔ وہ دیکھو وہ آ رہے ہیں۔ مجھے ان سے بچا لو'' مبارک یہ کہتے ہوئے بے ہوش ہو گیا۔

اس سے پہلے کہ وہ فرش پر گر پڑتا، فاطمہ نے اسے سنبھال لیا، بیٹے کی حالت دیکھ کر ماں کی تجربہ کار نگاہیں جان گئی تھیں کہ یقیناً وہ ڈر گیا ہے، اس نے مبارک کو چارپائی پر لٹا دیا اور خود پاس ہی بیٹھ گئی، صحن میں اندھیرے کی وجہ سے وہ مبارک کی حالت دیکھ نہیں پائی تھی، کمرے میں بلب کی روشنی میں اس کی نظر مبارک پر پڑی تو وہ دیکھ کر تڑپ گئی، کیونکہ بار بار ٹھوکر کھا کر گرنے سے اس کے کپڑوں پر جگہ جگہ مٹی لگی ہوئی تھی۔

فاطمہ، مبارک کو ہوش میں لانے کے لیے اس کے گال تھپتھپانے لگی مگر اسے کچھ ہوش نہیں تھا، اسے یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں ان کی آوازیں سن کر ساتھ والے کمرے میں لیٹا مبارک کا باپ بھی نہ جاگ جائے، اس لیے وہ آہستہ آہستہ مبارک کا نام لے کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔

مبارک بے ہوش پڑا تھا، پاس بیٹھی فاطمہ اپنے دوپٹے کے پلو سے اس کے جسم اور کپڑوں پر لگنے والی مٹی صاف کر رہی تھی اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، یہ سوچ کر اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے تھے کہ اس نے محض دنیاوی مال و دولت کے لالچ میں اپنے اکلوتے بیٹے کو موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا، اس وقت مبارک کی جو حالت تھی، وہ خود اس کی ذمہ دار تھی، ماں کی آنکھوں سے آنسو نکل کر بیٹے کے چہرے پر

پڑے تو اسے کچھ ہوش آ گیا، ہوش میں آتے ہی وہ اس قدر پھرتی سے اٹھ کر فاطمہ کے پیچھے ہو گیا کہ اگر اس نے ذرا سی بھی دیر کر دی تو کوئی اسے پکڑ لے گا۔

''وہ آ گئے اماں۔ وہ آ گئے..... مجھے بچا لو..... مجھے بچا لو..... اماں وہ مجھے مار ڈالیں گے۔'' مبارک نے ہوش میں آتے ہی ماں کے پیچھے چھپتے ہوئے کہا اور پھر بے ہوش ہو گیا۔

☆☆☆☆☆

کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو چھپائے بھی نہیں چھپتیں، مبارک نے اپنے چلہ کاٹنے والی بات انتہائی راز میں رکھی تھی، مگر اس کے باوجود یہ بات بہت سے کانوں میں پڑ گئی تھی، اس کی حالت دیکھ کر لوگ جان گئے تھے کہ ہو نہ ہو یہ سب اسی چلے کی وجہ سے ہی ہوا ہے۔

مبارک کی طرف سے مایوسی ہوئی تو ایک بار پھر کرم دین اس سوچ میں پڑ گیا کہ وہ جس بوجھ کو اٹھائے پھرتا ہے وہ اب کس کے سر پر ڈالے، مبارک نے جس طرح ہمت سے اتنے دن گزار لیے تھے باقی کے چند دن بھی حوصلے سے کام لیتے ہوئے چلہ مکمل کر لیتا تو کرم دین بھی سکون میں آ جاتا، مگر اس کے چلہ چھوڑ کر بھاگ آنے سے کرم دین وہیں کا وہیں آ کھڑا ہوا تھا جہاں وہ ایک ماہ قبل تھا۔

رات کافی گزر چکی تھی، کرم دین اپنی سوچوں میں گم چارپائی پر تنہا لیٹا تھا، اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی آہستہ آہستہ دروازے پر دستک دے رہا ہو، دستک کی آواز کرم دین کے کانوں میں پڑی تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ اب تو کوئی بھولے سے دن میں بھی اس کے دروازے پر دستک نہیں دیتا، اتنی رات کو اس کے ہاں کون آ سکتا تھا، اس لیے اس نے اپنا وہم سمجھ کر کوئی توجہ نہ دی مگر اگلے ہی لمحے دروازے پر پھر دستک ہونے لگی ،، آواز سے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی اپنی ایک انگلی سے دروازے پر اس قدر آہستہ دستک دے رہا ہو کہ کوئی دوسرا اس آواز کو نہ سن سکے۔

کرم دین سوچنے لگا کہ دروازے پر گھنٹی بھی لگی ہوئی ہے، آنے والا با آسانی گھنٹی بجا سکتا تھا مگر وہ گھنٹی بجانے کے بجائے دستک کیوں دے رہا تھا، رات گئے دروازے پر ہونے والی دستک نے کرم دین کو الجھا کر رکھ دیا تھا، اس نے چارپائی چھوڑی اور آنے والے کے متعلق سوچتا ہوا دروازے پر جا پہنچا، دن کا وقت ہوتا تو وہ بغیر تصدیق کیے دروازہ کھول دیتا لیکن اس وقت تسلی کیے بغیر دروازہ کھولنا مناسب نہیں تھا۔

''کون ہے؟'' کرم دین نے دروازے پر پہنچ کر دریافت کیا۔

''میں ہوں۔ کرم دین دروازہ کھولو'' کرم دین کے پوچھنے پر آنے والے شخص نے آہستہ سے جواب دیا۔

''مگر تم ہو کون؟ اپنا نام تو بتاؤ.....'' کرم دین نے اپنی تسلی کے لیے پوچھا۔

''میں صابر ہوں..... دروازہ تو کھولو.....''

صابر کا نام سن کر کرم دین نے دروازہ کھولا تو وہاں چادر لپیٹے صابر کھڑا تھا۔

''تم؟ اس وقت یہاں خیر تو ہے؟'' صابر کو دروازے پر کھڑا دیکھ کر کرم دین نے حیران ہو کر سوال کیا۔

''ہاں ہاں سب خیر ہے تم مجھے اندر تو آنے دو۔ یہاں کھڑے کھڑے تو کوئی بات نہیں ہو سکتی''

''کیوں نہیں..... کیوں نہیں..... آ جاؤ اندر آ جاؤ۔'' کرم دین نے صابر کے لیے راستہ چھوڑتے ہوئے کہا۔

اجازت ملتے ہی صابر اندر آ گیا تھا، کرم دین نے احتیاط سے کنڈی لگا دی اور اسے ساتھ لیے اسی کمرے میں آ گیا جہاں وہ کچھ دیر قبل لیٹا ہوا تھا، آمنے سامنے دو چارپائیاں بچھی تھیں، ایک چارپائی پر کرم دین بیٹھ گیا اور دوسری پر صابر، رات گئے صابر کے اچانک آنے پر کرم دین کے ذہن میں بہت سے سوال اٹھ رہے تھے، ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ بات کا آغاز کہاں سے کرے کہ صابر کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

''تم یقیناً پریشان ہو رہے ہو گے کہ اس وقت آدھی رات کو میں یہاں کس لیے آیا ہوں''

''پریشانی کی بات تو ہے، کیونکہ اگر تمہیں مجھ سے کوئی کام تھا تو تم دن کے وقت بھی آ سکتے تھے''

''میں کئی دنوں سے تمہیں ملنا چاہ رہا تھا، لیکن کوئی موقع ہی نہیں مل رہا تھا، دراصل دن کے وقت میں تم سے ملنا ہی نہیں چاہتا تھا ورنہ کب کا مل لیتا۔''

''اچھا خیر..... اب بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟''

''میں بات کو گھما پھرا کر نہیں کرنا چاہتا''

''ہاں ہاں کہو..... تم جو کہنا چاہتے ہو''

''میں وہ علم سیکھنا چاہتا ہوں جو تم مبارک کو سکھا رہے تھے''

''یہ تم سے کس نے کہا؟'' کرم دین نے صابر کی بات سن کر حیرانی سے دریافت کیا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مبارک کے چلہ کاٹنے والی بات ان دونوں کے علاوہ کسی تیسرے شخص کو معلوم نہ تھی پھر صابر کو کیسے پتہ چل گیا تھا۔

''مبارک میرا جگری دوست ہے، اس کی کوئی بھی بات مجھ سے چھپی ہوئی نہیں، پھر بھلا یہ بات وہ مجھ سے کیسے چھپا سکتا تھا۔''

''اگر تم جانتے ہو تو یقیناً یہ بھی جانتے ہو گے کہ یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو۔''

''میں جانتا ہوں لیکن وہ بزدل تھا اسی لیے چلہ درمیان میں چھوڑا اور ڈر کر بھاگ کھڑا ہوا اور اب اسی خوف کو سر پر سوار کیے اپنے گھر میں بیٹھا بھی ڈرتا رہتا ہے۔''

کرم دین کو جس شخص کی تلاش تھی، وہ خود چل کر اس کے پاس آ پہنچا تھا، اس کی باتیں سن کر کرم دین کو پھر سے حوصلہ مل رہا تھا لیکن اس بار وہ مبارک جیسے کسی ڈرپوک شخص کا انتخاب نہیں کرنا چاہتا تھا، صابر کی باتوں سے اسے کچھ تسلی ہو رہی تھی مگر اتنا کافی نہ تھا، اسے اپنی تسلی کے لیے صابر کو کسی امتحان سے گزارنا تھا، اگر وہ اس امتحان میں پورا اترتا تو پھر اسے اس کے چلہ کاٹنے پر کوئی اعتراض نہ ہوتا۔

''تم کس سوچ میں پڑ گئے ہو؟'' کرم دین کو خاموش پا کر صابر نے دریافت کیا۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔''

''کچھ تو ہے۔''

''دراصل۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہاری بہادری کا چھوٹا سا امتحان لے لیا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا، کہیں یہ نہ ہو تم بھی مبارک کی طرح بھاگ کھڑے ہو''

''میں ہر امتحان کے لیے تیار ہوں لیکن اگر میں کامیاب ہو جاتا ہوں تو پھر تو تم مجھے وہ علم سکھا دو گے ناں؟''

''ہاں۔ پھر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

''تو پھر بتاؤ وہ کون سا امتحان ہے؟''

''پرانے قبرستان کے آخری کونے میں جو نیم کا درخت ہے، تمہیں آدھی رات کو اس کے نیچے لکڑی کا کیل ٹھونک کر آنا ہوگا۔''

''بس اتنی سی بات ہے؟'' صابر نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔

''یہ اتنا بھی معمولی کام نہیں وہاں کسی جن بھوت یا چڑیل سے بھی تمہاری ملاقات ہو سکتی ہے۔''

''انہیں بھی دیکھ لیں گے۔ وہ کھا نہیں جائیں گے بس تم یہ بتاؤ یہ کام کب کرنا ہے؟''

''یہ کام چاند کی چودھویں تاریخ کو ہوگا ابھی تمہارے پاس تین دن باقی ہیں، تب تک اچھی طرح سوچ لو اگر پھر بھی تم اس امتحان کے لیے تیار رہو تو کیل لے کر میرے پاس آ جانا۔''

''تو پھر ٹھیک ہے، اب چاند کی چودھویں تاریخ کو ہی ملاقات ہوگی۔'' صابر نے اٹھتے ہوئے بات کی۔

اسے اٹھتے ہوئے دیکھ کر کرم دین بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا، باہر نکلنے سے پہلے صابر نے گلی میں ادھر ادھر نظر دوڑائی، وہاں کوئی موجود نہیں تھا، پھر اس نے چادر اچھی طرح لپیٹی اور وہاں سے نکل گیا۔

صابر کو رخصت کرنے کے بعد کرم دین واپس اپنی چارپائی پر آ لیٹا تھا، اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کوئی شخص خود بخود اس کام کے لیے چلا آئے گا، گو کہ صابر کو ابھی ایک امتحان سے گزرنا تھا اور آئندہ کا لائحہ عمل اسی امتحان کے بعد ہی طے ہونا تھا، مگر کرم دین اس بات سے ہی مطمئن تھا کہ کوئی اور اس کا بوجھ اٹھانے کے لیے تیار تھا۔

☆☆☆☆☆

کرم دین کے اگلے تین دن ایک ایک پل گن گن کر گزرے تھے، اس دوران صابر اس کے پاس آیا تھا اور نہ کہیں کرم دین سے اس کی ملاقات ہوئی تھی، کرم دین جانتا تھا کہ اس نے صابر کو آدھی رات کا وقت دیا تھا مگر پھر بھی وہ شام کو ہی کھانے سے فارغ ہو کر اس کے انتظار میں بیٹھ گیا تھا، اسے یقین تھا کہ وہ ضرور آئے گا مگر اس کے باوجود جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا تھا اس کے دل میں خدشات پیدا ہوتے جا رہے تھے۔

بار بار کرم دین کی نظر دیوار پر لگی گھڑی کی طرف اٹھ جاتی تھی، وقت اپنی مقررہ رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا مگر کرم دین کو تسلی نہیں ہو رہی تھی، اس

کا خیال تھا کہ گھڑی میں ضرور کوئی خرابی پیدا ہوگئی ہے اسی لیے تو اس کی سوئیاں آہستہ چل رہی تھیں، وہ کبھی بیٹھ جاتا، کبھی لیٹ جاتا اور کبھی بے چین ہوکر صحن میں ٹہلنے لگتا تھا، دوبار وہ دروازہ کھول کر باہر گلی میں بھی جھانک آیا تھا اور دونوں بار اسے مایوسی ہوئی تھی۔

صابر وعدے کا پکا نکلا، ادھر گھڑی نے بارہ بجائے ادھر اس نے دروازے پر آدستک دی، دستک پر کرم دین یوں دوڑ کر دروازے پر پہنچ گیا کہ اگر اس نے کنڈی کھولنے میں ذرا سی بھی دیر کردی تو وہ واپس لوٹ جائے گا۔

''بہت دیر لگادی تم نے؟'' دروازہ کھولتے ہی کرم دین نے سوال کیا۔

''تم نے خود ہی آدھی رات کو آنے کو کہا تھا'' صابر نے آہستہ سے جواب دیا۔

''اچھا کیل لائے ہو؟''

''لایا ہوں جناب! لایا ہوں یہ دیکھو میرے پاس ہے'' صابر نے اپنے جسم پر لپٹی ہوئی چادر کو ہٹا کر ہاتھ میں پکڑا ہوا کیل دکھاتے ہوئے کہا۔

''اور ہتھوڑی کہاں ہے؟''

''تم نے ہتھوڑی کا تو نہیں کہا تھا''

''خیر۔ ہتھوڑی کے بغیر بھی کام چلالیں گے وہاں سے کوئی نہ کوئی اینٹ، روڑہ مل ہی جائے گا''

''اب کرنا کیا ہے؟'' صابر نے سوال کیا۔

''کرنا یہ ہے میں خود تمہارے ساتھ قبرستان چلوں گا۔ تم بلاخوف وخطر مقررہ جگہ پر کیل ٹھونک کر واپس آگئے تو میں اپنے وعدے کے مطابق تمہیں وہ علم سکھادوں گا اور اگر تم ڈر کر نا کام لوٹ آئے یا تمہارے چہرے پر خوف کی کوئی پرچھائی بھی دکھائی دی تو پھر تم خود سمجھ دار ہو۔''

''تو پھر چلیں؟''

''تم یہیں ٹھہرو میں اندر سے دروازے پر لگانے کے لیے تالا لے آؤں پھر چلتے ہیں'' کرم دین نے بات کی اور تالا لینے اندر چلا گیا۔

وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں تالا تھا اور اس نے چادر لپیٹ رکھی تھی، کرم دین نے تالا لگا کر چابی احتیاط سے جیب میں ڈال لی، پھر وہ دونوں قبرستان کی طرف چل پڑے، قبرستان وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا، ہر طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا، کسی کسی گھر کے باہر بلب جل رہا تھا مگر چاند اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ روشن تھا اس لیے انہیں چلنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہو رہی تھی، وہ تھوڑی ہی دیر میں قبرستان پہنچ گئے تھے، راستے میں سے ہی کیل ٹھونکنے کے لیے صابر نے ایک اینٹ بھی اٹھا کر اپنے ہاتھوں میں لے لی تھی۔

''لو بھئی۔ میرا اور تمہارا ساتھ یہیں تک تھا۔ اب تم قبرستان کے اندر جاؤ اور وہاں کونے میں درخت کے نیچے یہ کیل ٹھونک کر آؤ۔ میں یہیں کھڑا تمہارا انتظار کر رہا ہوں'' کرم دین نے قبرستان کے باہر رُکتے ہوئے صابر سے کہا۔

صابر نے کرم دین کی بات تسلی سے سنی اور پھر کوئی بات کیے بغیر قبرستان میں چلا گیا، قبرستان کافی پرانا اور بڑا تھا، اس میں کسی اور قبر کی گنجائش نہیں رہی تھی، اس لیے اب لوگ مردے کسی دوسرے قبرستان میں دفنانے لگے تھے، صابر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے تسلی سے مقررہ جگہ کی طرف بڑھ رہا تھا، کرم دین چاند کی چاندنی میں اسے جاتا ہوا با آسانی دیکھ رہا تھا، کچھ دور تک وہ اسے صاف دکھائی دیتا رہا پھر جیسے جیسے وہ آگے بڑھتا گیا اسے دیکھنا مشکل ہوتا گیا، پھر جب وہ کافی دور چلا گیا تو وہ اسے بالکل ہی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

صابر دل کو مضبوط کر کے مقررہ جگہ پر پہنچ گیا تھا، قبرستان کی خاموشی اسے ڈرانے کے لیے کافی تھی مگر کرم دین کے مطابق صابر کو عین درخت کے نیچے کیل ٹھونکنا تھا، اب تک چاند کی روشنی اسے راستہ دکھانے کے لیے کافی تھی مگر درخت کے نیچے مکمل اندھیرا تھا، درخت اس قدر گھنا تھا کہ چاند کی روشنی اس کے نیچے نہیں پہنچ پا رہی تھی۔

وہ درخت کے نیچے گھپ اندھیرے میں کھڑا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا، مگر اندھیرے کے سوا اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا، کچھ دیر تک اندھیرے میں کھڑا رہنے سے اسے کسی سائے کی طرح کچھ کچھ دکھائی دینے لگا تھا مگر ابھی بھی واضح طور پر کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا، پھر بھی وہ درخت کے نیچے ایک مناسب جگہ دیکھ کر کیل ٹھونکنے لگا۔

اس نے کیل ٹھونکنے کے لیے اینٹ سے پہلی ہی ضرب لگائی تو درخت پر بیٹھے ہوئے پرندوں نے ڈر کر شور مچادیا، اچانک پرندوں کے شور اور ان کے پروں کے پھڑ پھڑانے کی آواز سے صابر دہل گیا اور اس کا دل تیزی سے دھک دھک کرنے لگا، پرندوں نے ہلکا سا احتجاج کیا تھا پھر خاموشی سے اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے تھے، صابر بھی تھوڑی دیر کے لیے خاموشی سے اپنی جگہ پر بیٹھا رہا، اسے یہ کام ختم کر کے واپس بھی جانا تھا،

جہاں کرم دین اس کا انتظار کر رہا تھا۔

صابر نے اپنی تمام قوتوں کو یکجا کیا اور ہمت کر کے پھر سے کیل ٹھونکنے لگا، پرندے پھڑ پھڑاتے رہے مگر اس نے کوئی پرواہ نہ کی اور اپنا کام مکمل کر کے اینٹ وہیں پھینک دی اور واپسی کے لیے اٹھ کھڑا ہوا، اسے جلد از جلد اس شہر خاموشاں سے نکل جانا تھا، اسے اندھیرے کی وجہ سے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس کی چادر زمین پر لگ رہی تھی اور اس نے اسی میں کیل ٹھونک دیا تھا، وہ اٹھا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اسے دبوچ کر پیچھے کھینچ لیا ہو، وہ ڈرا سہما ہوا تو پہلے ہی تھا، خوف اور دہشت نے اسے اس قدر جکڑا کہ وہ وہیں گر گیا اور اس کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ بھی نہ نکل سکی۔

☆☆☆☆☆

کرم دین کا خیال تھا کہ صابر کام ختم کرتے ہی تھوڑی ہی دیر میں لوٹ آئے گا لیکن وہ انتظار کرتا رہا مگر وہ نہ آیا، جب وہ انتظار کرتے ہوئے تھک گیا تو اس نے واپسی کا ارادہ کر لیا اور گھر کی جانب چل پڑا، راستے میں بھی وہ یہ سوچ کر بار بار پلٹ کر دیکھتا رہا کہ شائد اب وہ اس کے پیچھے آ رہا ہو، وہ اسی کیفیت میں گھر پہنچ گیا تھا مگر صابر نہیں آیا تھا۔

صابر کے نہ آنے سے کرم دین کے دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگی تھیں، وہ قبرستان سے واپس آ کر اپنی چارپائی پر لیٹ گیا تھا مگر اس کا ذہن مسلسل صابر میں ہی الجھا ہوا تھا، سوچتے ہوئے وہ خود کو بھی کوس رہا تھا کہ اگر وہ نہیں آیا تھا تو اسے خود قبرستان میں جا کر حالات کا جائزہ لینا چاہئے تھا، یا کم از کم اسے کچھ دیر اور انتظار کرنا چاہئے تھا، ہو سکتا ہے اسے اپنا کام مکمل کرنے میں کچھ وقت لگ گیا ہو، اور جب وہ واپس آیا ہو گا تو اسے وہاں کھڑے نہ پا کر اسے کتنا برا لگا ہو گا۔

وہ چارپائی پر لیٹا دیر تک خود کو ہی برا بھلا کہتا رہا تھا، اس لیے جب اس کی آنکھ کھلی تو دھوپ نکل آئی تھی، سورج کی کرنیں کھڑکیوں اور دروازے کے راستے کمرے میں داخل ہو کر اس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں، آنکھ کھلتے ہی وہ پھر سے صابر کے متعلق سوچنے لگا تھا، وہ جلد از جلد صابر کے بارے میں جاننا چاہتا تھا، اس لیے منہ ہاتھ دھویا اور دروازے پر تالا لگا کر باہر نکل گیا۔

کرم دین اکثر حلوہ پوری کا ناشتہ کیا کرتا تھا، اس روز وہ خاص طور پہلوان چنے والے کے پاس گیا تھا، کیونکہ اسے معلوم تھا کہ صابر بھی اکثر ناشتے کے لیے وہیں آیا کرتا تھا، اس نے نان چنے لیے اور ایک بنچ پر بیٹھ کر بے دلی سے کھانے لگا، اس کی نگاہیں مسلسل صابر کو ڈھونڈ رہی تھیں، اس کی نظر ہر آنے جانے والے پر تھی مگر صابر کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا، وہ جس مقصد کے لیے وہاں آیا تھا وہ پورا نہیں ہوا تھا، اس لیے وہ ناشتے سے فارغ ہوتے ہی وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے گھر کی راہ لی۔

واپسی پر صابر کے گھر کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس کے متعلق معلوم کرے، لیکن ایسا کرنا کسی خطرے سے خالی نہ تھا، اس لیے وہ اس کے گھر کے سامنے رکے بغیر آگے بڑھ گیا، گلی کے کونے پر محلے کے کچھ افراد کھڑے آپس میں باتیں کر رہے تھے، وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گھر کی جانب جا رہا تھا، ان کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے جان بوجھ کر آہستہ آہستہ قدم اٹھانا شروع کر دیے تا کہ وہ وہاں رکے بغیر با آسانی ان کی باتیں سن سکے، یہاں بھی کرم دین کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تھا، کیونکہ ان کی گفتگو کا محور ملکی سیاست تھی اور ان کی باتوں میں صابر کا کہیں کوئی ذکر نہیں تھا۔

وہ گھر لوٹ آیا تھا مگر صابر کے متعلق اسے کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا، صابر کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ الجھ کر رہ گیا تھا، وہ یہ سوچ کر پھر سے خود کو کوسنے لگا کہ کل رات اگر اس نے تھوڑا سا بھی دماغ سے کام لیا ہوتا تو جس الجھن کا شکار وہ اب ہے، اس سے بچ جاتا۔

رات سے صبح، پھر صبح سے دوپہر ہو گئی تھی مگر کرم دین صابر کے علاوہ کسی دوسری بات کے متعلق ذرا سا بھی نہیں سوچ پایا تھا، اسی پل مسجد سے ہونے والے اعلان نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا، ابھی اس نے اتنا ہی سنا تھا ''حضرات ایک ضروری اعلان سنیے'' کہ وہ اس قدر تیزی سے ایک جھٹکے کے ساتھ چارپائی سے اٹھ بیٹھا جیسے اس کے اندر کرنٹ دوڑ گیا ہو، وہ فوراً کمرے سے نکل کر صحن میں آ کھڑا ہوا اور اپنے کان مسجد سے کیے جانے والے اعلان پر یوں لگا دیے جیسے وہ اعلان صرف اور صرف اسی کو سنانے کے لیے کیا جا رہا تھا۔

مسجد سے اعلان ہو رہا تھا جس میں کہا جا رہا تھا ''ایک لڑکا جس کی عمر بیس سال ہے، اس کا نام صابر ہے، وہ رات سے گھر واپس نہیں آیا، جس کی وجہ سے اس کے والدین بہت پریشان ہیں، اگر اس کے بارے میں کسی کو خبر ہو تو وہ ان کے گھر اطلاع کر دے اور اگر صابر خود یہ اعلان سن رہا ہو تو فوراً گھر پہنچ جائے''۔

یہ اعلان کرم دین پر بجلی کی طرح گرا تھا اور اسے یہ سمجھنے میں ذرا سی بھی دیر نہیں لگی تھی کہ یقیناً رات کو قبرستان میں اس کے ساتھ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آ گیا ہوگا، سبھی تو وہ رات سے اب تک گھر نہیں پہنچا تھا، پھر دل کو تسلی دینے کے لیے وہ خود ہی اپنے خیال کی نفی کرنے لگا اور سوچنے لگا کہ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ رات کو قبرستان سے واپسی پر وہ کسی دوست کے ہاں چلا گیا ہو اور پھر رات کو اسی کے پاس ٹھہر گیا ہو، رات بھر دوست یار مل کر جاگتے رہے ہوں، اس لیے آنکھ نہ کھلی ہو اور وہ ابھی تک سو رہے ہوں۔

پھر تھوڑے تھوڑے وقفے سے آس پاس کی دیگر مساجد سے بھی صابر کی گمشدگی کے متعلق اعلانات ہوتے رہے، ان اعلانات نے کرم دین کو خوف زدہ کر دیا تھا، اسی ڈر نے اسے گھر میں قید رہنے پر اس قدر مجبور کر دیا تھا کہ اس نے دوپہر کا کھانا کھایا نہ رات کا کھانا کھانے کے لیے ہی گھر سے نکلا، اسے ڈر تھا کہ کہیں کوئی اس کے اندر کے خوف کو اس کے چہرے سے نہ پڑھ لے۔

وہ کچھ کھائے پیئے بغیر ہی لیٹ گیا تھا، صابر کی سوچوں نے اسے اس قدر جکڑ رکھا تھا کہ اسے کسی کروٹ چین نہیں آ رہا تھا، ابھی تک وہ چلہ کاٹتے ہوئے مبارک کے ذہنی توازن کھو دینے کو دماغ سے پوری طرح جھٹک نہیں پایا تھا کہ اب صابر کی گمشدگی نے اس کی نیند اور بھوک اڑا کر رکھ دی تھی۔

رات بھر وہ ایک پل کے لیے بھی سو نہیں پایا تھا، صبح ہو گئی تھی مگر پھر بھی وہ چارپائی پر لیٹا کروٹیں بدل رہا تھا، اس طرح چارپائی پر پڑے کب تک گزارہ ہوسکتا تھا، یوں بھی صبح سے صابر کی گمشدگی کے اعلانات پھر سے کیے جانے لگے تھے، اسے گھر سے باہر نکل کر حالات کا جائزہ لینا تھا، یہ سوچ کر وہ گھر سے نکل پڑا اور بلا ارادہ ایک طرف کو چلنے لگا، گزرتے ہوئے راستے میں اسے جہاں کہیں دو چار افراد کھڑے دکھائی دیتے، وہیں صابر کے بارے میں ہی باتیں سنائی دیتیں۔

☆☆☆☆☆

دوپہر کا وقت تھا، کچھ لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے، بیٹس مین نے اونچی شارٹ لگائی تھی، کیچ پکڑتے ہوئے ایک لڑکے کی نظر آسمان کی طرف اٹھی تو اسے ایک کٹی ہوئی پتنگ دکھائی دی، اس نے گیند وہیں چھوڑا اور اس طرف دوڑ لگا دی جہاں پتنگ تیزی سے زمین کی طرف آ رہی تھی، جب دوسرے لڑکوں کی نظر بھی پتنگ پر پڑی تو وہ بھی کھیل چھوڑ کر پتنگ کے پیچھے دوڑ پڑے، اب سب لڑکوں کی نظریں پتنگ پر جمی ہوئی تھیں، دونوں ہاتھ اوپر اٹھے ہوئے تھے اور جس طرف کو پتنگ جا رہی تھی اسی طرف دوڑے چلے جا رہے تھے۔

کٹی ہوئی پتنگ قبرستان کے اوپر پہنچ گئی تھی، کچھ لڑکے قبروں کو پھلانگتے ہوئے اور کچھ قبروں کو روندتے ہوئے کسی بھی چیز کی پرواہ کیے بغیر پتنگ پکڑنے کے لیے ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش میں تھے، اچانک پتنگ نے ایک جھول کھائی اور قبرستان کے کونے والے درخت میں اٹک گئی، جو لڑکا سب سے آگے تھا اس نے چھلانگ لگا کر پتنگ کے ساتھ آنے والی ڈور کا سرا اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔

آگے پیچھے تمام لڑکے پتنگ کے پیچھے بھاگتے ہوئے درخت کے نیچے آ کھڑے ہوئے تھے اور درخت سے پتنگ اتارنے کے لیے اپنے اپنے مشورے دے رہے تھے، اتنے میں انہی میں سے ایک لڑکے نے پتھر اٹھایا اور پتنگ پر دے مارا، جس کی وجہ سے پتنگ پھٹ گئی اور سارا کھیل ہی ختم ہو گیا۔

''یہاں کتنی بدبو آ رہی ہے؟'' پتنگ سے توجہ ہٹنے کے بعد ایک لڑکے نے بدبو کا احساس ہونے پر کہا۔

ابھی تک وہاں کھڑے کسی بھی لڑکے کو کوئی بدبو محسوس نہیں ہوئی تھی، کیونکہ ان سب کا دل و دماغ پتنگ پکڑنے پر مرکوز تھا، جب ایک لڑکے نے بدبو کا احساس دلایا تو سب نے بدبو سے بچنے کے لیے اپنے اپنے ناک پر ہاتھ رکھ لیے۔

''مگر یہ بدبو ہے کس چیز کی؟'' ایک اور لڑکے نے سوال کیا۔

اس بچے کی بات سن کر یہ اندازہ لگانے کے لیے کہ وہ بدبو کہاں سے آ رہی تھی، سب لڑکے ادھر ادھر جائزہ لینے لگے۔

''وہ دیکھو! کسی کی لاش پڑی ہے، لگتا ہے یہ بدبو بھی وہیں سے آ رہی ہے۔'' ایک لڑکے نے ایک طرف اپنی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے توجہ دلائی۔

''مجھے تو یہاں سے خوف آنے لگا ہے۔ میں تو جا رہا ہوں۔'' ایک لڑکے نے فیصلہ سنایا۔

''ہاں یار! ہم بھی چلتے ہیں، قبرستان میں لاش دیکھ کر مجھے تو عجیب سی وحشت ہونے لگی ہے۔

''چلو..... چلو چلتے ہیں'' ایک اور لڑکے نے بات کی اور پھر وہ سب جس طرح ایک دوسرے کے آگے پیچھے وہاں آئے تھے اسی طرح واپس

چل پڑے۔

بہت سے لڑکوں نے ایک ساتھ لاش دیکھی تھی، اس لیے یہ بات زیادہ دیر تک چھپی نہ رہ سکی اور تھوڑی ہی دیر میں لاش کے متعلق سرگوشیاں ہونے لگیں، کچھ ہی دیر بعد یہ خبر صابر کے گھر والوں تک بھی پہنچ گئی تھی، ابھی تک کسی کو یہ علم نہیں تھا کہ قبرستان میں پڑی ہوئی لاش کس کی تھی، لاش کے متعلق سنتے ہی صابر کی ماں نے رونا شروع کر دیا تھا اور دونوں ہاتھوں سے اپنی چھاتی پیٹتے ہوئے بین کرنے لگی تھی۔

صابر کے باپ اور بھائی نے محلے کے چند معززین کو ساتھ لیا اور لاش کی شناخت کرنے قبرستان پہنچ گئے، لڑکوں کی نشاندہی پر جب وہ لوگ اس کونے میں پہنچے جہاں لاش پڑی تھی تو وہاں تعفن پھیلا ہوا تھا، جس کی وجہ سے وہاں کھڑا ہونا محال تھا، کئی روز تک لاش اسی طرح پڑی رہنے سے اس میں ہوا بھر جانے سے پھول گئی تھی اور چہرہ بری طرح مسخ ہو چکا تھا، کپڑوں کی وجہ سے لاش کو پہچاننے میں کوئی زیادہ دشواری نہیں ہوئی تھی، وہ صابر کی ہی لاش تھی، جسے اٹھا کر چارپائی پر ڈالنے لگے تو چادر کیل میں ٹھنکی ہونے کی وجہ سے کھنچ گئی، جسے پھاڑ کر نکالا گیا۔

کچھ محلے داروں نے پولیس کو اطلاع دینے کا مشورہ دیا تھا مگر صابر کے اہلِ خانہ لاش کا پوسٹ مارٹم کرنے اور چیر پھاڑ کے ڈر سے ایسا نہیں چاہتے تھے، مرنے والا تو مر چکا تھا، ان کی کسی سے کوئی دشمنی بھی نہیں تھی، پولیس کو اطلاع دینے سے بھی کچھ حاصل ہونے والا نہیں تھا، اس کے باوجود قانونی کاروائی پوری کرنا بھی ضروری تھا، اس لیے صابر کے قتل کی رپورٹ پولیس کو کر دی گئی، پولیس لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے لے جانا چاہتی تھی، جبکہ صابر کے والدین اور اہل خانہ ایسا نہیں چاہتے تھے اس لیے کچھ دے دلا کر پولیس کو ایسا نہ کرنے دیا گیا اور لاش کو غسل دے کر خاموشی سے دفنا دیا گیا۔

کسی اور کا جنازہ ہوتا تو شائد کرم دین شرکت نہ کرتا، لیکن صابر کے جنازے میں شرکت کے لیے وہ خصوصی طور پر پہنچا تھا تا کہ جان سکے کہ صابر کی موت میں کسی بھی حوالے سے کہیں اس کا نام تو نہیں لیا جا رہا، صابر کے والدین اس بات سے پریشان تھے کہ وہ قبرستان کے اس کونے میں کیا لینے گیا تھا اور اگر وہ خود نہیں پہنچا تھا تو اسے وہاں کون لے گیا تھا۔

☆☆☆☆☆

کرم دین چارپائی پر لیٹا گزرے ہوئے وقت کو کھلی آنکھوں سے کسی خواب کی طرح دیکھ رہا تھا، اس وقت اس کی زندگی کسی کتاب کی طرح اس کے سامنے تھی، جس کا کبھی کوئی باب کھل جاتا اور کبھی کوئی دوسرا باب کھل کر اس کے سامنے آ جاتا، کچھ باب ایسے بھی کھل کر اس کے سامنے آ جاتے تھے جنہیں وہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا، مگر وہ چاہتا بھی تو انہیں اس کتاب سے پھاڑ کر پھینک نہیں سکتا تھا، کیونکہ ان صفحات کے بغیر اس کی زندگی کی کتاب ادھوری اور نامکمل تھی۔

انہی صفحات میں کچھ ایسے بھی تھے جنہیں پڑھ کر اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی تھی، گو کہ وہ صفحات اس کی آنکھوں میں آنسو لانے کا سبب بن رہے تھے، مگر پھر بھی وہ انہیں پلٹنا نہیں چاہتا تھا مگر ایسا اس کے بس میں نہیں تھا، کیونکہ صفحات تو خود بخود پلٹتے جا رہے تھے، وہ ایک ایسے سحر میں گرفتار تھا جس سے نکلنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا، کبھی ماں کی سسکیاں، کبھی بیوی کی سرگوشیاں اور کبھی ان کی نصیحتیں اس کے کانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔

دروازے پر دستک ہوئی تھی، جس کی آواز کرم دین کے کانوں میں بھی پڑی تھی، مگر وہ اسے بھی کانوں میں پڑنے والی دوسری آوازوں کا حصہ سمجھا تھا، کچھ دیر تک دروازہ کھلنے کا انتظار کیا گیا تھا مگر جب کسی نے دروازہ نہ کھولا تو پھر سے دستک دی گئی، اس بار ہونے والی دستک کرم دین نے سن لی تھی مگر وہ اسے اپنا وہم سمجھا تھا، کیونکہ ایک مدت سے کسی نے بھی اس کے دروازے پر دستک نہیں دی تھی، وہ اس بات سے پوری طرح آگاہ تھا کہ آس پاس کے سبھی لوگوں نے اس سے میل جول ختم کر رکھا تھا اور اسی بائیکاٹ کی وجہ سے ہی کبھی کوئی بھولے سے بھی اس سے ملنے نہیں آتا تھا مگر دروازے پر ہونے والی مسلسل دستک سے اسے یقین کرنا پڑا کہ واقعی وہ دستک اسی کے دروازے پر ہو رہی تھی۔

زندگی کی جو کتاب وہ کھولے بیٹھا تھا وہ خود ہی بند ہو گئی تھی، وہ چارپائی سے اٹھا اور بے یقینی کے عالم میں دروازے کی طرف بڑھنے لگا، اسے دروازہ کھولنے میں کافی دیر ہو گئی تھی، اس لیے دروازے پر دستک دینے والا اب دروازے کو پیٹنے لگا تھا، اور دستک نے باقاعدہ شور کی شکل اختیار کر لی تھی، اس سے پہلے کہ کوئی دروازہ ہی توڑ ڈالتا اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

''جی فرمایئے۔'' سادہ سی شلوار قمیض پہنے دروازے پر کھڑے درمیانی عمر کے اجنبی شخص کو دیکھ کر کرم دین نے سوال کیا۔

وہ شخص جو دروازے کے اس پار کھڑا تھا اس کے چہرے کے تاثرات سے بھی پتہ چل رہا تھا کہ وہ بھی کرم دین کو نہیں پہچانتا تھا، اسے خاموش پا کر کرم دین کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا تھا کہ اس شخص کو کہیں اور جانا تھا مگر وہ غلطی سے اس کے دروازے پر آ کھڑا ہوا تھا۔

''تم کرم دین ہو؟''

''ہاں۔''

''وہ لوگ تم سے ملنا چاہتے ہیں'' اس اجنبی شخص نے اپنے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اس شخص کے اشارہ کرنے پر کرم دین نے نظر اٹھا کر دیکھا تو اس کے گھر کے سامنے ہی تین گاڑیاں کھڑی تھیں، جن میں سے جو اشخاص نکل کر اس کی طرف بڑھ رہے تھے، اس نے پہلی ہی نظر میں انہیں پہچان لیا تھا، گو کہ وہ بہت سالوں بعد وہاں آئے تھے مگر وہ انہیں کیسے بھول سکتا تھا، اس نے زندگی کے بہت سے سال ان کے ساتھ مل کر گزارے تھے، ایک عرصہ تک ہر دھوپ چھاؤں میں وہ اکٹھے رہے تھے اور زندگی کے بہت سے دکھ سکھ ایک ساتھ دیکھے تھے۔

''کیسے ہو کرم دین؟'' ان تینوں نے ہی باری باری رسمی طور پر ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ہاتھ ملاتے وقت ان میں سے کسی نے بھی کسی گرم جوشی کا اظہار نہیں کیا تھا۔

''جب بھی کوئی بڑا آدمی اپنے سے کسی چھوٹے آدمی سے ملتا ہے تو اس کے رویے میں ایسی ہی سرد مہری ہوا کرتی ہے، مگر وہ تو اس کے بھائی تھے، جنہوں نے ایک ہی ماں کے پیٹ سے جنم لیا تھا، پھر وہ کیوں غیروں کی طرح مل رہے تھے، کیا دولت بھائیوں کو بھائیوں سے اس قدر دور کر دیتی ہے کہ وہ سالوں بعد بھی ملیں تو یوں لگے جیسے ان میں کوئی تعلق، کوئی رشتہ ہی نہ ہو'' کرم دین سوچنے لگا۔

ابھی وہ اور بھی نہ جانے کیا کچھ سوچتا مگر اس کا تسلسل اس وقت ٹوٹ گیا جب اس کے تینوں بھائی اس سے ٹکراتے ہوئے اندر داخل ہو گئے، دروازے پر دستک دینے والا اجنبی شخص بھی ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا تھا، کرم دین کے تینوں بھائی گھر کو کچھ اس انداز سے دیکھ رہے تھے جیسے کوئی بیوپاری کسی چیز کا سودا کرنے سے پہلے اس کا اچھی طرح جائزہ لے رہا ہو۔

کرم دین بھی ان کے ساتھ ساتھ صحن میں آ کھڑا ہوا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اگر وہ اسے ملنے آئے تھے تو وہ اس سے بات کیوں نہیں کر رہے تھے، وہ گھر ان کا دیکھا بھالا تھا، اسی گھر میں انہوں نے اپنا بچپن اور جوانی گزاری تھی، پھر اسی گھر کو وہ عجیب عجیب زاویوں سے کیوں دیکھ رہے تھے، پھر اس کے بڑے بھائی راحت کے ایک ہی جملے نے اسے بہت کچھ سمجھا دیا۔

راحت کہہ رہا تھا ''تم بہت سال رہ لیے یہاں اب اس گھر کو تقسیم ہو جانا چاہئے۔''

بھائی کی بات سن کر وہ کہہ دینا چاہتا تھا ''اچھا تو تم اس گندی بستی میں بھائی سے ملنے نہیں اس گھر کا بٹوارہ کرنے آئے ہو'' وہ سوچتا رہا مگر کچھ کہہ نہ سکا۔

''ہمیں بھی پیسوں کی ضرورت ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ چاروں مل کر اپنا اپنا حصہ بانٹ لیں'' ریاض نے بھی اپنا مدعا بیان کیا۔

کرم دین اب تک خاموشی سے گردن جھکائے کھڑا تھا، اسے زندگی میں کبھی اتنا حوصلہ نہیں ہوا تھا کہ وہ کسی بھی معاملے میں بڑے بھائیوں کے سامنے زبان کھولے، مگر جائیداد بانٹنے کی بات جیسے کسی تیر کی طرح اس کے دل پر لگی اور اسے زخمی زخمی کر گئی، وہ انہی زخموں کے درد کی شدت سے چیخ اٹھا ''آج تم تینوں ہی جائیداد تو بانٹنے آ گئے ہو۔ کاش کبھی میرے ساتھ دکھ بانٹنے بھی آ گئے ہوتے۔ میں تم سب کے حصے کے دکھ اکیلا ہی سہتا چلا آیا ہوں، ان دکھوں، مصیبتوں اور تکلیفوں میں تم تینوں کا بھی اتنا ہی حصہ تھا جتنا میرا۔ پھر وہ بانٹنے کیوں نہیں آئے؟'' کرم دین نے بھائیوں سے شکوے کے طور پر بات کی تھی مگر وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ شائد وہ اس گھر میں سے ان کا حصہ دینے سے انکار کر رہا ہے، اس لیے راحت فوراً بول پڑا ''تم ایسا نہیں کر سکتے۔ اس گھر میں ہم تینوں کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا تمہارا۔ تم اس گھر کے اکیلے وارث نہیں ہو''

''یہ میں نے کب کہا کہ اس گھر میں تمہارا کوئی حصہ نہیں۔ میں تو تمہیں صرف یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ بھائی صرف جائیداد میں ہی کیوں حصہ داری کا دعوہ کرنے آ جاتے ہیں۔''

کرم دین اور بھی کچھ کہنا چاہتا تھا کہ شفیق نے بات کاٹ دی ''اگر تم نے ماں کو کچھ سالوں تک اکیلے سنبھالا ہے تو اتنے سالوں تک اس گھر میں بھی تو تم اکیلے ہی مالک بنے بیٹھے رہے ہو۔ اگر ہم ان سالوں کے کرائے کا ہی حساب کرنے بیٹھ جائیں تو وہ لاکھوں میں ہو گا۔ ہم تو اس کرائے کا بھی تم سے کوئی مطالبہ نہیں کر رہے۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ تم اپنے حصے میں شفٹ ہو جاؤ تا کہ ہم تینوں اپنا حصہ فروخت کر کے آپس میں رقم بانٹ لیں۔ ہم اپنے ساتھ مستری بھی لے آئے ہیں تا کہ دیوار بنانے کے لیے پیمائش کی جا سکے۔''

''مجھے اس گھر میں سے کچھ نہیں چاہئے۔'' کرم دین کہہ رہا تھا ''میرے بیوی بچے بھی نہیں، میں اکیلا ہوں کہیں بھی رہ لوں گا۔ میرا حصہ بھی تم

تینوں ہی آپس میں بانٹ لو"

کرم دین کی بات سن کر راحت، شفیق اور ریاض تینوں ہی کی آنکھوں میں چمک آ گئی تھی پھر بھی راحت بول پڑا "ہم اتنے بھی ظالم نہیں..... تمہیں تمہارا حق پورا ملے گا....." پھر مستری کی طرف رخ کرتے ہوئے بولا "تم اچھی طرح پیمائش کر لو اور نشان لگا لو کہ دیوار کہاں بنے گی اور کل ہی سے دیوار بنانے کا کام شروع کر دو تا کہ ہم جتنی جلدی ہو سکے اس کام سے فارغ ہو جائیں"

راحت کی بات سن کر کرم دین نے نظریں جھکا دیں اور خاموشی سے ایک طرف دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

☆☆☆☆☆

کرم دین کے پاس کچھ بھی نہیں رہا تھا، نہ بیوی، نہ بچے، نہ دولت اور نہ عزت، وہ سب کچھ جو اس کے پاس تھا چھن چکا تھا، ان سب سے بڑھ کر جو بوجھ وہ اٹھائے پھر رہا تھا وہ کسی پل اسے چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا، اسے کوئی راہ دکھائی نہیں دے رہی تھی، آ جا کر اس کے پاس بابا سائیں نجات دھندہ کی شکل میں دکھائی دیتے تھے، مگر انہوں نے بھی جو حل بتایا تھا اس میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔

کوئی مزار، کوئی پیر فقیر، کوئی دربار، کوئی خانقاہ ایسی نہیں رہی تھی جہاں وہ اپنے درد کا علاج ڈھونڈنے نہیں پہنچا تھا، مگر اس کے اجڑے دل کو کہیں قرار نہیں ملا تھا، دن بدن اس کی مایوسی بڑھتی جا رہی تھی، وہ سارا سارا دن چارپائی پر لیٹا چھت کو گھورتا رہتا، تمام محلے داروں نے بھی اس کی حرکتوں کی وجہ سے اس سے میل جول ختم کر رکھا تھا، وہ بھری دنیا میں بھی تنہا تھا، کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو مشکل کے ان لمحات میں اس کا ساتھ دیتا۔

وہ روز کی طرح اپنی سوچوں میں گم بیٹھا تھا، جب مسجد سے ہونے والی اذان کی آواز اس کے کانوں میں پڑی، یہ آواز ہر روز پہلے بھی پانچوں وقت اس کے کانوں کے پردوں سے ٹکرائی تھی، جسے وہ سنی ان سنی کر دیا کرتا تھا، لیکن اس لمحے اذان کی آواز کانوں کے راستے سیدھی اس کے دل میں اتر رہی تھی، اس وقت اسے کچھ بھی یاد نہیں رہا تھا صرف اذان کی آواز تھی جو اسے جھنجوڑ رہی تھی، اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے زندگی میں پہلی بار اس نے دل سے مکمل توجہ کے ساتھ اذان سنی تھی۔

مسجد سے ہونے والی اذان ختم ہو گئی تھی مگر وہ گم سم بیٹھا اذان کے الفاظ پر غور کر رہا تھا، وہ کچھ دیر تک اسی کیفیت میں بیٹھا سوچتا رہا پھر ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا، اٹھتے ہی اس نے جلدی سے وضو کیا اور سر پر ٹوپی لے کر مسجد کی طرف چل پڑا، کرم دین کے قدم مسجد کی طرف بڑھ رہے تھے، اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ یہ سب اپنی مرضی سے نہیں کر رہا تھا، کوئی طاقت تھی جو اس سے یہ سب کروا رہی تھی۔

مسجد میں نمازیوں کی تعداد کافی کم تھی، جیسے ہی کرم دین نے مسجد میں قدم رکھا، وہاں بیٹھے ہر شخص نے اسے اس انداز سے دیکھا جیسے کوئی غیر مسلم غلطی سے مسجد میں آ گیا ہو، کرم دین نے اس بات کی کوئی پرواہ نہ کی اور خاموشی سے ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا، اس کی موجودگی کی وجہ سے نمازی آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے سوال کر رہے تھے مگر کرم دین ان سب سے بے خبر نگاہیں نیچی کئے سکون سے بیٹھا جماعت کھڑی ہونے کے انتظار میں تھا۔

نماز کے بعد دعا ہوئی، دوسرے نمازیوں کے ساتھ کرم دین نے بھی اپنے ہاتھ دعا کے لیے اٹھا دیے تھے، دعا مانگتے ہوئے اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے تھے، دعا ختم ہوئی تو نمازیوں نے اپنے اپنے گھروں کی راہ لی، اب صرف ایک دو نمازی تھے جو مصلے کے پاس بیٹھے میاں جی سے گفتگو کر رہے تھے، کرم دین کچھ دیر تک اپنی جگہ پر بیٹھا آنسو بہاتا رہا پھر خاموشی سے اٹھا اور وہاں سے نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد میاں جی کے پاس بیٹھے ہوئے نمازیوں نے کرم دین کے مسجد میں آنے کے متعلق بات کرنے کی کوشش کی تھی، مگر میاں جی نے نہ صرف انہیں اس بات کی اجازت نہیں دی تھی بلکہ یہ کہتے ہوئے ایسا کرنے سے سختی سے منع کر دیا تھا "یہ خدا کا گھر ہے، اور ایک مسلمان کو اس کے گھر میں آنے سے روکنے کا حق کسی کو بھی نہیں"۔

کرم دین مسجد سے نکل کر سیدھا گھر پہنچا تھا، اس نے راستے میں کسی سے بھی کوئی بات نہیں کی تھی، وہ واپس آ کر پھر سے چارپائی پر لیٹ گیا تھا، وہ سوچنے لگا کہ وہ نماز ادا کرنے مسجد میں گیا تھا اور اسے چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے، مگر ان چند گھڑیوں میں اسے جو راحت اور سکون ملا تھا وہ اسے کبھی کہیں نصیب نہیں ہوا تھا، وہ خود کو لعنت ملامت کرنے لگا، مسجد سے دن میں پانچ بار خدا کی طرف سے بلاوا آتا ہے کہ آؤ فلاح کی طرف، لیکن وہ تو ہمیشہ سے ہر پکار کو سنی ان سنی کرتا آیا تھا، اسی لیے تو اس کے حصے میں ناکامیاں ہی آئی تھیں۔

ماں اسے سمجھاتی رہی لیکن اس نے ہمیشہ سنی ان سنی کر دی تھی، اسی لیے وہ اس راز کو جان نہ سکا، ماں کے پاس غربت کے سوا کچھ بھی نہ تھا، اس نے زندگی میں دکھوں کے سوا کچھ بھی نہیں دیکھا تھا مگر پھر بھی اس کا چہرہ پرسکون ہوتا تھا۔

سوچتے سوچتے کب وقت گزرا اسے پتہ بھی نہ چلا، مسجد سے ہونے والی عشاء کی اذان اس کے کانوں میں پڑی تو وہ جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا، وہ اس قدر تیزی سے اٹھا تھا جیسے اسے اذان کا ہی انتظار تھا، اس نے وضو کیا، سر پہ ٹوپی لی اور نماز ادا کرنے کے لیے مسجد کی طرف چل پڑا، مسجد میں اب بھی تقریباً وہی لوگ تھے، جو مغرب کے وقت آئے ہوئے تھے، اب بھی ان لوگوں نے پہلے کی طرح کرم دین کے مسجد میں آنے پر ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

مسجد سے واپسی پر کرم دین رات کا کھانا کھانے کے بعد گھر واپس آ گیا، اس نے قریب ہی دیوار پر ٹنگی ہوئی وہ تسبیح اٹھالی جو اس کی ماں ہر وقت ہاتھ میں لیے رہتی تھی، اس نے تسبیح ہاتھوں میں لی تو اسے ایسا لگا جیسے اس کی ماں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہو، اب تسبیح اس کے ہاتھوں میں تھی لیکن اسے یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا پڑھے، تسبیح بار بار غیر ارادی طور پر اس کے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہو رہی تھی، یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کچھ پڑھنے کی بجائے اس سے کھیل رہا تھا، پھر کچھ دیر بعد اس کے منہ سے خود بخود ''اللہ.....اللہ.....اللہ'' کے الفاظ ادا ہونے لگے اور تسبیح کے دانے ایک ایک کر کے گرنے لگے۔ تسبیح کرتے ہوئے وہ لیٹ گیا تھا، اس کی زبان سے خدا کا ذکر جاری تھا پھر آہستہ آہستہ نیند غالب آنے لگی، کچھ ہی دیر بعد تسبیح اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر اس کے سینے پر گر گئی اور وہ سو گیا۔

اس کی آنکھ کھلی تو مساجد سے اذانِ فجر کی آواز اس کے کانوں میں پڑ رہی تھی، مسجدوں میں اذانیں تو ہر روز ہوتی تھیں مگر اس نے کبھی ایک بار بھی فجر کی اذان نہیں سنی تھی اور اگر کبھی آواز اس کے کانوں میں پڑی بھی تھی تو اگلے ہی لمحے نیند کی وجہ سے اسے بھی ہوش نہیں رہا تھا کہ اذان ہوئی تھی، جب اس کی آنکھ کھلتی تو دن چڑھ چکا ہوتا تھا۔

اذان کی آواز سنتے ہی اس نے چارپائی چھوڑ دی تھی، ایک عرصے کے بعد وہ سکون سے سویا تھا، ورنہ اکثر راتیں سوتے جاگتے، سوچتے اور ڈرتے ہوئے گزر جاتی تھیں، لیکن اس رات اسے بہت اچھی نیند آئی تھی۔

نماز ادا کرنے کے بعد وہ گھر لوٹا تو اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ رات کو کافی سو لیا، اب دوبارہ لیٹنے سے بہتر ہے کہ قرآن پاک کی تلاوت کی جائے، اس نے قرآن پاک اٹھایا تو اس کے غلاف پر اس قدر مٹی پڑی ہوئی تھی کہ غلاف کا رنگ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا، اس نے آہستہ سے غلاف اتارا اور قرآن پاک ایک طرف اونچی جگہ رکھ دیا، پھر صحن میں جا کر غلاف سے مٹی جھاڑنے لگا، اس نے کئی بار زور زور سے جھٹکوں کے ساتھ غلاف پر پڑی مٹی کی تہیں جھاڑیں، مٹی جھڑنے سے غلاف کا سبز رنگ صاف دکھائی دینے لگا تھا۔

غلاف کی مٹی جھاڑنے کے بعد اس نے قرآن پاک کو بھی ہاتھوں میں پکڑ کر ہلکا ہلکا سا تھپتھپایا تو اس میں سے بھی کافی مٹی نکل کر اڑی، مٹی جھاڑنے کے بعد اس نے قرآن پاک کو چوما اور پھر اپنی دونوں آنکھوں سے لگایا، ایسا کرتے ہوئے ایک روشنی اس کے اندر تک پھیل گئی تھی، جسے وہ کوئی نام نہیں دے سکتا تھا مگر اسے سکون محسوس ہو رہا تھا۔

قرآن پاک، کرم دین کے سامنے کھلا پڑا تھا، اس کی نظر قرآن پاک کے الفاظ پر پڑ رہی تھی مگر وہ پڑھ نہیں رہا تھا، وہ سوچنے لگا کہ جب تک اس کی ماں زندہ رہی، اس نے قرآن پاک کی تلاوت میں کبھی کوئی ناغہ نہیں کیا تھا، پھر یہی عادت عائشہ کی رہی، وہ بھی اپنی ہر صبح کا آغاز تلاوت کلام پاک سے کیا کرتی تھی مگر ایک وہ ہے جس نے کبھی بھول کر بھی قرآن پاک کھول کر نہیں دیکھا تھا، بچپن میں اس نے میاں جی سے ہی قرآن پاک پڑھا تھا مگر اس کے بعد اسے نہیں یاد تھا کہ کبھی اس نے قرآن پاک کی تلاوت کی ہو، بہت سی سوچیں اسے گھیرے میں لیے ہوئے تھیں، وہ کچھ دیر تک انہیں سوچوں میں گم رہا، پھر اسے احساس ہوا کہ وہ قرآن پاک کھولے بیٹھا ہے، اس نے ایک دو صفحات پڑھے اور پھر بند کر کے چوما اور غلاف چڑھا کر واپس اسی جگہ رکھ دیا، جہاں سے اٹھایا تھا۔

☆☆☆☆☆

کرم دین کے شب و روز میں اچانک تبدیلی آئی تھی، ماں جب تک زندہ رہی اسے سمجھاتی رہی، مگر اس نے کبھی مسجد کا رخ نہیں کیا تھا، بیوی نے بھی بار بار نماز کے متعلق سمجھایا تھا مگر اس نے کبھی کوئی اثر نہ لیا، اب اسے کہنے اور سمجھانے والا کوئی بھی نہیں رہا تھا، لیکن اب جیسے ہی اذان کی آواز اس کے کانوں میں پڑتی، وہ وضو کرتا اور مسجد کی طرف چل پڑتا اور ہر صبح فجر کی نماز کے بعد قرآن پاک کی تلاوت بھی ضرور کرتا۔

وہ عشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد واپس آ کر اپنی چارپائی پر لیٹ جاتا تھا، لیٹتے ہی اسے نیند آ جاتی، پھر رات بھر وہ سکون سے سویا رہتا اور صبح فجر کی اذان کی آواز سے ہی اس کی آنکھ کھلتی، اب بھی کسی کسی روز اسے سوتے میں ڈر لگنے لگتا تھا مگر وہ پہلے کی طرح پریشان نہیں ہوتا تھا، وہ چارپائی کے پائے سے لٹکی تسبیح اٹھاتا اور آیت الکرسی کا ورد کرنے لگتا یا بار بار کلمہ طیبہ پڑھتا، ایسا کرنے سے اس کا ڈر دور ہو جاتا اور پھر سے آنکھ لگ جاتی۔

☆☆☆☆☆

وہ سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی، ایک مدت سے کسی نے اس کے دروازے پر دستک نہیں دی تھی، جب کسی سے میل ملاقات نہ رہی ہو، کسی کا آنا جانا نہ ہو تو رات کی تاریکی میں ہونے والی دستک پر پریشان ہو جانا فطری بات تھی، کرم دین کے پاس ایسا کچھ بھی نہیں تھا، جس کے لٹنے کی اسے فکر ہوتی، یوں بھی لوٹنے والے کبھی دستک دے کر نہیں آیا کرتے، اس نے بلا خوف و خطر دروازے کی کنڈی کھول دی۔

''آ.....آ.....آپ؟'' دروازے پر میاں جی کو کھڑے دیکھ کر کرم دین نے حیران ہو کر دریافت کیا، کیونکہ اسے نہیں یاد تھا کہ محلے میں اس نے میاں جی کو کبھی کسی کے بھی گھر جاتے دیکھا ہو، میاں جی نے کرم دین کی حیرانی کو محسوس کر لیا تھا مگر خاموش رہے تھے۔

''میاں جی! آپ.....اور میرے گھر پر؟'' کرم دین نے میاں جی کو خاموش پا کر دریافت کیا۔

''ہاں۔عشاء کی نماز کے بعد لیٹ گیا تھا۔مگر نیند نہیں آ رہی تھی، بہت دنوں سے تم سے ملنا بھی چاہ رہا تھا۔اس لیے چلا آیا''

''اچھا کیا میاں جی۔'' یہ کہہ کر کرم دین خاموش ہو گیا، میاں جی بھی چُپ تھے پھر کرم دین بول پڑا ''میاں جی یہاں کیوں کھڑے ہیں.....اندر آ جائیں ناں؟''

''بھئی تم اندر آنے کو کہو گے تو آؤں گا ناں۔زبردستی تو تمہارے گھر میں نہیں گھس سکتا۔'' میاں جی نے آہستہ سے بات کی۔

''اصل میں میاں جی! آج آپ کو یہاں دیکھ کر مجھے خوشی ہی اس قدر ہو رہی ہے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔''

''چلو کرم دین! اندر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔''

''آ جائیں میاں جی! آ جائیں.....'' کرم دین نے ایک طرف ہٹتے ہوئے میاں جی کے لیے راستہ بناتے ہوئے کہا۔

اب وہ دونوں پاس پاس بیٹھے تھے، کرم دین، میاں جی کے آنے پر بہت خوش تھا مگر ڈر بھی رہا تھا کہ اب میاں جی نہ جانے کیا کہہ دیں گے، وہ اس قدر سہما ہوا تھا کہ پریشانی کے آثار اس کے چہرے پر نمایاں تھے۔

کرم دین کی حالت میاں جی سے چھپی نہیں رہی تھی، وہ کچھ دیر تک اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لیتے رہے پھر بولے ''جب کچھ روز قبل پہلی بار تم مغرب کی نماز پڑھنے مسجد میں آئے تو مجھے بہت اچھا لگا تھا۔تم میرے کئی بار پیغام بھجوانے پر بھی کبھی مسجد میں نہیں آئے تھے۔اس روز تم آئے اور خاموشی سے نماز ادا کر کے لوٹ گئے' مگر میں مغرب سے عشاء تک یہی سوچتا رہا کہ تم عشاء کی نماز کے لیے بھی مسجد میں آؤ گے یا نہیں اور جب تم آئے تو جانتے ہو کرم دین، خوشی سے میری آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے تھے۔میں جانتا ہوں اس روز مسجد میں آنے پر بھی لوگ تمہیں عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے لیکن میں نے شکرانے کے دو نفل ادا کیے اور خدا کے حضور دعا کی تھی کہ جس محبت، جذبے اور شوق سے تم مسجد میں آئے تھے وہی لگن ہمیشہ قائم رہے۔'' بات کرتے ہوئے میاں جی کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے، انہوں نے رومال سے آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو صاف کیا اور کہنے لگے۔ ''میں جانتا ہوں کوئی بھی محلے دار تم سے بات کرنے کو تیار نہیں، میں محسوس کر سکتا ہوں، گلی میں سے گزرتے ہوئے جب کوئی تمہیں دیکھ کر منہ پھیر لیتا ہو گا تو تمہارے دل پر کیا بیتتی ہو گی۔تمہیں کس قدر دکھ ہوتا ہو گا' مگر میں اتنا کہوں گا کہ تم نے خدا سے تعلق جوڑنے کی جو کوشش شروع کی ہے اسے ٹوٹنے مت دینا۔ایک بار خالق سے تعلق جڑ گیا تو اس کی مخلوق بھی خود بخود تم سے ناطہ جوڑ لے گی.....''

بات کرتے ہوئے میاں جی رکے تو کرم دین بول پڑا ''میں نے کئی بار آپ سے بات کرنا چاہی مگر نہیں کر سکا میاں جی۔''

''مجھے معلوم ہے، تم ہر روز ہر نماز کے بعد مجھ سے کچھ کہنا چاہتے تھے مگر کہہ نہیں پاتے تھے۔تمہاری اسی بات نے کئی دنوں سے مجھے اس قدر پریشان کر رکھا تھا کہ آج میں خود چل کر یہاں آ گیا ہوں۔میں نے سوچا کہ سارے لوگ میرے پاس چل کر آتے ہیں، اگر میں کسی کے پاس جاؤں گا تو کیا فرق پڑ جائے گا''

''میاں جی۔میں آپ سے پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا میں اتنا برا ہوں کہ لوگوں نے مجھ سے بات کرنا بھی چھوڑ دیا ہے؟ کیا میرے گناہ اتنے زیادہ ہیں کہ مجھے معافی ہی نہ مل سکے؟''

''خدا کی ذات ہر بڑے سے بڑے گناہ کو معاف کر دینے والی ہے۔مایوسی خود ایک گناہ ہے تم بھی مایوس مت ہو، اوپر والا سب ٹھیک کر دے گا۔''

''مجھے بھی معافی مل جائے گی ناں میاں جی؟''

''کیوں نہیں، جو بھی خدا سے سچے دل سے معافی مانگ لے، خدا اسے ضرور معاف کر دیتا ہے۔ وہ غفور الرحیم ہے، معاف کر دینا تو اس کی صفات میں سے ایک ہے اور جب وہ خدا ہو کر معاف کر دیتا ہے تو مخلوق خدا کون ہوتی ہے کسی کو معاف نہ کرنے والی'' بات کرتے ہوئے میاں جی اٹھ کھڑے ہوئے، انہیں اٹھتے دیکھ کر کرم دین بھی اٹھ گیا۔

''اب میں چلتا ہوں کرم دین..... گھر والے انتظار کر رہے ہوں گے..... پھر کسی روز بیٹھ کر بہت سی باتیں کریں گے.....'' میاں جی نے اٹھتے ہوئے بات کی اور کرم دین کو گلے لگا لیا، میاں جی نے کرم دین کو اس قدر محبت سے اپنے سینے سے لگایا تھا کہ اسے اپنے سارے بدن میں ٹھنڈک سی محسوس ہونے لگی، اسے پہلی بار اس بات کا تجربہ ہو رہا تھا کہ آلِ رسول ﷺ کی قربت سے دل و جان کو کس قدر سکون ملتا ہے۔

میاں جی چلے گئے تھے، کرم دین انہیں دروازے تک چھوڑنے گیا تھا پھر دروازہ بند کر کے وہ واپس اپنی چارپائی پر آ کر لیٹ گیا تھا، کوئی انسان، انسانوں کی بستی میں رہتا ہو اور کسی انسان سے بات بھی نہ کر پائے، اس سے بڑھ کر اس کے لیے اور کیا تکلیف دہ بات ہو سکتی ہے، وہ یہ سوچ کر خوش ہو رہا تھا کہ ایک عرصے کے بعد کسی نے اس قدر محبت سے اس سے بات کی تھی۔

☆☆☆☆☆

میاں جی نے شائد کسی نہ کسی طریقے سے مسجد میں آنے والے نمازیوں کو کرم دین کے بارے میں سمجھا دیا تھا، یہ اسی کا اثر تھا کہ اب کوئی مسجد میں آنے پر اسے چبھتی ہوئی نظروں سے نہیں دیکھتا تھا، وہ مسجد میں آ کر وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کو سلام کرتا تو وہ بھی اسے سلام کا جواب دیتے، نماز سے فارغ ہو کر سبھی نمازی ایک دوسرے سے مصافحہ کرتے تو وہ بھی آگے بڑھ کر سب سے مصافحہ کرتا، وہ میاں جی سے مصافحہ کرتا تو وہ پیار سے اس کی پیٹھ پر تھپکی دیتے۔

''میاں جی! میرا دل چاہتا ہے کہ آج میں اپنے دل کی ساری باتیں، سارے دکھ، آپ کے سامنے کھول کر رکھ دوں'' سب نمازیوں کے جانے کے بعد موقعہ پا کر کرم دین نے بات شروع کی۔

''کہو۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟'' میاں جی نے شفقت بھرے انداز میں کہا۔

میاں جی کی طرف سے اشارہ پا کر کرم دین شروع سے آخر تک وہ سب کچھ بیان کرنے لگا جو حرف حرف سچ تھا، تھوڑی ہی دیر میں اس نے اپنی زندگی کی کتاب کے صفحات میاں جی کے سامنے کھول کر رکھ دیے تھے، اس نے وہ کچھ بھی بتا دیا تھا جو کسی اور کو معلوم نہیں تھا، وہ بولتا گیا، میاں جی غور سے سنتے رہے، جب وہ اپنی ساری کہانی سنا چکا تو میاں جی نے حیران ہو کر دریافت کیا ''تو اب تمہارا گزارہ کیسے ہوتا ہے؟''

''اب تک تو جیسے تیسے دن کٹتے ہی رہے ہیں، مگر اب اور دن نہیں گزر پائیں گے''

''تو پھر تم نے کچھ تو سوچا ہو گا؟'' میاں جی نے پریشان ہو کر سوال کیا۔

''سوچنے کی مہلت ہی کہاں ملی ہے میاں جی۔ میں تو ایک عرصے سے پاگلوں جیسی زندگی گزارتا آیا ہوں اور کوئی پاگل اتنا کچھ کہاں سوچ سکتا ہے''

کرم دین کی باتوں نے میاں جی کو تڑپا کر رکھ دیا تھا، وہ کچھ دیر تک سر جھکائے سوچتے رہے پھر بولے ''خدا سے لگاؤ لگائے رکھو۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

☆☆☆☆☆

کرم دین نے میاں جی کو وہ سب کچھ بتا دیا تھا، جو وہ اب تک کرتا آیا تھا، مگر اس نے مبارک اور صابر والی بات چھپا لی تھی، یہی بات اس کے سینے میں کانٹے کی طرح چبھ گئی تھی، اسے خود سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ جب اس نے میاں جی سے کچھ بھی نہیں چھپایا تھا یہاں تک کہ اپنے بیوی بچوں کی موت کی ذمہ داری بھی قبول کر لی تھی تو پھر وہ مبارک کے پاگل پن اور صابر کی موت والی بات کیوں چھپا گیا تھا۔

وہ فجر کی نماز کے بعد اٹھ کر جانے لگا تو میاں جی نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا اور ایک وزیٹنگ کارڈ کرم دین کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے ''کرم دین تم ایسا کرنا آج ان سے ملنا، انہیں میرا بتانا، میں نے ان سے تمہارے بارے میں بات کی ہوئی ہے، خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا'' میاں جی نے پیار سے کرم دین کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے تسلی دی تو کرم دین کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں، سفید داڑھی کے ساتھ ساتھ سفید بھنوؤں والے آلِ رسول ﷺ شفقت بھرے لہجے میں اسے پیار سے حوصلہ دے رہے تھے، ان کے نرم ہاتھوں کا لمس پا کر اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے، اس نے آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کو اپنے ہاتھوں سے صاف کر لیا اور یوں اس کے آنسو ہاتھوں میں ہی جذب ہو گئے اور بہنے سے بچ گئے۔

☆☆☆☆☆

گھر آتے ہی کرم دین نے سائیکل کو اچھی طرح صاف کیا، پھر ناشتے سے فارغ ہو کر میاں جی کا دیا ہوا وزیٹنگ کارڈ جیب میں ڈال کر گھر سے نکل گیا۔ فیکٹری اس کے لیے نئی نہیں تھی، وہ پہلے بھی کئی بار اس کے سامنے سے گزرا تھا اس لیے اسے وہاں پہنچنے میں ذرا بھی مشکل پیش نہیں آئی تھی۔

وہ اس شخص کے سامنے بیٹھا تھا جس کا کارڈ دے کر میاں جی نے اسے وہاں بھیجا تھا، وہ میاں جی کے کہنے پر چلا تو آیا تھا مگر اس خیال سے ڈر رہا تھا کہ وہ شخص نہ جانے کیسے کیسے سوالات کرے گا، وہ اس سے قبل بھی ملاقات کے لیے ایسے بہت سے لوگوں کے سامنے پیش ہو چکا تھا اور جانتا تھا کہ ایسے میں کیسے کیسے سوالات کیے جاتے ہیں، مگر خلاف توقع اس سے کسی قسم کا کوئی بھی سوال نہیں کیا گیا تھا اور مینجر کو بلا کر اسے ملازمت پر رکھنے کی ہدایات جاری کر دی گئی تھیں۔

جن حالات سے کرم دین گزر رہا تھا، اس کا خیال نہیں تھا کہ اب اسے کبھی سکھ کا کوئی پل نصیب ہو پائے گا، لیکن اب اسے اس بات کا احساس ہونے لگا تھا کہ وہ یونہی ادھر ادھر بھٹکتا رہا اور سکون ملا تو اس شخص کے ذریعے جسے نیچا دکھانے کا کوئی بھی موقعہ کبھی اس نے ہاتھ سے نہیں جانے دیا تھا۔

نماز پنجگانہ ادا کرنے اور قرآن پاک کی تلاوت کی برکات سے رفتہ رفتہ اس کی دماغی کیفیت بہتر ہونے لگی تھی، اب اسے اپنے ہی گھر میں ڈر بھی نہیں لگتا تھا، بیوی اور بچوں کے جگہ جگہ بکھرے ہوئے اعضاء دکھائی دینے سے بھی جان چھوٹ گئی تھی مگر اب دن رات یہ بات اسے ستانے لگی تھی کہ اس نے مبارک اور صابر والی بات میاں جی کو کیوں نہیں بتائی تھی۔

''میاں جی کچھ بوجھ اور بھی ہیں۔ جو ابھی تک میں اپنے سینے پر لیے پھرتا ہوں۔ وہ بوجھ کسی پل مجھے سکون سے بیٹھنے نہیں دیتے۔'' موقع پا کر کرم دین نے بلا تمہید بات شروع کی۔

''کس بوجھ کی بات کر رہے ہو کرم دین؟'' میاں جی نے حیران ہو کر دریافت کیا۔

''جس روز میں نے اپنے سینے مین دفن اپنی بے ترتیب زندگی کے سارے راز آپ کے سامنے کھول کر رکھ دیے تھے۔ کچھ ایسی بھی باتیں تھیں جو اس روز میں آپ کو بتا نہیں پایا تھا' مگر اب وہی باتیں میرے سینے پر بوجھ بن گئی ہیں، جنہیں اٹھاتے اٹھاتے میں تھک گیا ہوں۔''

''ڈرو نہیں۔ اگر کوئی ایسی بات ہے تو وہ بھی بتا ڈالو۔ دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔''

''میاں جی مبارک کو تو آپ جانتے ہی ہوں گے''

''ہاں! جو ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہے اور اس پر پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں''

''جی میاں جی! وہی مبارک' اسے اس حالت تک پہنچانے والا میں ہوں۔ میں نے ہی بابا سائیں کے کہنے پر اپنے سر سے کالے علم کا بوجھ اتارنے کے لیے چلہ کاٹنے کے لیے اسے تیار کیا تھا۔ جہاں سے ڈر کر وہ بھاگا اور اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا۔''

''بس یہی بوجھ تھا یا کچھ اور بھی ہے؟'' میاں جی نے انتہائی افسردہ لہجے میں سوال کیا۔

''ایک بوجھ اور بھی ہے میاں جی۔''

''وہ کیا؟''

''جس نوجوان کی لاش قبرستان سے ملی تھی..... اس کی موت کا سبب بھی میں ہی بنا تھا۔''

''تم کہیں صابر کی بات تو نہیں کر رہے؟''

''جی میاں جی! وہ بھی کالا علم سیکھنا چاہتا تھا' محض اسے پرکھنے کی غرض سے میں اسے قبرستان لے گیا تھا مگر وہ انتہائی ڈرپوک نکلا اور۔'' اس سے آگے کرم دین کوئی بات نہ کر سکا اور سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

کرم دین، میاں جی کو جھٹکے پہ جھٹکے دے رہا تھا، وہ سر کو پکڑے گردن جھکائے کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے، یہ باتیں ان کے لئے غیر متوقع تھیں، اس لیے ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں، کرم دین کی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔ 'جو سچ تھا وہ میں نے بتا دیا۔ اب میرے جرموں کی جو بھی سزا ملے، میں بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔''

میاں جی نے کرم دین کی بات سن لی تھی مگر ان سے بات نہیں ہو پا رہی تھی، کرم دین اب اس انتظار میں تھا کہ میاں جی اس سلسلے میں کیا فیصلہ سناتے ہیں، کچھ دیر تک دونوں ہی خاموشی سے گردن جھکائے بیٹھے رہے، پھر میاں جی نے ایک لمبی سانس چھوڑی اور بولے۔ ''میں تمہیں

لے کر خود ان کے گھر جاؤں گا۔ ان دونوں کے والدین جو بھی فیصلہ کریں گے وہ تمہیں ماننا ہوگا۔''

''مجھے منظور ہے میاں جی!'' کرم دین نے افسردہ لہجے میں بات کی۔

کرم دین جو بوجھ دل پہ اٹھائے پھرتا تھا اس نے وہ بھی اتار ڈالا تھا، وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ اب آگے چل کر اس کے ساتھ کیا ہونے والا تھا مگر اندر سے مطمئن تھا، میاں جی نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ ذہنی طور پر تیار رہے، جس روز بھی صابر اور مبارک کے گھر جانا ہوگا وہ اسے بتا دیں گے۔

میاں جی نے اس معاملے میں تین چار روز تک ہر پہلو پر غور کیا تھا، ہر بات کو سچ کے پلڑے میں ڈال کر دیکھا تھا، تب کہیں جا کر فیصلہ کیا تھا کہ اس معاملے پر پردہ ڈالنے کی بجائے ان دونوں کے ہاں جانا بہتر ہے، اس کے لیے انہوں نے عشاء کی نماز کے بعد کا وقت مقرر کیا تھا، کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ دن کے اجالے میں ان کے ہاں جائیں اور خواہ مخواہ وہاں لوگ جمع ہونے پر کوئی تماشہ بنے۔

☆☆☆☆☆

کرم دین گردن جھکائے میاں جی کے ساتھ ساتھ اس مجرم کی طرح چل رہا تھا، جسے پولیس والے ہتھکڑی لگا کر عدالت میں پیش کرنے کے لیے لے جا رہے ہوں۔ میاں جی کرم دین کو لے کر مبارک کے ہاں پہنچے تھے، ان کے دروازے پر پہنچتے ہی میاں جی نے دروازے پر لگی گھنٹی کے بٹن پر ہاتھ رکھ دیا، دروازہ اللہ داد نے کھولا تھا، دروازے پر میاں جی کو دیکھ کر اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا، اس سے پہلے کہ وہ کوئی سوال کرتا میاں جی بول پڑے..... ''میں تمہارے ساتھ کچھ ضروری باتیں کرنے آیا ہوں۔ میرے ساتھ کرم دین بھی آیا ہے، اگر تم کہو تو اندر بیٹھ کر بات کر لیں۔''

اللہ داد کے لیے میاں جی کا اس کے گھر آنا کسی اعزاز سے کم نہیں تھا، وہ انہیں اندر لے جانے سے بھلا کیسے انکار کر سکتا تھا۔

''میاں جی! یہ آپ ہی کا گھر ہے اجازت کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ آ جائیں'' اللہ داد بات کرتے ہوئے انہیں ساتھ لے کر چل پڑا۔

اللہ داد نے بیٹھک کا دروازہ کھولا اور انہیں اندر بٹھا دیا، پھر میاں جی کے کہنے پر اس نے فاطمہ کو بھی وہیں بلا لیا، میاں جی کے ساتھ کرم دین کو دیکھ کر کچھ کچھ بات فاطمہ کی سمجھ میں آنے لگی تھی، مگر اللہ داد مکمل طور پر بے خبر تھا، کیونکہ مبارک کے دماغی توازن کھو بیٹھنے کے پیچھے جو کہانی تھی، فاطمہ نے اسے اللہ داد سے ابھی تک چھپا رکھا تھا، وہ بیٹے کی حالت دیکھ کر اندر ہی اندر رو لیتی تھی، مگر اس بات کی ہوا اپنے شوہر کو نہیں لگنے دیتی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اللہ داد یہ سن کر بھڑک اٹھے گا اور پھر نہ جانے غصے میں آ کر کیا کر بیٹھے۔

''میاں جی! کوئی چائے پانی لاؤں آپ کے لیے؟'' فاطمہ نے بیٹھتے ہی دریافت کیا۔

''نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔ تم یہ بتاؤ مبارک کی حالت اب کیسی ہے؟''

میاں جی کے منہ سے مبارک کا نام سن کر فاطمہ کے چہرے کی رنگت بدل گئی اور ماتھے پر پسینہ آ گیا، وہ یہ سوچ کر کانپنے لگی تھی کہ جس راز کو اس نے اب تک اپنے خاوند سے چھپائے رکھا وہ کھلنے ہی والا تھا، کیونکہ کرم دین کی موجودگی اس کے لیے کسی خطرے سے خالی نہیں تھی۔

''اب تو کافی بہتر ہے۔ شروع شروع میں بہت ڈرتا تھا لیکن اب وہ پہلے والی حالت نہیں رہی۔ علاج ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ جب اس کے دل سے وہ ڈر ختم ہو جائے گا، جس کی وجہ سے اس کی یہ حالت ہوئی ہے تو یہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔'' فاطمہ نے اس خوف سے تفصیلی جواب دیا کہ کسی طرح بات ٹل جائے۔

''مبارک اب ہے کہاں؟''

''اپنے کمرے میں لیٹا ہوا ہے''

''میں کرم دین کو ساتھ لایا تھا۔''

''یہ بھی اپنا ہی ہے میاں جی۔ آپ نے بہت اچھا کیا جو اسے بھی ساتھ لے آئے۔''

میاں جی بات کھولنا چاہ رہے تھے مگر فاطمہ نے جان بوجھ کر انہیں بات پوری نہ کرنے دی اور درمیان میں ہی بول پڑی اور خاوند کی نظروں سے بچ کر میاں جی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے، مگر میاں جی سمجھ نہیں پائے تھے، اس لیے پھر بولے ''اصل میں کرم دین کا یہ کہنا ہے کہ۔''

''کرم دین بھی ٹھیک ہی کہتا ہوگا' مگر اس کا علاج ہم جس ڈاکٹر سے کروا رہے ہیں اس نے ہمیں پوری تسلی کروائی ہے کہ مبارک ٹھیک ہو جائے گا۔'' فاطمہ نے ایک بار پھر میاں جی کی بات کاٹی تھی اور خاوند سے بچ بچا کر پھر سے ہاتھ جوڑے تھے، اس بار فاطمہ کے جڑے ہوئے

ہاتھوں پر میاں جی کی نظر پڑ گئی تھی، وہ کچھ کہنے کے لیے لب کھولنے ہی والے تھے کہ اچانک مبارک وہاں آ گیا، اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ ہو رہی تھیں اور ہاتھ میں اینٹ پکڑ رکھی تھی، وہ آتے ہی کرم دین کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا، اسے دیکھ کر فاطمہ اور اللہ داد اس کی طرف دوڑے مگر ان کے پہنچنے سے پہلے ہی مبارک نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی اینٹ کرم دین کے سر پر دے ماری، اینٹ لگنے سے کرم دین کے سر سے خون کے فوارے پھوٹ پڑے تھے، مبارک کو اس بات کی ذرا بھی پرواہ نہ تھی، وہ ابھی تک وہیں تنا کھڑا تھا، فاطمہ اور اللہ داد اسے پکڑنا چاہتے تھے مگر کرم دین نے انہیں روک دیا اور سر سے بہنے والے خون کی پرواہ کیے بغیر آگے بڑھ کر مبارک کو اپنے سینے سے چمٹا لیا، میاں جی بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور مبارک کی پیٹھ پر پیار سے تھپکیاں دینے لگے تھے۔

کچھ دیر تک کرم دین نے اسی طرح مبارک کو اپنے سینے سے لگائے رکھا، اب اس کا تنا ہوا بدن ڈھیلا پڑ گیا تھا اور احساس ندامت سے سر بھی جھک گیا تھا، اور وہ اینٹ جو ابھی تک اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھی، اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر جا گری تھی۔

فاطمہ نے آگے بڑھ کر مبارک کو سنبھال لیا تھا، لیکن کرم دین کے سر سے بہنے والا خون اس کے کپڑوں پر بھی لگ گیا تھا۔

''تم اسے لے کر اندر چلو۔ میں کرم دین کے سر پر کوئی کپڑا باندھ دیتی ہوں تا کہ خون بہنے سے رک جائے۔'' فاطمہ نے بیٹے کو خاوند کے حوالے کرتے ہوئے کہا اور اللہ داد بیٹے کو بازوؤں سے پکڑ کر اندر لے گیا۔

''خدا کے لیے اس بات کو یہیں دفن کر دیں میاں جی۔'' اللہ داد کے کمرے سے نکلتے ہی فاطمہ نے میاں جی کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے بات شروع کی ''جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ کرم دین نے مبارک کو زبردستی چلہ کاٹنے کے لیے نہیں بھیجا تھا۔ اس میں مبارک کی اپنی مرضی شامل تھی اور اس معاملے میں، میں بھی اس کے ساتھ شریک تھی۔ خدا کے لیے مبارک کے باپ کے سامنے اس بات کا ذکر نہ کیجئے گا، ورنہ یہاں قیامت ٹوٹ پڑے گی، اگر کرم دین آپ کے ساتھ معافی مانگنے آیا ہے تو میں نے اسے دل سے معاف کیا۔''

کرم دین کے سر سے بہت سا خون بہہ گیا تھا، فاطمہ جلدی سے ایک کپڑا اور کچھ روئی لے آئی، جہاں سے خون بہہ رہا تھا، اس نے وہاں تھوڑی سی روئی رکھ کر کپڑے کی پٹی بنا کر باندھ دی تھی اور باقی روئی سے اس کے ماتھے اور چہرے پر لگے ہوئے خون کو صاف کرنے لگی تھی، تھوڑی دیر بعد اللہ داد بھی مبارک کو لٹا کر وہیں آ گیا تھا، اس کے آتے ہی میاں جی بھی اٹھ کھڑے ہوئے، انہیں اٹھتے دیکھ کر کرم دین بھی اٹھ گیا تھا۔

''لو بھئی اللہ داد ہم چلتے ہیں۔ خدا تمہارے بیٹے کو صحت دے''

''میاں جی آپ آئے، مگر کچھ کھایا نہ پیا۔'' اللہ داد نے میاں جی کو اٹھتے دیکھ کر کہا۔

''بس جس کام کے لیے آئے تھے وہ تو ہو گیا۔ کیا کھانا اور کیا پینا۔'' میاں جی نے اللہ داد سے بات کی تھی، اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا جبکہ فاطمہ نے میاں جی کا کہا ہوا ایک ایک لفظ پوری طرح جان لیا تھا۔

وہ دونوں وہاں سے نکلے تو کافی رات ہو چکی تھی۔ ''کرم دین! اب واپس اپنے اپنے گھروں کو چلتے ہیں۔ خون بہہ جانے سے تمہیں کمزوری بھی محسوس ہو رہی ہو گی اور تمہارے کپڑوں پر بھی جگہ جگہ خون کے داغ لگے ہوئے ہیں، ایسی حالت میں صابر کے گھر جانا مناسب نہیں لگتا، پھر کسی روز چلیں گے۔'' میاں جی نے مبارک کے ہاں سے نکلتے ہی بات کی۔

''جو آپ کا حکم میاں جی!'' کرم دین نے کسی سعادت مند بچے کی طرح میاں جی کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا اور پھر بولا ''چلیں۔ میں آپ کو گھر تک چھوڑ آتا ہوں۔ اندھیرے کی وجہ سے کہیں آپ ٹھوکر کھا کر گر نہ جائیں۔'' یہ کہتے ہوئے کرم دین نے میاں جی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ان کے گھر کی طرف چل پڑا۔

میاں جی گھر میں داخل ہونے لگے تو بولے ''کرم دین اللہ اللہ کیا کرو اور ساتھ ہی ساتھ استغفر اللہ، استغفر اللہ بھی پڑھتے رہا کرو''

''ٹھیک ہے میاں جی! ضرور پڑھوں گا۔'' کرم دین نے میاں جی سے وعدہ کیا اور خدا حافظ کہتا ہوا اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆☆☆☆☆

ایک بوجھ ذہن سے اتر گیا تھا اور دوسرا ابھی باقی تھا، سر کا زخم بھرنے میں کئی دن لگ گئے تھے مگر وہ اس بات سے مطمئن تھا کہ مبارک نے دیوانگی میں ہی سہی، اس کے سر پر اینٹ مار کر اپنا غصہ اتار لیا تھا، اسے اس بات کا بھی اطمینان تھا کہ مبارک کی حالت رفتہ رفتہ بہتر ہو رہی تھی، اس کے دل سے مبارک کی صحت یابی کے لیے دعا نکلتی تھی، تا کہ اکلوتے بیٹے کی وجہ سے اس کے ماں باپ جس پریشانی سے گزر رہے تھے، انہیں اس سے نجات مل سکے۔

مبارک کے متعلق سوچتے ہوئے کرم دین اپنے ماضی میں جھانکنے لگا تھا، وہ پچھتاوے کی آگ میں جل رہا تھا، اس نے کبھی ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ دولت پانے کی خواہش میں کس کس کو روندتا چلا آیا تھا، کتنے گھر اجڑے تھے اور کتنے ہی گھروں میں صف ماتم بچھی تھی، ماں کے بعد عائشہ بھی اسے ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرنے کا درس دیتی رہی مگر اس نے شکر ادا کرنا سیکھا ہی نہیں تھا۔

وہ چارپائی پر بیٹھا تھا، اس نے دور کہیں سے پازیب کی آواز سنی تھی، مگر ادھر ادھر نظر دوڑانے پر بھی اسے وہاں کوئی دکھائی نہیں دیا تھا، پازیب کی آواز آہستہ آہستہ قریب ہوتی جا رہی تھی، دور سے اسے کوئی لڑکی اپنی طرف آتی ہوئی دکھائی دی تھی، وہ لڑکی ابھی کافی فاصلے پر تھی مگر کرم دین نے اسے پہچان لیا تھا، وہ اس بات سے آگاہ تھی کہ پازیب کی چھن چھن کرم دین کی کمزوری تھی، اسی لیے وہ جان بوجھ کر پازیب پہن کر اس سے ملنے آئی تھی، وہ ایک مدت کے بعد اسے دیکھ رہا تھا، پازیب کی چھن چھن اسے مدہوش کر رہی تھی، اسے دیکھتے ہی کرم دین کے بدن میں نشہ سا چھا گیا تھا اور وہ اس کے استقبال کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

اب وہ اس قدر قریب آ کھڑی ہوئی تھی کہ اس کے سانسوں کی خوشبو اسے دیوانہ کر رہی تھی، اس کے چہرے کی معصومیت اور پاکیزگی کرم دین کی بے قراری میں مزید اضافہ کر رہی تھی، کرم دین نے اسے سینے سے لگانے کے لیے اپنی بانہیں پھیلا دی تھیں، مگر وہ آگے بڑھنے کی بجائے دو قدم پیچھے ہٹ گئی تھی۔

''اس قدر بے رخی بھی اچھی نہیں ہوتی عائشہ۔''

''تمہیں اس بات کی کب سے پرواہ ہونے لگی''

''ایسا نہ کہو عائشہ! تم میرا پیار ہو، میری محبت، میرا عشق، میرا جنون ہو تم''

''سب جھوٹ۔ تمہیں مجھ سے نہیں دولت سے عشق تھا۔ تم نے مجھ سے پیار کیا ہی کب تھا۔ دولت ہی تمہاری پہلی اور آخری محبت تھی''

''میری غلطیوں کی اتنی بڑی سزا نہ دو۔''

''تم تو اپنی ہی دنیا میں مست تھے۔ سزا تو میں نے بھگتی ہے''

''بس عائشہ بس اب لوٹ آؤ۔ اب مجھ سے تنہا جیا نہیں جاتا''

''اب کیوں پریشان ہوتے ہو۔ یہ تنہائیاں تو تمہاری اپنی خریدی ہوئی ہیں''

''میں بکھر کر رہ گیا ہوں عائشہ! کیا تم مجھے سمیٹ نہیں سکتی؟''

''نہیں اب یہ میرے لیے ممکن نہیں۔ میں تم سے بہت دور جا چکی ہوں، اب کبھی تم مجھے بلانا بھی چاہو گے تو بلا نہیں پاؤ گے'' عائشہ نے بات کی اور آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگی، کرم دین نے آگے بڑھ کر اسے روکنے کی کوشش کی تھی مگر اس نے دوڑ لگا دی، وہ بھی اس کے پیچھے دوڑا تھا مگر اسے چھو نہیں پایا تھا اور وہ چلی گئی تھی، اسی لمحے کرم دین کی آنکھ کھل گئی تھی، اب بھی اس کی نگاہیں عائشہ کو تلاش کر رہی تھیں مگر وہ تو کب کی جا چکی تھی۔

ایک عرصے کے بعد ایسی رات آئی تھی جب وہ رات بھر سو نہیں پایا تھا، ورنہ وہ سکون کی نیند سونے لگا تھا، اگر کبھی اسے نیند نہ بھی آ رہی ہوتی تو وہ تسبیح کرنے لگتا تھا، ایسا کرنے سے اسے اس قدر سکون ملتا کہ وہ کچھ ہی دیر میں سو جاتا تھا، مگر یہ رات خود کو لعنت ملامت کرتے ہوئے گزر رہی تھی، اسے خود پر قابو نہیں رہا تھا، اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں اور وہ بچوں سے ملنے کے لیے تڑپ اٹھا تھا۔

اس بات کی پرواہ کیے بغیر کہ اس کے سسرال والے اس سے کیا سلوک کریں گے، اس نے دروازے کی گھنٹی بجا دی تھی۔

''کون؟'' اندر سے پوچھا گیا تھا۔

''میں کرم دین ہوں''

کرم دین کا نام سن کر اندر سے کوئی جواب نہیں آیا تھا اور خاموشی چھائی رہی تھی۔ ''دروازہ کھولو میں کرم دین ہوں'' کرم دین نے کچھ دیر انتظار کے بعد پھر سے کہا۔

''اب کیا لینے آئے ہو یہاں؟'' اس بار اس کی ساس نے سوال کیا تھا۔

''میں اپنے بچوں سے ملنے آیا ہوں چاچی''

''کون سے بچے؟''

''میرے بچے! عمر اور ماجدہ۔''

''جب ہماری بچی نہیں رہی تو ان سے بھی تمہارا کوئی تعلق نہیں رہا۔''
''بس ایک بار انہیں دیکھ لینے دو چاچی..... پھر میں چلا جاؤں گا''
''ایسا ممکن نہیں۔ تم جا سکتے ہو'' بات کرتے ہی غفوراں وہاں سے چلی گئی تھی۔
کرم دین نے باہر کھڑے اس کے قدموں کی آواز سنی تھی، جو آہستہ آہستہ دور ہوتے چلے گئے تھے، وہ کچھ دیر تک اس امید پر وہیں کھڑا رہا کہ شائد دروازہ کھل جائے، اس نے ایک دو بار پھر سے ڈور بیل بھی بجائی تھی مگر کسی نے دروازہ نہیں کھولا تھا اور وہ مایوس ہو کر وہاں سے واپس چل پڑا تھا۔
وہ گھر پہنچا تو اسے پیٹ میں شدید درد محسوس ہوا تھا، وہ کچھ دیر تک برداشت کرتا رہا مگر درد کی شدت بڑھتی جا رہی تھی، پھر اوپر تلے اسے کئی بار موشن آئے اور وہ نڈھال ہو کر چارپائی پر گر گیا، وہ دیر تک اسی کیفیت میں لیٹا رہا پھر ہمت جمع کی اور ڈاکٹر کے پاس چلا گیا، اس کی حالت دیکھ کر ڈاکٹر نے اسے دوائی دینے کے ساتھ ساتھ کچھ ٹیسٹ بھی لکھ دیے تھے۔
دوائی لینے سے جب طبیعت کچھ سنبھل گئی تو اس نے ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق قریب ہی لیبارٹری میں بلڈ اور یورین کے مطلوبہ ٹیسٹ کروانے کے لیے دے دیے تھے، ڈاکٹر کا شک درست ثابت ہوا تھا، رپورٹ آنے پر وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا تھا اور اس نے کرم دین کو مکمل علاج کروانے کا مشورہ دیا تھا۔

☆☆☆☆☆

میاں جی کو اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ اس رات مبارک کے گھر میں کچھ بھی ہو سکتا تھا، اس لیے انہوں نے کسی بھی قسم کی بدمزگی سے بچنے کے لیے فیصلہ کیا تھا کہ صابر کے گھر جانے کی بجائے اس کے والدین کو اپنے پاس بلا لیا جائے، انہوں نے دن میں ہی ان کے ہاں پیغام بھجوا دیا تھا کہ بہت ضروری بات کرنی ہے اس لیے وہ عشاء کی نماز کے بعد آ جائیں، میاں جی نے اپنے اس پروگرام کے متعلق کرم دین کو بھی آگاہ کر دیا تھا۔
مرحوم صابر کی والدہ اور والد کے ساتھ اس کا بھائی نادر بھی چلا آیا تھا، میاں جی اور کرم دین بھی موجود تھے، صابر کے اہل خانہ ابھی تک اپنے وہاں بلائے جانے کا سبب نہیں جانتے تھے، مگر وہاں کرم دین کی موجودگی نے ان کی پریشانی میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔
''تم لوگ یقیناً یہ سوچ کر پریشان ہو رہے ہو گے کہ آج میاں جی نے ہمیں یہاں کس مقصد کے لیے بلایا ہے؟'' میاں جی بات کرتے ہوئے رکے پھر خود ہی بولے ''دراصل میں تم لوگوں سے مرحوم صابر کے بارے میں کچھ اہم باتیں کرنا چاہتا تھا۔''
میاں جی کے منہ سے صابر کا نام سن کر اس کے والدین اور بھائی کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، وہ تینوں ہی اس سوچ میں پڑ گئے تھے کہ میاں جی، صابر کے بارے میں ایسی کون سی بات کرنے والے تھے، جس کے لیے انہوں نے رات کی تاریکی میں انہیں وہاں بلوایا تھا، ان کے دل میں طرح طرح کے خیالات جنم لے رہے تھے اور وہ بے چینی سے یہ سننے کے لیے منتظر تھے کہ میاں جی اب کیا کہتے ہیں جبکہ میاں جی بات شروع کرنے کے لیے مناسب الفاظ کی تلاش میں خاموش بیٹھے تھے، ساتھ ہی وہ یہ بھی سوچ رہے تھے کہ بات کا آغاز کہاں سے کیا جائے، انہوں نے آنکھوں سے اپنی موٹے شیشوں والی عینک اتاری اور جیب سے رومال نکال کر اسے صاف کرنے لگے، اس کمرے میں پانچ افراد موجود تھے مگر خاموشی اس قدر گہری تھی کہ انکے سانس لینے کی آوازیں بھی صاف سنائی دے رہی تھیں، پھر جیسے میاں جی کو وہ الفاظ مل گئے جن کی انہیں تلاش تھی اور بولے ''کیا تمہیں معلوم ہے کہ صابر کی موت کس طرح واقع ہوئی؟''
میاں جی کا سوال سن کر تینوں نے نفی میں گردن ہلا دی۔
''لیکن کرم دین جانتا تھا۔''
''کرم دین؟'' تینوں نے ایک ہی وقت میں حیران ہو کر دریافت کیا۔
''ہاں۔ کیونکہ اس روز کرم دین ہی صابر کو قبرستان لے گیا تھا۔''
میاں جی کی بات سن کر صابر کے گھر والوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے، پھر جیسے نادر کو کچھ ہوش آ گئی اور وہ دھاڑا ''تم نے میرے بھائی کو مارا؟ تم نے؟ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' یہ کہتے ہوئے نادر بجلی کی سی تیزی سے اٹھا اور میاں جی کے پاس بیٹھے ہوئے کرم دین پر جھپٹ پڑا، یہ حملہ اس قدر اچانک ہوا تھا کہ کرم دین کو سنبھلنے کا بھی موقعہ نہ مل سکا، نادر نے اسے نیچے گرا لیا اور اس کے چہرے اور گردن پر گھونسے مارنے لگا، میاں جی اور نادر کے والدین نے مل کر اسے ایسا کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ کسی بھی طرح ان کے قابو میں نہیں آ رہا تھا اور جہاں

موقعہ ملتا کرم دین کے جسم پر ضربیں لگا رہا تھا، ان تینوں نے مل کر جیسے تیسے سمجھا بجھا کر بمشکل نادر کو قابو میں کیا، جبڑے پر گھونسے لگنے سے کرم دین کے دانتوں سے خون بہنے لگا تھا مگر نادر کو اس کی کوئی پرواہ نہ تھی۔

''میری ایک بات یاد رکھنا۔ اب تم میرے ہاتھوں سے نہیں بچ پاؤ گے۔'' نادر ان تینوں کی گرفت میں تھا پھر بھی اچھل اچھل کر کرم دین کو دھمکیاں دے رہا تھا۔

''تم خواہ مخواہ جذباتی ہو رہے ہو۔ پہلے سکون سے بیٹھ کر پوری بات جان لو پھر جو دل میں آئے وہ کرنا۔ ایک انسان محض خوف خدا کی وجہ سے صابر کی موت کی حقیقت تم لوگوں کے سامنے لانا چاہ رہا ہے، اور تم اس کی بات سننے کی بجائے اسے جانوروں کی طرح پیٹنے لگ گئے، جہاں اتنا عرصہ گزر گیا اور تم کچھ جان نہیں پائے، اور شائد تم نے کبھی جاننے کی کوشش بھی نہیں کی ہوگی، اگر وہ اب بھی خاموش رہتا تو تم کیا کر لیتے؟'' میاں جی نے نادر کو اپنے پاس بٹھا کر پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''میاں جی۔ آپ جو بھی بتانا چاہتے ہیں وہ مجھے بتائیں۔'' میاں جی کی بات سن کر صابر کے والد نے کہا اور پھر نادر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ اس کی طرف سے بے فکر رہیں۔ اب یہ کچھ نہیں بولے گا۔''

''میں بتانا یہ چاہ رہا تھا کہ صابر خود اپنی مرضی سے چل کر کرم دین کے پاس گیا تھا۔ وہ جنات کو قابو کرنے کے لیے اس سے عملیات سیکھنا چاہتا تھا۔ کرم دین محض اس کی بہادری کا امتحان لینے کے لیے اس رات اسے وہاں لے گیا تھا، قبرستان کے جس کونے سے صابر کی لاش ملی، وہاں رات کے سناٹے میں اسے محض لکڑی کا کیل ٹھونک کر واپس آنے کو کہا تھا، وہاں کیل ٹھونکتے ہوئے اندھیرے کی وجہ سے اس کی چادر بھی پھنس گئی اور جب وہ اٹھا تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی جن بھوت یا چڑیل نے اسے پیچھے سے پکڑ لیا ہے اور وہ ڈر کر وہیں گر پڑا اور یوں اس کی موت واقع ہوگئی۔ تب سے کرم دین اپنے دل پر یہ بوجھ لیے پھرتا رہا، کیونکہ سچ بتانے کا اس میں حوصلہ نہیں تھا۔''

میاں جی نے تمام تفصیل بیان کی تو مرحوم صابر کے والدین کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، جوان بیٹے کی موت کا زخم پھر سے تازہ ہو گیا تھا اور وہ روئے جا رہے تھے جبکہ نادر مسلسل کھا جانے والی نظروں سے کرم دین کو گھور رہا تھا، کچھ دیر تک صابر کے والدین آنسو بہاتے رہے، پھر خاموشی سے اٹھ کر وہاں سے چل دیے، نادر بھی ان کے ساتھ ساتھ ہو لیا تھا، مگر میاں جی نے جان بوجھ کر انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''میں جاؤں میاں جی؟'' کچھ دیر بعد کرم دین نے اجازت طلب کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔ اب تم بھی جا کر آرام کرو۔ پریشان نہیں ہونا، سچ کی راہ پر چلتے ہوئے اس طرح کی مشکلات پیش آجایا کرتی ہیں لیکن پریشانیوں سے گھبرا کر کبھی حق کی راہ مت چھوڑنا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ساری رکاوٹیں خود بخود دور ہوتی چلی جاتی ہیں۔''

کرم دین نے میاں جی کی بات توجہ سے سنی اور پھر کچھ کہے بغیر گردن ہلا کر خاموشی سے وہاں سے نکل گیا۔

گھر پہنچ کر کرم دین بہت رویا، اسے اپنے آنسوؤں پر کوئی قابو نہیں رہا تھا، وہ رونا نہیں چاہتا تھا مگر آنسو خود بخود اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے، وقت نے اسے اس قدر تنہا کر ڈالا تھا کہ کوئی اسے چپ کروانے اور آنسو صاف کرنے والا بھی نہیں رہا تھا، رات اسی کیفیت میں کٹ گئی تھی اور مسجدوں سے فجر کی اذان کی آوازیں آنے لگی تھیں، اذان کی آواز سن کر کرم دین نماز کے لیے تیاری کرنے لگا، وہ مسجد کے لیے گھر سے نکلنے والا تھا کہ کوئی دروازے کو پیٹنے لگا، اس نے دروازہ کھولا تو وہاں پولیس کی وردی پہنے کچھ اہل کار کھڑے تھے، نادر بھی ان کے ہمراہ تھا، پولیس کے ساتھ نادر کو کھڑا دیکھ کر ساری بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔

''ہم تمہیں صابر کے قتل کے جرم میں گرفتار کرنے آئے ہیں۔'' ایک پولیس اہل کار کی آواز کرم دین کے کانوں میں پڑی۔

''اگر اجازت ہو تو میں نماز پڑھ لوں؟''

''نماز اب تھانے میں ہی پڑھنا۔''

''میں دروازے پر لگانے کے لیے اندر سے تالا لے آؤں۔''

''تم اس کے ساتھ جاؤ۔ یہ کہیں بھاگ ہی نہ جائے۔'' حوالدار نے ایک سپاہی سے مخاطب ہو کر کہا۔

حوالدار کا حکم سن کر وہ سپاہی کرم دین کے ساتھ ہو لیا، کرم دین نے اندر کے دروازوں کی کنڈیاں لگا کر ان پر تالے لگائے، تمام بلب بند کیے اور دروازے پر لگانے والا تالا لے کر باہر آگیا، تب تک وہاں کچھ محلے دار بھی جمع ہو گئے تھے اور بڑے شوق سے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔

کرم دین کو فجر کی نماز کے وقت مسجد میں نہ پا کر میاں جی کو تشویش ہوئی تھی مگر انہوں نے کسی نمازی سے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی تھی

،میاں جی جانتے تھے کہ کرم دین ظہر اور عصر کی نمازیں فیکٹری ہی میں ادا کرتا تھا جبکہ دوسری نمازیں باجماعت ادا کرنے وہ باقاعدگی سے مسجد میں ہی آتا تھا، انہیں اس بات کا بخوبی علم تھا کہ جب سے کرم دین نے نماز ادا کرنا شروع کی تھی، تب سے اس نے کبھی کوئی نماز قضا نہیں کی تھی ،یہی سوچ کر ان کی تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔

نماز سے فارغ ہو کر تمام نمازی اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے اور قرآن پاک پڑھنے کے لیے میاں جی کے پاس آنے والے بچے اپنا اپنا سبق یاد کر رہے تھے، میاں جی کو کرم دین کی فکر لگی ہوئی تھی، آخر ان سے رہا نہ گیا اور انہوں نے ایک لڑکے کو بلا کر کرم دین کے بارے میں جاننے کے لیے اس کے گھر بھیج دیا، وہ لڑکا تھوڑی ہی دیر میں واپس آ گیا اور آ کر اطلاع دی کہ اس کے گھر پر تالا لگا ہوا ہے۔

یہ بات اور بھی پریشان کر دینے والی تھی کہ رات کو عشاء کی نماز کے بعد بھی وہ دیر تک ان کے پاس تھا پھر وہ صبح صبح کہاں چلا گیا تھا، دن چڑھ آیا تھا، قرآن پاک پڑھنے کے لیے آئے ہوئے بچے بھی اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہونے لگے تھے، میاں جی نے دو تین لڑکوں کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ کسی طرح کرم دین کے متعلق معلومات حاصل کر کے آئیں۔

لڑکوں نے واپس آنے میں کافی دیر لگا دی تھی، ان کی واپسی تک میاں جی مسجد میں ہی بیٹھے انتظار کرتے رہے، یہ بات میاں جی کے لیے انتہائی تکلیف دہ تھی کہ پولیس قتل کے الزام میں کرم دین کو گرفتار کر کے تھانے لے گئی تھی۔

☆☆☆☆☆☆

کرم دین نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ زندگی میں کبھی اسے اس طرح کے حالات سے گزرنا پڑے گا مگر تھوڑے ہی عرصے میں اس نے میاں جی سے ہر حال میں خدا کی رضا جان کر صبر اور شکر ادا کرنا سیکھ لیا تھا، اسے قتل کے جرم میں سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا گیا تھا مگر وہ اسے بھی خدا کی رضا جان کر سکون سے ایک طرف بیٹھا خدا کو یاد کر رہا تھا، وہ خدا جو اس کی تمام تر نافرمانیوں کے باوجود اسے بھولا نہیں تھا۔

میاں جی کو اس قدر دکھ پہنچا تھا کہ انہیں گھر میں بیٹھنا مشکل ہو گیا، وہ صورت حال جاننے اور کرم دین کو تسلی دینے کے لیے خود تھانے پہنچ گئے، ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ کسی وجہ سے میاں جی خود چل کر تھانے آئے تھے، علاقے کے سبھی لوگ آل رسول ﷺ میں سے ہونے کی وجہ سے انہیں جانتے تھے اور ان کی دل سے قدر کرتے تھے، تھانیدار سے لے کر سپاہیوں تک سارا عملہ ان کے آگے بچھا جا رہا تھا۔

تھانیدار نے انتہائی احترام کے ساتھ انہیں اپنے سامنے والی کرسی پر بٹھایا اور خود ان کے سامنے باادب کھڑا ہو کر بولا۔

''مجھے بلا لیا ہوتا میاں جی! آپ نے یہاں آنے کی تکلیف کیوں کی؟''

''کبھی کبھی ایسے حالات بھی پیدا ہو جاتے ہیں برخوردار کہ خود آئے بغیر گزارہ نہیں ہوتا۔''

''آپ حکم کریں میاں جی! آپ کی خدمت کے لیے تو ہم جی جان سے حاضر ہیں۔''

''میں یہاں کرم دین کے لیے آیا ہوں۔''

''اوئے سنا نہیں تم نے' جلدی سے کرم دین کو یہاں لے آؤ۔'' تھانیدار نے پاس کھڑے سپاہی کو رعب سے حکم دیا، سپاہی نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور کرم دین کو لے آیا، کرم دین سلاخوں کے پیچھے سکون سے بیٹھا تسبیح کر رہا تھا، کوئی فکر اور پریشانی اس کے چہرے پر دکھائی نہیں دے رہی تھی مگر اس نے میاں جی کو دیکھا تو بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

میاں جی اٹھ کھڑے ہوئے اور اسے اپنے سینے سے لگا کر پیار سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے تسلی دینے لگے ''تم ابھی سے گھبرا گئے کرم دین۔ سچ کی راہ پر چل پڑے ہو تو ہمت رکھو۔ اس راہ پر چلتے ہوئے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، مگر جن کے حوصلے بلند ہوتے ہیں۔ کامیابی ہمیشہ انہیں کے حصے میں آتی ہے۔''

میاں جی کے سمجھانے سے کرم دین کی ہمت بندھ گئی تھی، اس لیے اس نے اپنے آنسوؤں کو صاف کیا اور سکون سے میاں جی کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''برخوردار! تم مقتول صابر کے ورثاء کو بھی یہیں بلا لو تا کہ آمنے سامنے بیٹھ کر بات ہو سکے۔'' میاں جی نے تھانیدار کو دیکھتے ہوئے کہا، جو ابھی تک میاں جی کے احترام میں ان کے سامنے باادب کھڑا تھا اور میاں جی کے کہنے پر بھی اپنی کرسی پر نہیں بیٹھا تھا۔

''میاں جی! آپ گھر چلیں' میں تھوڑی ہی دیر میں ان سب کو لے کر وہیں حاضر ہو جاؤں گا' آپ چاہیں تو کرم دین کو بھی اپنے ساتھ لے جائیں۔'' تھانیدار نے بات کی۔

''یہ بات تھانے میں ہی ہوتو اچھا ہے۔ ویسے بھی میں وہاں محلے میں اس بات کا تماشہ نہیں بنانا چاہتا۔''

''جیسے آپ کی خوشی، میاں جی!''

تھانیدار کے حکم پر ایک اے ایس آئی اور دو سپاہی گئے اور کچھ ہی دیر بعد نادر اور اس کے والد، نزیر کو تھانے میں لے آئے، ان دونوں نے تھانیدار کے کمرے میں کرم دین کے ساتھ میاں جی کو دیکھا تو پریشان ہوئے بغیر نہ رہ سکے مگر انہوں نے کوئی بات نہ کی اور خاموشی سے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

''میں نے رات کو تم لوگوں کو اپنے پاس بلا کر کس قدر پیار سے سمجھایا تھا مگر شاید تمہیں میری باتیں اچھی نہیں لگیں۔'' میاں جی نے نادر اور اس کے والد کو دیکھ کر بات کی۔

''جن کا قتل ہوا ہو وہ خاموشی سے تو نہیں بیٹھ سکتے میاں جی!'' نادر بول پڑا۔

''تم کیا کہتے ہو نزیر؟''

''ہم نے مل جل کر ہی عدالت میں جانے کا فیصلہ کیا ہے۔''

نزیر کی بات سن کر میاں جی، نادر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے ''یہ تو گرم خون ہے، مگر تم نے تو دنیا دیکھی ہے۔ کرم دین کو عدالت میں گھسیٹ کر تمہیں کیا حاصل ہوگا؟''

''میرا بیٹا قتل ہوا ہے میاں جی! اس کے قاتل کو سزا ملنی ہی چاہیے اور میں اسے عدالت سے سزا ضرور دلواؤں گا۔''

''اگر تمہارا بیٹا کرم دین کے ہاتھوں قتل ہوا ہوتا تو یقین کرو۔ میں کبھی تمہیں عدالت جانے سے نہ روکتا، لیکن جن حالات میں تمہارے بیٹے کی جان گئی..... وہ اور تھے..... اور پھر تم خود ہی سوچو..... اگر کرم دین اب بھی خاموش رہتا تو کیا تم کبھی یہ بھی جان سکتے تھے کہ تمہارا بیٹا قبرستان میں کیوں گیا تھا۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو، اگر کسی طرح کرم دین کو عدالت سزا سنا بھی دیتی ہے تو تمہیں کیا حاصل ہوگا؟''

''اگر اسے سزا ہو جاتی ہے تو مجھے دلی تسلی ہوگی''

''ایک راستہ معاف کر دینے والا بھی ہے۔''

''ہم اسے کسی صورت معاف نہیں کریں گے۔''

''معاف کر دینے والوں کو خدا بھی پسند کرتا ہے''

''میں جانتا ہوں میاں جی..... مگر معاف کر دینا اتنا بھی آسان نہیں اور ویسے بھی معاف کر دینے کا حوصلہ مجھ میں نہیں۔''

''میرا کام تمہیں سمجھانا تھا نزیر۔ مجھے محض انسانیت کے ناطے کرم دین سے ہمدردی ہے۔ عدالت کا کسی مجرم کو اس کے کسی جرم کی سزا دینے کا مقصد بھی اسے یہ احساس دلانا ہوتا ہے کہ اس نے جو کیا وہ غلط تھا اور کرم دین کو تو پہلے ہی اپنی سبھی غلطیوں کا احساس ہو چکا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ پچھتاوے کی آگ میں جل کر وہ جس راہ پر چل نکلا ہے۔ وہ اس راہ سے ہٹ جائے۔''

''چل اٹھ ابا! بہت باتیں سن لیں۔ اب باقی کی باتیں عدالت میں ہی ہوں گی۔'' نادر نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے غصے میں کہا۔

''زیادہ جذبات میں نہ آؤ۔ کچھ ہوش سے کام لو۔ میاں جی کی بات تو خدا بھی نہیں ٹالتا۔ ہم تم کیا چیز ہیں؟'' نادر کی بات سن کر تھانیدار نے سمجھانے کے لیے بات کی۔

''میاں جی کی ہم بھی بہت عزت کرتے ہیں، لیکن عدالت میں جانا ہماری مجبوری بھی ہے اور حق بھی۔'' نادر نے بات کی اور کوئی جواب سنے بغیر باہر کی طرف چل پڑا، نزیر بھی خاموشی سے اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا تھا، تھانیدار انہیں روکنا چاہتا تھا مگر میاں جی نے اسے ہاتھ کے اشارے سے ایسا کرنے سے منع کر دیا۔

باپ بیٹا وہاں سے چلے گئے تھے، کمرے میں کچھ دیر تک مکمل خاموشی چھائی رہی، میاں جی گردن جھکائے بیٹھے تھے، تھانیدار اور کرم دین انہیں دیکھ رہے تھے، کچھ دیر یہی کیفیت رہی پھر میاں جی اٹھ کھڑے ہوئے، انہیں اٹھتے دیکھ کر کرم دین نے بھی کرسی چھوڑ دی۔

''لو بھئی برخوردار! تم اپنے مہمان کو سنبھالو میں چلتا ہوں۔'' میاں جی نے تھانیدار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر کرم دین کو سینے سے لگاتے ہوئے بولے ''تم ہمت نہیں ہارنا اور نہ کسی حال میں خدا کو بھولنا۔ بس اوپر والے پر بھروسہ رکھنا کیونکہ جو وہ کرتا ہے وہی صحیح ہوتا ہے۔''

میاں جی نے کرم دین کو سینے سے لگایا تو اس کی آنکھوں سے یہ سوچ کر آنسو بہہ نکلے تھے کہ میاں جی جیسی بزرگ ہستی اس گناہ گار کے لیے

اس قدر ہمدردانہ رویہ رکھتی ہے، اس نے کوئی بات نہیں کی تھی مگر تھانیدار بول پڑا ''میاں جی آپ چاہیں تو اسے اپنے ساتھ لے جائیں۔ میں سب کچھ خود ہی سنبھال لوں گا''

''نہیں برخوردار! میں کسی بھی طرح اپنی حیثیت کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہتا تم نے مجھے اتنی عزت دی، خدا تمہیں خوش رکھے۔'' میاں جی نے اداس لہجے میں بات کی اور بوجھل قدموں کے ساتھ وہاں سے چل پڑے۔

☆☆☆☆☆

صابر کے قتل کے جرم میں کرم دین کے گرفتار کیے جانے کی خبر اب چھپی نہیں رہی تھی، گھر گھر اسی موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی، نادر اور نزیر، کرم دین کو عدالت میں گھسیٹ کر لے جانے کے لیے غصے میں بھرے تھانے سے گھر لوٹے تھے، اس پر لوگوں کے مشوروں نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا، جو بھی آیا تھا اس نے یہی کہا تھا کہ وہ ہر حال میں عدالت سے کرم دین کو سزا دلوائیں، وہ تو پہلے سے ہی یہی پروگرام بنائے بیٹھے تھے، اب ان کے ارادوں میں اور بھی مضبوطی آ گئی تھی۔

میاں جی کے جانے کے بعد تھانیدار دیر تک تنہا بیٹھا تمام پہلوؤں پر غور کرتا رہا تھا، وہ ڈیوٹی سے فارغ ہو کر گھر پہنچا اور یونیفارم تبدیل کر کے بے دلی سے کھانا کھا کر لیٹ گیا تھا مگر اسے عجیب سی بے چینی گھیرے ہوئے تھی، اس نے گاڑی کی چابی اٹھائی اور گیراج میں کھڑی گاڑی میں بیٹھ کر گھر سے نکل گیا۔

تمام اہل خانہ کھانا کھانے کے بعد سکون سے سو رہے تھے، جب دروازے پر لگی گھنٹی بج اٹھی تھی، گھنٹی بجنے پر سب کی آنکھ کھل گئی تھی، نادر نے دروازہ کھولا تھا۔

''تھانیدار صاحب! آپ اور اس وقت یہاں؟'' دروازے پر کھڑے تھانیدار کو دیکھتے ہی نادر نے سوال کیا۔

''تم ڈرائینگ روم کا دروازہ کھولو۔ اندر بیٹھ کر بات کرتے ہیں'' تھانیدار نے کہا۔

تھانیدار کے کہنے پر نادر نے خاموشی سے ڈرائینگ روم کا دروازہ کھول دیا، دروازہ کھلنے پر تھانیدار کے ڈرائینگ روم میں داخل ہونے تک نزیر بھی وہیں آ گیا تھا۔

''اچھا ہوا تم بھی آ گئے۔ ورنہ میں نے خود بھی تمہیں بلوانا ہی تھا'' نزیر پر نظر پڑتے ہی تھانیدار نے بات کی۔

''خیر تو ہے ناں۔ تھانیدار صاحب'' نزیر نے ڈرتے ڈرتے دریافت کیا۔

''خیر ہوتی تو میں اس وقت سول کپڑوں میں یہاں کیوں آتا؟''

''کیا ہوا تھانیدار صاحب؟''

''ابھی تک تو کچھ نہیں ہوا۔ لیکن تم عدالت چلے گئے تو پھر بہت کچھ ہو سکتا ہے''

''عدالت تو ہم جائیں گے ہی تھانیدار صاحب''

''کیا ہو گا عدالت میں جا کر؟''

''ہمیں انصاف ملے گا''

''نہ تمہارے پاس گواہ، نہ کوئی ثبوت۔ عدالتوں کے چکر کاٹتے رہ جاؤ گے اور حاصل کچھ نہیں ہو گا''

''کیا آپ ہمیں ڈرانے آئے ہیں؟''

''نہیں میں ڈرانے نہیں آیا میں تو بس تمہیں یہ بتانے آیا ہوں کہ جس شخص کے لیے میاں جی جیسی بزرگ ہستی خود چل کر پہلی بار تھانے آئی ،اسے عدالت میں مت گھسیٹو۔ اور پھر ذرا سوچو تو سہی تمہارے گھر میں دو وقت کی روٹی تو بمشکل پوری ہو پاتی ہے، کیس کے لیے وکیلوں کی فیسیں کہاں سے دے پاؤ گے۔ میری ایک بات اور یاد رکھنا، اگر کرم دین تمہارے بیٹے کا قاتل ہوتا تو میں کبھی بھی تمہیں عدالت جانے سے نہ روکتا۔ میرا کام تمہیں سمجھانا تھا، اب فیصلہ تمہیں کرنا ہے، کرم دین کو معاف کر کے میاں جی کی دعائیں لینی ہیں یا اسے عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کرنا ہے'' بات کرتے ہی ان کا جواب سنے بغیر تھانیدار اٹھ کھڑا ہوا تھا اور پھر ان سے ہاتھ ملانے کے بعد وہاں سے نکل گیا۔

تھانیدار کے جانے کے بعد ان دونوں نے دروازہ بند کیا اور خاموشی سے اپنی اپنی چارپائیوں پر جا لیٹے، تھانیدار کے آنے سے قبل وہ سکون سے سو رہے تھے مگر تھانیدار نے ان دونوں کی نیند اڑا کر رکھ دی تھی، وہ دونوں ہی بار بار کروٹیں بدل رہے تھے، اپنے اپنے بستروں پر جانے سے

پہلے وہ انصاف کے لیے عدالت جانے کا فیصلہ کر کے سوئے تھے مگر تھانے دار نے انہیں سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''تھانیدار نے تو ہمیں مشکل میں ہی ڈال دیا ہے'' نزیر نے صبح ناشتے کے وقت اپنی بیوی اور بیٹے کی موجودگی میں بات کی۔

''کیسی مشکل ابا جی! تھانیدار کچھ بھی کہتا رہے، ہم نے عدالت میں جانا ہے اور جا کر ہی رہیں گے'' نادر نے تلخ لہجے میں کہا۔

''تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔''

''ہاں۔ میرا دماغ خراب ہو گیا ہے''

''تو جاؤ پھر وکیلوں کو فیس دو اور اکیلے ہی عدالتوں کے چکر کاٹو۔'' نزیر نے انتہائی غصے کے عالم میں بات کی۔

''اگر ہم اس طرح پیچھے ہٹ گئے تو لوگ کیا کہیں گے؟''

''لوگوں کا کیا ہے۔ لوگ تو تماشہ دیکھتے ہیں..... اور پھر یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے ہم جیسے چاہیں کریں، لوگوں کو اس سے کیا''

''اس گھر میں تو بات کرنا ہی فضول ہے۔'' نادر نے تلخ لہجے میں کہا اور غصے کی حالت میں دروازے کو زور سے بند کر کے باہر نکل گیا۔

☆☆☆☆☆

پولیس نے جب کرم دین کو گرفتار کر کیا تھا تو وہ سر پر ٹوپی لیے اور ہاتھ میں تسبیح پکڑے نماز ادا کرنے کے لیے گھر سے نکلنے والا تھا، اس وقت کرم دین کے کہنے پر بھی انہوں نے اسے نماز ادا کرنے کی اجازت نہیں دی تھی، مگر جب سے میاں جی تھانے سے ہو کر گئے تھے، تھانے کا عملہ ہر طرح سے کرم دین کے ساتھ بھرپور تعاون کر رہا تھا، اسے نماز ادا کرنے کے لیے حوالات میں ہی جائے نماز دے دی گئی تھی، اس نے تمام نمازیں باقاعدگی سے ادا کی تھیں اور پھر رات کو عشاء کی نماز کے بعد تسبیح لے کر ذکر خدا میں لگ گیا تھا، اسے ایسا کرنے سے اس قدر سکون مل رہا تھا کہ اسے پتہ بھی نہ چلا کب اس کی آنکھ لگ گئی، صبح جب اسے ڈیوٹی پر موجود سپاہی نے نماز ادا کرنے کے لیے جگایا تو اس کی آنکھ کھلی۔

☆☆☆☆☆

دن بھر نزیر اور نادر میں کئی بار گرما گرم بحث ہو چکی تھی، نادر کسی بھی طرح اس بات کے لیے راضی نہیں ہو رہا تھا کہ کرم دین کو عدالت میں لے جانے کی بجائے معاف کر دیا جائے، نزیر نے تھک ہار کر نادر کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے، مگر پھر اچانک نادر کے ذہن میں جانے کیا بات آئی کہ اس نے باپ کی ہاں میں ہاں ملا دی۔

وہ دونوں باہمی مشورے سے میاں جی کے پاس آئے تھے اور انہیں کرم دین کو معاف کر دینے اور اس پر مقدمہ نہ کرنے کے بارے میں بتایا تھا۔

''مجھے خوشی ہے کہ تم دونوں نے باہمی رضامندی سے درست فیصلہ کیا ہے'' نزیر اور نادر کے منہ سے کرم دین کو معاف کر دینے کی بات سن کر میاں جی نے بات کی اور پھر بولے ''میں جانتا ہوں، جن کا بیٹا قتل ہو جائے ان کے دل پر کیا گزرتی ہے..... اسی لیے تو اسلام مقتول کے ورثاء کو بدلہ لینے کا پورا پورا حق دیتا ہے، صابر کے معاملے میں بھی اگر ایسا کچھ ہوتا تو میں تمہیں کبھی بھی انصاف کے حصول سے نہ روکتا، لیکن یہ تو تم بھی جان ہی گئے ہو کہ اس قتل میں کرم دین کا کتنا ہاتھ ہے''

''جو کچھ بھی ہوا میاں جی! ہم اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے۔ بس ہم نے کرم دین کو دل سے معاف کیا''

''بدلہ لینے کی طاقت رکھتے ہوئے بھی معاف کر دینے والے کو خدا اور اس کا رسول ﷺ بھی پسند کرتے ہیں اور خدا تمہیں بھی اس کا اجر ضرور دے گا..... اب تم تھانے میں جا کر انہیں کرم دین کو معاف کر دینے کے بارے میں تحریری بیان دے دو تا کہ وہ کرم دین کو حوالات سے نکال دیں'' میاں جی نے انتہائی نرم لہجے میں پیار سے انہیں سمجھایا۔

باپ، بیٹا میاں جی کی بات سن کر اٹھ کھڑے ہوئے اور وہاں سے نکل کر سیدھے تھانے پہنچ گئے، پھر ان کے تحریری بیان کے فوراً بعد کرم دین کو حوالات سے آزاد کر دیا گیا۔

☆☆☆☆☆

وہ حوالات سے نکل کر سیدھا میاں جی کے پاس گیا تھا، میاں جی نے اسے دیکھتے ہی پیار سے اپنے سینے سے لگا لیا تھا مگر وہ ان کے سینے سے لگ کر رونے لگا تھا۔

''اب کیوں روتے ہو؟ اب تو تمہارے دل کے سارے بوجھ ایک ایک کر کے ختم ہو گئے ہیں، اب تو تمہیں سکون کی گھڑیاں نصیب ہوں گی'' میاں جی نے کرم دین کو روتے ہوئے دیکھ کر بچوں کی طرح سمجھایا۔

''میاں جی میں تو یہ سوچ کر رو رہا ہوں کہ اگر میری زندگی میں آپ نہ آتے تو میں نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتا پھرتا، آپ نے قدم قدم پر نہ صرف میری رہنمائی کی بلکہ میرا بھرپور ساتھ دیا''

''کرم دین میری ایک بات یاد رکھنا،، کوئی کسی کے لیے کچھ نہیں کرتا، ہم جو کچھ بھی کرتے ہیں، یہ سب خدا کی مرضی سے ہو رہا ہوتا ہے۔ بس اب تم رونا دھونا بند کرو اور گھر جا کر آرام کرو'' میاں جی نے کرم دین کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

میاں جی کی بات سن کر کرم دین خاموشی سے وہاں سے چل پڑا اور گھر آ کر چارپائی پر لیٹ گیا، چارپائی پر لیٹتے ہی یہ سوچ کر اس کا دل بھر آیا تھا کہ وہ دو دن حوالات میں گزار کر آیا تھا مگر محلے میں سے کسی نے بھی آ کر اس کا حال تک نہیں پوچھا تھا، اسی لمحے میاں جی کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے ''جب کبھی کوئی پریشانی تمہیں آ گھیرے تو خدا کو یاد کیا کرو، اور ہر حال میں اس کا شکر ادا کرتے رہا کرو''۔ یہ خیال آتے ہی اس نے تسبیح ہاتھ میں لے لی اور ذکر خدا میں لگ گیا، تھوڑی ہی دیر میں اس کی آنکھ لگ گئی تھی اور تسبیح اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اس کے سینے پر گر گئی تھی۔

وہ رات بھر سکون سے سویا رہا تھا، روز کی طرح فجر کی اذان کے ساتھ ہی اس کی آنکھ کھل گئی تھی، اس نے مسجد میں باجماعت نماز ادا کی اور پھر گھر واپس آ کر تلاوت کلام پاک سے فارغ ہو کر چارپائی پر بیٹھ گیا، یہ وقت اس کے ڈیوٹی پر جانے کا تھا مگر اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا، وہ حوالات میں بند ہونے کی وجہ سے پچھلے دو دن سے فیکٹری نہیں گیا تھا، مگر اس روز بھی اس کا جسم اس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا اس لیے اس نے ایک اور چھٹی کرنے کا پروگرام بنا لیا تھا۔

وہ حوالات میں ٹھیک سے سو نہیں پایا تھا اس لیے ناشتے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد لیٹتے ہی اس کی پھر سے آنکھ لگ گئی تھی، دروازے پر دستک ہونے لگی تھی، دستک کی آواز سنتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا، اس نے دروازہ کھولا تو سامنے چاچی کھڑی تھی۔

''آؤ چاچی آؤ'' چاچی کو دروازے پر کھڑے دیکھ کر خوشی اور حیرانی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کرم دین نے کہا۔

''میں نے سوچا آج کرم دین کو ہی دیکھ آؤں'' چاچی نے برقعہ اتار کر ہاتھ میں پکڑ کر اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''شکر ہے چاچی! آج کسی کو میرا بھی خیال آیا''

''مجھے پتہ چلا تھا کہ تم تھانے سے واپس آ گئے ہو۔ اسی لیے تمہاری خیریت جاننے آئی ہوں''

''یہ تو تمہاری مہربانی ہے چاچی۔''

''مہربانی والی تو خیر کوئی بات نہیں لیکن گھر کی ویرانی دیکھ کر بہت تکلیف ہو رہی ہے''

''جب گھر والے ہی نہ رہیں تو گھر ویران ہی ہو جایا کرتے ہیں چاچی'' کرم دین نے اداس لہجے میں بات کی۔

''تم کسی طرح اپنے بچوں کو ہی لے آتے' گھر میں کچھ تو رونق رہتی''

چاچی کی بات سن کر کرم دین نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بولا ''ایک بار گیا تھا چاچی لیکن انہوں نے مجھے ایسے دھتکار دیا جیسے کوئی کسی بھکاری کو دھتکارتا ہے پھر اس کے بعد کبھی وہاں جانے کا حوصلہ نہیں ہوا''

''انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آخر تم داماد تھے ان کے''

''جب ان کی بیٹی ہی نہ رہی تو پھر کیسا داماد اور ویسے بھی میں نے ان کی بیٹی کو کون سے سکھ دیے تھے جو وہ داماد کا خیال کرتے''

''تم دوسری شادی کر لو''

''نہیں چاچی اب نہیں''

''کیوں اب کیا ہوا؟''

''اب ہر کوئی عائشہ جیسی تو ہو نہیں سکتی۔ وہ بس ایک ہی تھی جو خدا نے میرے نصیب میں لکھی تھی، مگر میں ہی اس کی قدر نہ کر سکا۔ دراصل ہمیں ناشکری کی عادت پڑ چکی ہے۔ جب ہم سے کوئی نعمت چھن جاتی ہے، تب ہمیں اس نعمت کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے' مگر جو نعمت ایک بار چھن جائے وہ دوبارہ کہاں ملا کرتی ہے چاچی''

''میں تو تمہارے بھلے کے لیے کہہ رہی تھی۔ باقی جیسے تمہاری خوشی'' چاچی نے بات کی اور برقعہ سنبھالتے ہوئے جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''چاچی آج تم آئی ہو تو مجھے بہت اچھا لگا۔ تم ہماری بڑی ہو، بس اپنی دعاؤں میں یاد رکھا کرو''

''اللہ خیر کرے گا'' چاچی نے کہا اور چل دی۔

☆☆☆☆☆

کرم دین تین روز بعد فیکٹری آیا تھا، وہ اس بات سے خوف زدہ تھا کہ اسے فیکٹری مینیجر کی باتیں سننا پڑیں گی، وہ ڈرتے ڈرتے اپنی ڈیوٹی پر جا کھڑا ہوا تھا، لیکن وہ اس بات پر حیران تھا کہ مینیجر تو کیا اس کے سپروائزر نے بھی اسے تین دن تک غیر حاضر رہنے کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا، کرم دین اس بات سے بے خبر تھا کہ میاں جی نے فیکٹری کے مالک کو فون پر تمام تفصیلات سے آگاہ کر دیا تھا اور اسے تاکید بھی کر دی تھی کہ وہ ڈیوٹی پر واپس آئے تو اس سے کسی قسم کی پوچھ گچھ نہ کی جائے۔

رفتہ رفتہ حالات پھر سے معمول پر آنے لگے تھے، کرم دین نے خود کو گھر سے فیکٹری، فیکٹری سے گھر اور گھر سے مسجد تک محدود کر لیا تھا، وہ فیکٹری میں ہوتا تو پورا وقت جی جان لگا کر محنت سے کام کرتا، ہر روز ظہر، عصر اور کبھی کبھار مغرب کی نمازیں اسے فیکٹری میں ہی ادا کرنا پڑتیں، جیسے ہی اذان کی آواز اس کے کانوں میں پڑتی، وہ وہیں کام چھوڑ دیتا اور جلدی سے وضو کر کے نماز پڑھنے لگتا اور نماز سے فارغ ہوتے ہی پھر سے کام پر آ کھڑا ہوتا، فیکٹری کا مالک یہ دیکھ کر حیران ہوتا کہ ڈیوٹی کے دوران نمازیں ادا کرنے کے لیے کرم دین کا جتنا وقت لگتا تھا وہ چھٹی کے بعد باقاعدگی سے اتنے ہی وقت کے لیے کام کرتا رہتا تھا۔

اسے ایسا کرتے دیکھ کر فیکٹری کے مالک نے مینیجر کے ذریعے کہلوایا تھا ''اس کا جو وقت نماز کے لیے لگتا ہے وہ پورا کرنے کے لیے اسے دیر تک کام کرنے کی ضرورت نہیں'' لیکن اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا ''میں نماز خدا کے لیے پڑھتا ہوں اور نہیں چاہتا کہ کسی کے دل میں کبھی یہ خیال آئے کہ وہ فیکٹری کے اس وقت میں نماز ادا کرتا ہے جس کے لیے اسے اجرت دی جاتی ہے، اس لیے میں بخوشی ایسا کرتا ہوں تاکہ میرے ذہن پر کوئی بوجھ نہ رہے''۔

جب سے کرم دین نے میاں جی کو حقوق اللہ اور حقوق العباد کے بارے میں یہ کہتے سنا تھا ''خدا غفور الرحیم ہے وہ اپنے حقوق تو معاف کر دے گا لیکن بندوں کے حقوق کبھی معاف نہیں کرے گا''، تب سے کرم دین حقوق اللہ کے ساتھ ساتھ حقوق العباد پر بھی خصوصی توجہ دینے لگا تھا، وہ تنہا زندگی بسر کر رہا تھا، اس پر کوئی اضافی ذمہ داریاں بھی نہ تھیں، اس لیے ہر ماہ فیکٹری سے ملنے والی تنخواہ میں سے اخراجات کے بعد ایک معقول رقم بچ جاتی تھی، جس سے وہ چپکے سے کسی نہ کسی ضرورت مند کی ضرورت پوری کر دیتا تھا، ایسا کرتے ہوئے وہ جس قدر خوشی اور سکون محسوس کر رہا ہوتا تھا، ایسے لمحات اس سے پہلے زندگی میں کبھی اسے میسر نہیں آئے تھے۔

بچپن میں ایک بار قرآن مجید پڑھنے کے بعد کرم دین نے ایک مدت تک قرآن پاک کو کبھی کھول کر بھی نہیں دیکھا تھا، پھر میاں جی کی صحبت سے اسے قرآن پاک کی تلاوت کا اس قدر شوق ہوا کہ وہ ہر روز جب تک تلاوت نہ کر لیتا اسے سکون نہیں آتا تھا، لیکن قرآن پاک کی تلاوت کے دوران اسے بار بار یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ جو کچھ پڑھ رہا ہے اسے زیادہ نہیں تو کم از کم اس کا مفہوم و ترجمہ تو معلوم ہونا چاہیے، تاکہ اسے پڑھتے ہوئے یہ تو پتہ چلے کہ وہ جو کچھ پڑھ رہا ہے اس میں کیا بیان کیا جا رہا ہے، اسی لیے وہ میاں جی سے قرآن پاک کے ترجمہ و تفسیر کا درس لینے لگا تھا، وہ جیسے جیسے قرآن مجید کو سمجھتا جاتا تھا، اسے اپنی گزری ہوئی زندگی سے گھن آنے لگتی تھی اور وہ رات کی تنہائی میں سجدے میں سر رکھے گڑگڑا کر خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتا رہتا تھا۔

نماز کے بعد تمام نمازی مسجد سے چلے گئے تھے، جو دو چار رہ گئے تھے وہ بھی کچھ دیر میاں جی کے پاس بیٹھنے کے بعد ایک ایک کر کے اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے، اب مسجد میں کرم دین اور میاں جی رہ گئے تھے، اسے بیٹھے دیکھ کر میاں جی جان گئے تھے کہ اس نے ضرور کوئی نہ کوئی بات کرنا ہو گی، کیونکہ وہ کرم دین کی اس عادت سے بخوبی آگاہ تھے کہ جب بھی اس نے کوئی بات کرنا ہوتی وہ اسی طرح تمام نمازیوں کے جانے کا انتظار کرتا اور پھر جب سب نمازی وہاں سے چلے جاتے تو وہ بات کرتا تھا۔

''کیا بات ہے کرم دین کچھ کہنا چاہ رہے ہو؟'' کرم دین کو پاس بیٹھے دیکھ کر میاں جی نے سوال کیا۔

''جی میاں جی''

''کہو کیا کہنا ہے۔'' میاں نے جی نے پیار سے دریافت کیا۔

''میاں جی! عرصے سے ایک خواہش میرے دل میں پل رہی تھی اور میں اس کے لیے کچھ نہ کچھ کوشش بھی کرتا رہا ہوں اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کو بتاؤں؟''

''جو کہنا چاہتے ہو کہو کرم دین''

''میاں جی۔ میں حج کے لیے جانا چاہ رہا ہوں''
''ماشاءاللہ..... ماشاءاللہ..... یہ تو بہت خوشی کی بات ہے''
''اگر آپ اجازت دیں تو میں حج کے لیے درخواست دے دوں''
''یہ تو بہت بڑی نیکی اور سعادت کا کام ہے۔ اگر تمہارے پاس وسائل ہیں تو ضرور جاؤ''
''میں نے تھوڑے تھوڑے کر کے حج کی نیت سے دو لاکھ روپے جمع کیے ہیں، ان دنوں درخواستیں بھی جمع ہو رہی ہیں، میں چاہ رہا ہوں کہ میں بھی درخواست جمع کروا دوں''
''نیکی کے کام میں دیر کیسی۔ بسم اللہ کرو اور درخواست جمع کروا دو۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں'' میاں جی نے شفقت بھرا ہاتھ کرم دین کی پیٹھ پر پھیرتے ہوئے کہا۔
میاں جی کی بات سنتے ہی کرم دین اٹھ کھڑا ہوا تھا، وہ اٹھا تو میاں جی بھی اٹھ گئے، پھر وہ دونوں ایک ساتھ مسجد سے باہر نکل آئے، کرم دین گھر پہنچا تو بہت خوش تھا، کبھی خوشی سے، کبھی یہ سوچ کر اس کی آنکھیں بار بار ڈبڈبا جاتی تھیں کہ وقت نے اسے اس قدر تنہا کر دیا تھا کہ کوئی بھی ایسا نہیں تھا جسے وہ اپنی خوشی میں شریک کر سکتا، ایک مدت کے بعد وہ رات بھر سو نہیں پایا تھا اور رات کروٹیں بدلتے ہوئے کٹ گئی تھی۔
کرم دین نے حج کی درخواست جمع کروانے کے لیے فیکٹری سے چھٹی لے رکھی تھی، اس کا خیال تھا کہ وہ سکون سے کسی قریبی بینک میں جا کر درخواست جمع کروا آئے گا، اس نے رات کو ہی دو لاکھ روپے گن کر حفاظت سے رکھ لیے تھے، وہ نکلنے ہی والا تھا کہ چاچی آ گئی، وہ خاموشی سے کرم دین کے پاس ہی چارپائی پر بیٹھ گئی تھی۔
''کیا بات ہے چاچی۔ آج تم کچھ پریشان دکھائی دے رہی ہو؟'' چاچی کو خاموش بیٹھے دیکھ کر کرم دین نے دریافت کیا۔
کرم دین کا سوال سن کر چاچی کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے تھے اور وہ کرم دین کی بات کا کوئی جواب نہیں دے پائی تھی۔
''خیر تو ہے ناں؟'' کرم دین نے چاچی کو روتے دیکھ کر سوال کیا۔
چاچی نے ہاتھ میں پکڑے اپنے برقعے سے آنسو صاف کیے اور بولی ''ان بے چاروں کا ایک بیٹا تو قبر میں جا سویا اور اب دوسرا بھی چارپائی پر پڑا موت کی راہ دیکھ رہا ہے۔''
''تم کس کی بات کر رہی ہو چاچی؟''
''میں نزیر کے بیٹے، نادر کی بات کر رہی ہوں ابھی ابھی میں انہیں کے ہاں سے آ رہی ہوں''
''اسے کیا ہوا؟'' کرم دین نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔
''وہ ایک عرصے سے گردوں کے مرض میں مبتلا تھا اور اس کا علاج بھی ہو رہا تھا، اب اس کے دونوں گردے کام کرنا چھوڑ گئے ہیں، نادر کے ماں باپ نے رو رو کر برا حال کر لیا ہے۔ صابر کے بعد نادر ہی ان کی اکلوتی اولاد ہے، اگر خدانخواستہ اسے بھی کچھ ہو گیا تو وہ بے اولاد ہو جائیں گے''
''کوئی راستہ تو ہو گا نادر کو بچانے کا؟''
''ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اگر کسی طرح اس کا ایک گردہ تبدیل کر دیا جائے تو اس کی جان بچ سکتی ہے''
''تو پھر وہ گردہ تبدیل کروا لیں''
''ان غریبوں کے گھر میں دو وقت کی روٹی تو پوری ہوتی نہیں۔ گردے کے لیے دو لاکھ روپے کہاں سے لائیں گے؟'' بات کرتے ہوئے ایک بار پھر چاچی کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے تھے، پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور آنکھوں میں آنسو لیے وہاں سے نکل گئی۔
چاچی کے آنسوؤں نے کرم دین کو بھی رلا دیا تھا، چاچی کے آنے سے پہلے وہ گھر سے نکلنے کے لیے تیار بیٹھا تھا مگر اس کی باتوں نے اسے پریشان کر ڈالا تھا اور وہ سوچنے لگا تھا کہ اگر خدانخواستہ نادر کو کچھ ہو گیا تو اس کے والدین تو بے موت مارے جائیں گے، وہ دیر تک بیٹھا سوچتا رہا پھر اٹھا اور رقم اور حج کی درخواست کے لیے ضروری کاغذات احتیاط سے جیب میں ڈال کر بینک جانے کے لیے گھر سے نکل پڑا۔
اسے بینک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی، وہاں حج کے لیے درخواستیں جمع کروانے والوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں، وہ بھی اپنا فارم پر کر کے قطار میں لگ گیا اور اپنی باری کا انتظار کرنے لگا، قطار میں کھڑے ایک بار پھر چاچی کی باتوں نے اسے آ گھیرا تھا، نادر کے متعلق سوچتے ہوئے اس کی عجیب سی کیفیت ہو گئی تھی، ایک ایک کر کے لوگ فارغ ہوتے جا رہے تھے اور وہ کھڑکی کے قریب ہوتا جا رہا تھا، اب اس سے آگے صرف

دوافراد رہ گئے تھے، ان کے بعد اس کی باری تھی لیکن وہ باری آنے سے پہلے ہی قطار سے باہر نکل آیا اور حج کے لیے درخواست جمع کروائے بغیر ہی گھر کی طرف واپس چل پڑا، گھر پہنچ کر اس نے پھر سے رقم سنبھال کر رکھ دی اور خود کو چارپائی پر گرا دیا۔

رات تک اس نے تمام کام نمٹائے تھے مگر اس کا ذہن مسلسل الجھا ہوا تھا، اس کے دل پر ایک بوجھ سا تھا جو کسی پل اسے چین سے بیٹھنے نہیں دے رہا تھا، جب ہر طرف اندھیرا پھیل گیا تو اس نے حج کے لیے رکھی ہوئی رقم اٹھائی اور گھر سے نکل پڑا، اب اس کے قدم نادر کے گھر کی طرف بڑھ رہے تھے، دستک دینے پر نزیر نے دروازہ کھولا تھا، وہ رات گئے کرم دین کو اپنے دروازے پر کھڑے دیکھ کر پریشان ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا، وہ ایک طرف ہٹ گیا اور خاموشی سے کرم دین کو اندر آنے کا راستہ دے دیا۔

''سنا ہے نادر کافی بیمار ہے؟'' کرم دین نے بیٹھتے ہی بلا تمہید بات کی۔

''ہاں۔'' نزیر نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا اور پھر بولا ''اس کے دونوں گردے خراب ہو گئے ہیں۔ بس اب وہ تھوڑے ہی عرصے کا مہمان ہے، اسی لیے تو اس کے سسرال والوں نے اس کی منگنی بھی توڑ ڈالی ہے'' نزیر نے بات کی اور بات کرتے ہوئے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

نزیر کو روتے دیکھ کر کرم دین کی آنکھوں میں بھی آنسو تیرنے لگے تھے، پھر اس نے خود کو سنبھالا اور بولا ''کوئی تو علاج ہو گا اس کا؟''

''اگر اس کا ایک گردہ بھی تبدیل کر دیا جائے تو اسے زندگی مل سکتی ہے مگر اتنے پیسے کہاں سے لائیں؟'' نزیر نے مسلسل روتے ہوئے کہا۔

''خدا کے گھر سے کبھی مایوس نہیں ہوا کرتے۔'' کرم دین نے حوصلے سے بات کی اور پھر جیب سے دو لاکھ روپے نکال کر نزیر کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے بولا ''یہ رکھ لیں۔ اور تسلی سے اس کا علاج کروائیں۔ خدا سب ٹھیک کر دے گا۔ بس ایک احسان مجھ پر ضرور کر دیجئے گا، اس رقم کے بارے میں کسی سے ذکر نہ کیجئے گا''

رقم نزیر کے ہاتھوں میں تھی، وہ بے یقینی کے عالم میں کبھی کرم دین کو دیکھنے لگتا اور کبھی ہاتھ میں پکڑے ہوئے نوٹوں پر نظر ڈالتا تھا، اس سے کوئی بات بھی نہیں ہو پا رہی تھی اور وہ آنسو بہائے جا رہا تھا۔

''صبر کریں اور حوصلے سے کام لیں اور باقی کے کام اوپر والے پر چھوڑ دیں، وہ جو کرتا ہے وہی ہمارے حق میں بہتر ہوتا ہے'' کرم دین نے نزیر کو تسلی دی اور خاموشی سے گھر واپس چل پڑا۔

☆☆☆☆☆

کرم دین، میاں جی کے پاس بیٹھا تھا، نزیر اور نادر بھی وہیں آ گئے، کرم دین نے ایک مدت کے بعد نادر کو دیکھا تھا، موت کے خوف نے اس کے جسم سے سارا خون نچوڑ ڈالا تھا اور وہ اس قدر کمزور ہو گیا تھا کہ پہچانا نہیں جا رہا تھا، سلام دعا کے بعد وہ دونوں میاں جی کے قریب ہو کر بیٹھ گئے تھے۔

''کیا بات ہے نادر! تم اس قدر بجھے ہوئے کیوں دکھائی دے رہے ہو؟'' میاں جی نے نادر کو دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔

''یہ بہت بیمار ہے میاں جی! اس کے گردوں کا آپریشن ہے، کل ہم اسے ہسپتال لے کر جا رہے ہیں۔ آپ کے پاس دعا کے لیے آئے تھے'' نادر کی بجائے نزیر نے جواب دیا۔

''اللہ شفاء دینے والا ہے۔ خدا کرے یہ جلد ٹھیک ہو کر گھر واپس آئے'' میاں جی نے دعا دی۔

''آمین..... آمین'' نزیر اور کرم دین نے ایک ساتھ کہا، نادر کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے اس لیے وہ کچھ بول نہیں پایا تھا۔

''اچھا میاں جی اجازت'' نزیر نے اٹھتے ہوئے کہا، نادر بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''ہمت سے کام لو اور خدا پر بھروسہ رکھو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا'' میاں جی نے نادر کو روتے ہوئے دیکھ کر اس کے سر پر پیار دیتے ہوئے کہا۔

انہیں اٹھتے دیکھ کر کرم دین بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا، نادر کو روتے دیکھ کر اس کی اس کی آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے تھے، اس نے نادر سے سلام لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو نادر اس کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''نہیں..... نہیں۔ روتے نہیں'' نادر کو تسلی دیتے ہوئے کرم دین خود بھی رونے لگا تھا۔

اس وقت میاں جی کے حجرے میں عجیب سماں تھا، ان چاروں ہی کی آنکھوں میں آنسو تھے، وہ رو رہے تھے اور ایک دوسرے کو حوصلہ بھی دے رہے تھے، کچھ دیر بعد نزیر اور نادر وہاں سے چلے گئے تھے مگر حجرے میں اب بھی اداسی پھیلی ہوئی تھی۔

نادر کو ہسپتال داخل کروا دیا گیا تھا، آپریشن کی تیاری کے لیے اس کے تمام ٹیسٹ لیے جانے لگے تھے، محلے میں آتے جاتے کسی نہ کسی سے کرم دین کو نادر کے بارے میں معلومات مل جاتی تھیں یا پھر نماز کے بعد مسجد میں نادر کے متعلق بات چھڑ جاتی تو اس کے بارے میں پتہ چل جاتا تھا، جس روز نادر کا آپریشن ہونا تھا، وہ دن کرم دین کے لیے پریشانی کے عالم میں گزر رہا تھا، اس کی ہر سانس کے ساتھ نادر کے لیے دعا نکل رہی تھی، اس روز میاں جی نے بھی ہر نماز کے بعد نادر کی صحت یابی کے لیے خصوصی دعا کی تھی۔

آپریشن کامیاب ہوا تھا، جیسے ہی نادر کے کامیاب آپریشن کی خبر محلے میں پہنچی تھی، ہر کوئی ایک دوسرے کو خوشی سے یہ خبر دے رہا تھا، کرم دین نے بھی خدا کے حضور سجدہ شکر ادا کیا تھا اور نادر کے گھر جا کر اس کی ماں کو بیٹے کی نئی زندگی ملنے پر مبارک باد دی تھی۔

کچھ روز بعد نادر صحت یاب ہو کر ہسپتال سے واپس گھر آ گیا تھا، یہ خبر ملتے ہی کرم دین اسے دیکھنے ان کے گھر گیا تھا، آپریشن سے قبل بیماری کی وجہ سے نادر کے چہرے پر جو مردنی چھائی ہوئی تھی وہ ختم ہو گئی تھی، ڈاکٹروں نے اسے کچھ دن تک آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا، اس لیے وہ چارپائی پر ہی لیٹا ہوا تھا، کرم دین کو دیکھ کر اس نے اٹھنے کی کوشش کی تھی مگر اس نے اسے اٹھنے سے منع کر دیا تھا۔

''اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟'' کرم دین نے نادر کے پاس بیٹھتے ہوئے دریافت کیا۔

''اب تو ٹھیک ہوں میں'' نادر نے آہستہ سے جواب دیا۔

''اللہ نے بڑا کرم کیا، ورنہ تمہاری جو حالت تھی وہ دیکھی نہیں جاتی تھی''

''یہ سب تمہاری وجہ سے ممکن ہوا ہے''

''آئندہ کبھی بھولے سے بھی یہ بات اپنی زبان پر مت لانا۔ میاں جی کہا کرتے ہیں سارے کام اللہ کی رضا سے ہوتے ہیں۔ بس تم بھی اسی کا شکر ادا کرو'' کرم دین نے نادر کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے پیار سے کہا، اسی وقت کچھ اور محلے دار اس کی خیریت معلوم کرنے کے لیے وہاں آ گئے تھے، اس لیے کرم دین جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆☆☆

حج پروازوں کا آغاز ہو چکا تھا، حج کے دن قریب آتے جا رہے تھے، حج کے لیے جانے والے خوش نصیب اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے مل کر بخوشی سفر پر روانہ ہو رہے تھے۔

''تمہاری فلائٹ کس دن ہے کرم دین؟'' نماز کے بعد میاں جی نے چلتے چلتے کرم دین سے پوچھا۔

''میں تو حج پر نہیں جا رہا میاں جی'' کرم دین نے بات کی۔

کرم دین کی بات سن کر میاں جی کو جھٹکا لگا تھا، اس لیے فوراً بولے ''مگر تم نے حج کی درخواست تو دی تھی''

''نہیں میاں جی۔ میں نے درخواست نہیں دی تھی''

میاں جی کو ایک اور جھٹکا لگا تھا، وہ حیران ہو کر بولے ''لیکن اس روز تم نے خود مجھ سے حج پر جانے کی بات کی تھی''

''بس میاں جی! کہا تو تھا۔ لیکن درخواست نہیں دے سکا تھا'' کرم دین نے رک رک کر بات کی۔

''تمہارے لہجے سے ایسا محسوس ہو رہا ہے، جیسے تم مجھ سے کوئی بات چھپا رہے ہو''

میاں جی سے غلط بیانی کرنا یا جھوٹ بولنا کرم دین کے لیے ممکن نہیں تھا، اس لیے اسے وہ بات بتانا پڑی جسے اس نے اب تک کسی پر بھی ظاہر نہیں ہونے دیا تھا، اس کی بات سن کر میاں جی چلتے چلتے وہیں رک گئے تھے۔

''تم نے اتنا بڑا کام کر دکھایا اور کسی کو خبر تک نہیں ہونے دی''

''آپ خود ہی تو کہا کرتے ہیں میاں جی۔ نیکی کر دتو اس طرح کہ دوسرے ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو''

کرم دین نے اتنی بڑی بات اتنی آسانی سے کہہ ڈالی تھی، اس کی بات سن کر کچھ پل کے لیے میاں جی حیران و پریشان کھڑے اس کے چہرے کو بغور دیکھتے رہے، پھر انہوں نے بے اختیار کھینچ کر اسے اپنے سینے سے لگا کر اس قدر بھینچ لیا کہ کرم دین کو میاں جی کے سینے میں ہونے والی دل کی دھڑکن اپنے سینے میں اترتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی، اس پل وہ اس قدر سرور محسوس کر رہا تھا کہ اسے یہ سوچ کر اپنی قسمت پر رشک آنے لگا تھا کہ وہ آل رسول ﷺ کے سینے سے لگا کھڑا تھا، وہ میاں جی کے سینے سے جدا ہوا تو اس پر عجیب سی کپکپی طاری تھی، اب وہ اپنے دل میں ہونے والی دھک دھک کی جگہ دل سے نکلنے والی اللہ..... اللہ کی صدا کو با آسانی محسوس کر رہا تھا، وہ اسی کیفیت میں گھر آ کر خاموشی سے

چادر لپیٹ کر لیٹ گیا تھا۔

☆☆☆☆☆

کرم دین نے اپنے اندر بہت سے روگ پال لیے تھے مگر اس نے کبھی کسی پر اپنی کیفیت ظاہر نہیں ہونے دی تھی، اس کی حالت اس لکڑی کی سی تھی، جسے دیمک اندر سے چاٹ گئی ہو مگر باہر سے وہ صحیح سلامت دکھائی دے رہی ہو لیکن ایک ہلکے سے جھٹکے سے بھی وہ زمین پر ڈھیر ہو جائے، بیماریوں اور پریشانیوں نے اسے وقت سے بہت پہلے بوڑھا کر دیا تھا، ڈاکٹر کئی بار اسے اس کی اندرونی حالت سے آگاہ کر چکا تھا مگر اس نے ہمیشہ سنی ان سنی کر دی تھی، وہ جن حالات سے گزرا تھا ان کی وجہ سے بلڈ پریشر اور شوگر نے ایک ساتھ اسے گھیر لیا تھا، رہی سہی کسر ہیپاٹائٹس سی نے پوری کر ڈالی تھی۔

جب سے ایک دو بار چاچی نے اسے تکلیف کی حالت میں تڑپتے ہوئے دیکھا تھا، وہ بے چین رہنے لگی تھی، کرم دین نے اسے قسم دی تھی کہ وہ اس کی بیماری کے بارے میں کسی سے بھی ذکر نہ کرے، اس لیے وہ ایک عرصے تک اندر ہی اندر کڑھتی رہی، آخر کرم دین کی حالت دیکھ کر اس سے رہا نہ گیا اور وہ میاں جی کے پاس جا پہنچی۔

''میاں جی آپ کو معلوم ہے، کرم دین دوسروں کی مدد کے لیے کس قدر بھاگ دوڑ کرتا ہے'' چاچی نے میاں جی سے کہا۔

''ہاں میں جانتا ہوں''

''تو کیا ہمارا فرض نہیں بنتا کہ ہم بھی اس کی پریشانیوں میں اس کے کچھ کام آئیں؟ وہ کسی کو کچھ نہیں بتاتا میاں جی! میں نے ان آنکھوں سے اسے تکلیف سے تڑپتے ہوئے دیکھا ہے''

''مجھ سے تو اس نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی''

''میاں جی اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے، میں چاہتی ہوں کسی طرح آپ اس کے بچوں کو اس سے ملوا دیں''

''ایسی بات ہے تو میں کوشش کر کے دیکھ لیتا ہوں''

''ان کا پتہ میں آپ کو بتا دوں گی۔ آپ جائیں گے تو وہ آپ کی بات کبھی نہیں ٹالیں گے''

''ٹھیک ہے میں کسی روز ان کے ہاں چلا جاؤں گا'' میاں جی نے تسلی دی۔

چاچی سے کسی کی بھی تکلیف دیکھی نہیں جاتی تھی، کرم دین کی بات کرتے ہوئے بھی اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے، جب میاں جی نے کرم دین کے سسرال میں جانے کا وعدہ کیا تو اسے حوصلہ ہو گیا تھا، اس لیے وہ خاموشی سے وہاں سے اٹھ گئی۔

ہیپاٹائٹس نے کرم دین کو الجھا کر رکھ دیا تھا، اس کا پیٹ پھول گیا تھا اور چہرے کی رنگت سیاہ ہونے لگی تھی، وہ فیکٹری سے بھی چھٹیاں کرنے لگا تھا، مگر اس کے باوجود گرتا پڑتا باجماعت نماز ادا کرنے مسجد میں ضرور پہنچ جاتا تھا، اس کی بگڑتی ہوئی حالت دیکھ کر میاں جی نے اسے سمجھایا تھا ''اسلام میں اتنی تو رعائت ہے کہ اگر کسی بیماری یا تکلیف کی وجہ سے مسجد میں جانے میں دشواری ہو تو گھر پہ نماز ادا کر لو'' میاں جی کی بات سننے کے بعد وہ بمشکل کوشش سے ایک دو نمازیں ادا کرنے مسجد میں آتا تھا، باقی کی نمازیں گھر پر ہی پڑھ لیتا تھا، مگر رفتہ رفتہ وہ ایسا بھی نہ کر سکا۔

کہیں سے میاں جی کے کانوں میں بھی یہ بات پڑ گئی تھی کہ ڈاکٹر کرم دین کو چیک کرنے گھر پر ہی آیا تھا، ڈاکٹر نے کرم دین کو تو کچھ نہیں بتایا تھا مگر اس نے محلے کے کسی شخص کو بتا دیا تھا کہ اب وہ چند دن کا ہی مہمان ہے، پھر بھی کچھ محلے دار اسے ہسپتال لے گئے تھے۔

میاں جی نے چاچی کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچ کر دروازے پر لگی گھنٹی بجا دی تھی، دروازہ کھولنے کرم دین کا سسر مشتاق آیا تھا، مشتاق نے میاں جی کو دروازے پر کھڑے دیکھا تو ایک پل کے لیے وہ اپنی آنکھیں جھپکنا ہی بھول گیا تھا، اس کی نہ صرف کئی بار میاں جی سے ملاقات ہو چکی تھی بلکہ کئی بار وہ ان کی امامت میں نماز ادا کر چکا تھا۔

''بسم اللہ..... بسم اللہ..... ہماری قسمت کہ آج میاں جی خود چل کر ہمارے گھر تشریف لائے ہیں'' مشتاق نے چہرے پر مسکراہٹ سجائے میاں جی کو دیکھ کر کہا اور پھر بولا ''آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں میاں جی! اندر آ جائیں''

مشتاق کے کہنے پر میاں جی اس کے ساتھ ساتھ چل پڑے، میاں جی کو ڈرائینگ روم میں بٹھا کر مشتاق نے دیگر اہل خانہ کو بھی ان کے آنے کی اطلاع کر دی تھی، اس روز کام سے چھٹی ہونے کی وجہ سے اکرم اور اکبر بھی گھر پر ہی تھے، وہ بھی میاں جی کا سن کر وہیں آ بیٹھے تھے۔

''یہ بات تو تم لوگ بھی سمجھتے ہو کہ میں یہاں بلا وجہ نہیں آیا'' میاں جی نے بات کی۔

''میاں جی یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ جیسے بزرگ ہمارے اس غریب خانے پر تشریف لائے''
''دراصل میں یہاں کرم دین کے بچوں کے بارے میں بات کرنے آیا ہوں''
''لیکن میاں جی کرم دین سے اب ہمارا کوئی تعلق واسطہ نہیں رہا''
''زبان سے کہہ دینے سے تعلق ٹوٹ نہیں جایا کرتے۔ وہ کل بھی ان بچوں کا باپ تھا اور آج بھی وہ رشتہ اسی طرح قائم ہے''
''میاں جی ہماری اتنی اوقات نہیں کہ ہم آل رسول ﷺ کے سامنے اونچی زبان میں بھی بات کریں، لیکن کرم دین کی حرکتوں سے میری بیٹی اور اس کے دو معصوم بچوں کی جان گئی، اسی لیے میں ان دونوں بچوں کو اپنے ساتھ لے آیا تھا، وہاں ہوتے تو شائد اب تک یہ بھی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہوتے'' مشتاق نے رندھی ہوئی آواز میں بات کی۔
''دیکھو مشتاق! میں یہاں تم سے کوئی بحث کرنے نہیں آیا۔ میں کرم دین کے بچوں کو اس لیے لینے آیا ہوں کہ شائد انہیں دیکھ کر کرم دین کی حالت کچھ سنبھل جائے۔ وہ جس کرب سے گزر رہا ہے شائد بچوں کو دیکھ کر اس میں کچھ کمی آجائے''
''کیا ہوا کرم دین کو؟'' میاں جی کی بات سن کر مشتاق نے پریشان ہو کر پوچھا، اکرم اور اکبر بھی پریشان ہو گئے تھے۔
''یہ تم خود چل کر دیکھ لو تو زیادہ بہتر ہے..... لیکن اتنا ضرور کہوں گا، اگر آپ لوگ اب بھی اس سے نہ ملے تو شائد پھر بہت دیر ہو جائے'' بات کرتے ہوئے میاں جی کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔
''ہم بچوں کو لے کر ابھی چلتے ہیں میاں جی'' مشتاق نے بات کی اور پھر اکبر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ''جلدی سے عمر اور ماجدہ کو لے آؤ''
باپ کی بات سنتے ہی اکرم اور اکبر خاموشی سے وہاں سے باہر چلے گئے، ان کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد اندر سے خواتین کے رونے پیٹنے کی آوازیں آنے لگی تھیں، رونے کی آواز سن کر مشتاق بھی اندر چلا گیا تھا، کچھ دیر تک رونے پیٹنے کی آوازیں ڈرائینگ روم میں بیٹھے میاں جی کے کانوں میں پڑتی رہیں، پھر مشتاق نے آکر اطلاع دی کہ وہ لوگ جانے کے لیے تیار ہیں۔
بچوں کے ساتھ مشتاق، اکرم اور اکبر نے جانے کا پروگرام بنایا تھا مگر غفوراں بھی ضد کر کے ان کے ساتھ چل پڑی تھی، وہ سب میاں جی کے ہمراہ کرم دین کے ہاں پہنچے تھے، انہیں راستے میں ہی کرم دین کی حالت مزید بگڑنے اور ڈاکٹروں کا اس کے لیے دعائیں کرنے کو کہہ کر ہسپتال سے فارغ کر دینے کی اطلاع مل گئی تھی، گھر کے باہر بہت سے محلے دار جمع تھے، میاں جی نے کسی سے بھی کوئی بات نہیں کی تھی اور خاموشی سے گھر کے اندر داخل ہو گئے تھے، بچے اور دیگر افراد بھی میاں جی کے پیچھے پیچھے ہو لیے تھے، گھر کے اندر بھی بہت سے لوگ افسردہ کھڑے تھے اور کرم دین آنکھیں بند کیے چارپائی پر لیٹا تھا۔
''کیا بات ہے کرم دین! تم آنکھیں کیوں نہیں کھول رہے؟'' میاں جی نے رندھی ہوئی آواز میں بات کی۔
کرم دین کے کانوں میں میاں جی کی آواز پڑی تھی مگر وہ چاہتے ہوئے بھی آنکھیں کھول نہیں پایا تھا۔
میاں جی نے کچھ پل کے لیے انتظار کیا اور پھر بولے ''کرم دین تم کہا کرتے تھے ناں، محلے میں کوئی بھی مجھ سے بات نہیں کرتا۔ آنکھیں کھول کر دیکھو آج محلے کے کتنے لوگ تمہیں ملنے آئے کھڑے ہیں'' یہ کہتے ہوئے میاں جی کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسو بہہ نکلے تھے، مگر کرم دین کی آنکھیں اب بھی بند تھیں۔
''کرم دین ذرا دیکھو تو سہی آج تم سے ملنے تمہارے بچے بھی آئے ہیں'' میاں جی نے کرم دین کا گال تھپتھپاتے ہوئے کہا، ایسا کرتے ہوئے ان کی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر کرم دین کی آنکھوں پر گر پڑے تھے۔
میاں جی کی آواز کرم دین کے کانوں سے ٹکرائی تھی اور اس نے پوری کوشش سے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دی تھیں، سامنے ہی آنکھوں میں آنسو لیے اس کے دونوں بچے کھڑے تھے، جواب بڑے ہو گئے تھے، ان کے ساتھ ہی عائشہ کے والدین اور بھائی بھی کھڑے آنسو بہا رہے تھے، کرم دین نے بچوں کو دیکھ کر بانہیں پھیلا دی تھیں، عمر اور ماجدہ روتے ہوئے باپ کے سینے سے لپٹ گئے تھے، کرم دین نے ان دونوں کا ماتھا چوما اور پیار کیا، پاس کھڑے ہوئے لوگوں کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلے تھے، دونوں بچے اس کے سینے سے لپٹے ہوئے تھے، کرم دین نے آنکھیں کھولے رکھنے کی بہت کوشش کی تھی، وہ بچوں کو جی بھر کے دیکھ بھی نہیں پایا تھا کہ اس کی آنکھیں بند ہوتے ہوتے ہمیشہ کے لیے بند ہو گئی تھیں۔

ختم شد